جنوری 2024 قیمت 15₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

Azadi Ka Amrit Mahotsav

G20 भारत 2023 INDIA

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

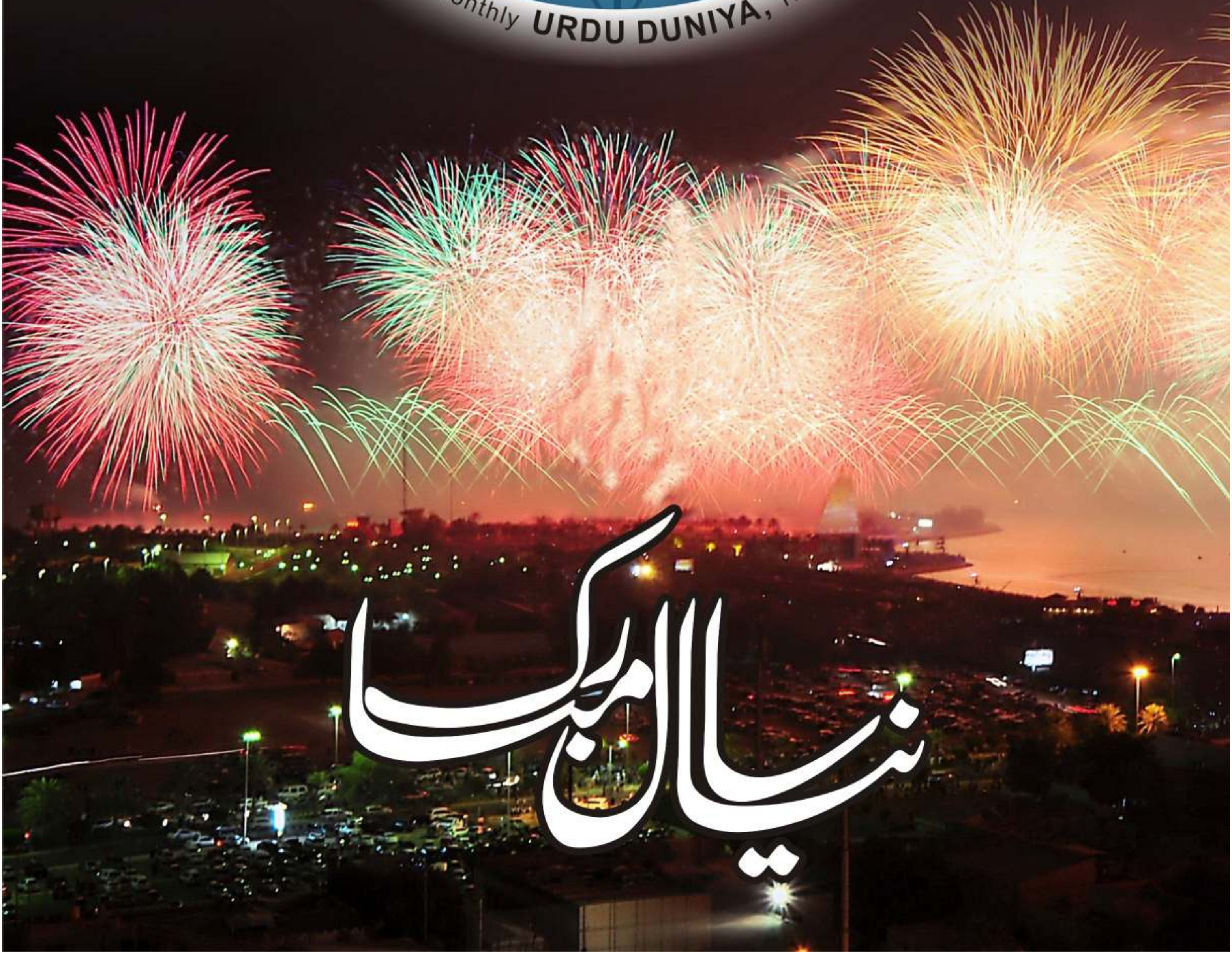

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیاہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26، شمارہ:01، جنوری 2024

مدیر : پروفیسر دھنجے سنگھ
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
خواب رو اور جوگندر پال کا فن — ظہیر انور 7

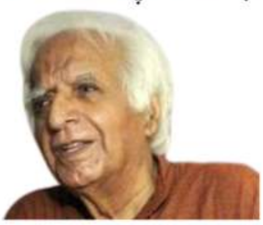

خاندیش میں اردو تحقیق و تنقید — ایس ایم شکیل 12
منٹو کے افسانوں کی سماجی و تہذیبی معنویت — قمر الحسن 18
پنجابی زبان پر فارسی کے اثرات — طارق حسین 22

زبان و تعلیم
انیسویں صدی میں ہندوستان کا تعلیمی نظام — عمر رضا 25

یاد شارب
شارب ردولوی بحیثیت عملی تنقید نگار — الیاس عزیز 31

شارب ردولوی کی علمی وعوامی خدمات — موسیٰ رضا 34

رنگ نظیر
نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی — ظفر اللہ انصاری 36

قومی یکجہتی کا نمائندہ شاعر: نظیر اکبرآبادی — جواد حسین 39

لعل و گہر
'نغمۂ شب' کا شاعر: ڈاکٹر اختر بستوی — مشیر احمد 41

مولوی محمد شرف الدین — محمد سعید الدین فرخ 44
اثر انصاری کے فکر و فن کا گراف — رفیق احمد 47
انجم عثمانی: حیات اور فن — سید وجاہت مظہر 50

اعظم کریوی — عبدالقیوم 54

خواتین اور افسانہ
'وجود کے ٹکڑے' اور نسیم اقتدار علی — عشرت ناہید 57
نجمہ نکہت کی افسانوی شعریات — یاسمین رشیدی 61

خراج عقیدت
ادب وصحافت کے امام: ڈاکٹر امام اعظم — شمس کمال انجم 64

خصوصی گفتگو
شہاب ظفر اعظمی سے انٹرویو — مسرت جہاں 66

نیا آسماں نئے ستارے
مظہر امام کی خاکہ نگاری — ابرار حسین 70
حالی کا تصورِ وزن: ایک جائزہ — محمد شاہنواز خان 72

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 74

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

وقت منجمد نہیں، بلکہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ ہر لمحے ایک نئی کیفیت اور ایک نئی لہر وقت میں شامل ہوتی جاتی ہے۔ ادبیات اور فلسفوں میں بھی وقت کا ایک واضح تصور ہے جس کے حوالے سے افسانے اور ناول بھی لکھے گئے ہیں اور وقت کو ایک محور و مرکز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے کلینڈر کی تبدیلی کا رشتہ بھی وقت سے ہی جڑا ہوا ہے، اسی لیے ماہ و سال بدلتے رہتے ہیں اور یہ تبدیلیاں ہم سے بہت کچھ کہتی ہیں۔ ہمیں اپنے ذہنی اور فکری رویے کو تبدیل کرنے کا اشارہ بھی دیتی ہیں اور وقت کی اہمیت و معنویت کا احساس بھی دلاتی ہیں۔

جب کوئی سال گزرتا ہے تو ہم اسے الوداع کہتے ہیں اور نئے سال کا استقبال کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہماری زندگی میں نئے خواب، نئی امنگ اور نئے منصوبے بھی جڑ جاتے ہیں اور ذہن میں منچندہ بانی کا یہ شعر گونجنے لگتا ہے۔

پیہم موجِ امکانی میں ۔۔۔ اگلا پاؤں نئے پانی میں

دراصل یہ نیا پانی تحرک کا ایک استعارہ ہے، کیونکہ پانی کے ساتھ موج کی روانی جڑی ہوئی ہے جو کہیں ٹھہرتی نہیں بلکہ مسلسل آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اگر یہ موج یا لہر رک جائے تو پانی میں کائی جمنے لگے گی اور اس کی ساری روانی اور تازگی ختم ہوجائے گی۔ زندگی بھی ایک موج کی مانند ہے جو ہر لمحے اپنا رنگ، اپنا روپ بدلتی رہتی ہے۔ کبھی خوشی تو کبھی غم، دراصل ہماری زندگی غم اور نشاط کا ایک امتزاج ہے۔ ہر نیا سال ہمارے لیے نئی بہاریں لے کر آتا ہے۔ ہمارے اندر نیا جنون اور جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ہم ایک نئی امید کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں اور اس سفر میں ہمیں جہاں کچھ راحتیں ملتی ہیں وہیں کچھ اذیتیں بھی۔ دراصل عذاب اور خواب دونوں ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ اسی لیے ہم عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے نئے خواب دیکھتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے کہا تھا

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر

دراصل خواب ہماری زندگی کا سہارا ہیں۔ اسی خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ہم مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ہم اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دنیا کی کوئی بھی زندہ قوم ایسی نہیں ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے کا ہنر نہ جانتی ہو۔ انھیں معلوم ہے کہ تغیر سے ہم آہنگی ہی ترقی کا زینہ ہے۔ دنیا کی تمام زندہ اور ترقی یافتہ قومیں تبدیلیوں کے حساب سے اپنی ترجیحات کا تعین بھی کرتی ہیں۔ اگر ہمیں بھی ظلمت و پسماندگی کے حصار سے باہر نکلنا ہے تو زندگی کو تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا، ورنہ پسماندگی ہماری تقدیر بن جائے گی۔ اس لیے اگر ہمیں ترقی کا راستہ طے کرنا ہے، اور نئی منزلوں تک پہنچنا ہے تو عصری تغیرات کو نظرانداز کرنا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہمیں یہ اچھی طرح پتہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے عہد میں سانس لے رہے ہیں اور سائنس و ٹیکنالوجی ہمیں ارتقا کے راستے دکھا رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں نئے نئے تجربے اس لیے ہو رہے ہیں کہ ارتقا کا یہ سفر رک نہ جائے۔ اگر ہم نے تبدیلیوں کو اپنے افکار و اقدار میں شامل نہیں کیا تو ہماری زندگی ایک نقطہ انجماد پر ٹھہر سی جائے گی اور سارا ارتقائی عمل رک جائے گا اور ہمارے ذہنی، تخلیقی، معاشی، ثقافتی، سماجی وجود پر جمود طاری ہوجائے گا۔

'نیا سال' 2024 محض ایک کلینڈر کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ ہمارے فکر و نظر، رویے اور رجحان کی تبدیلی کا بھی ایک اشاریہ ہے۔

پروفیسر دھننجے سنگھ

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہ نومبر کا اردو دنیا خوبصورت اور پرکشش سرورق سے آراستہ، رنگوں کے حسین امتزاج کا استعارہ ہے! اردو دنیا کے نئے مدیر کا پرخلوص خیر مقدم ہے، دلی مبارک باد! قومی کونسل برائے فروغ اردو کی علمی وادبی نیز تہذیبی اور ثقافتی خدمات قابل صد ستائش ہیں، بطور خاص اداریہ نہایت پرمغز، پرلطف، سیکولرزم، اخلاقیات و روحانیت کی عالمانہ گفتگو کا گلدستہ ہے کہ جہاں مدیر محترم نے مذہب انسانیت کے تعلق سے مختلف زبانوں میں درج اخلاقی تعلیماتِ اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے حوالے سے کثرت میں وحدت اور امن واتحاد، قومی یک جہتی پر بہت خوب روشنی ڈالی ہے! انسانیت کی معراج انسانیت نواز قدروں کی پیروی ہے۔ تاریخیں شاہد ہیں کہ ہندوستان رِشی منیوں کا، صوفی سنتوں کا ملک رہا ہے۔ مذہب انسانیت کی پیروی ہی پرم دھرم ہیں کہ ''رنگ اور ذات، نسل اور مذہب جو بھی ہے آدمی سے کمتر ہے۔''

بہر حال! اس شمارے کے تمام عنوانات ادب زاویے اور جہات، یادرفتگاں، لعل و گہر، سلسلۂ صحافت، دیار غیر میں، خصوصی گفتگو، فلم، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا، خبر نامہ غرض کہ تمام مشمولات اپنے موضوع کا حق ادا کررہے ہیں اور جدید تر افکار سے پر ہیں! تمام تر مضامین تحقیقی نقطۂ نظر سے انکشافات و دریافت کے نئے دریچے وا کررہے ہیں اور قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔ کامل یقین ہے کہ آپ مدیران کی سرپرستی میں اردو دنیا ارتقا کی نت نئے منزلوں کو سر کرے گا۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

'اردو دنیا' دسمبر 2023 کا شمارہ خطاطی کے خوبصورت اور دل پذیر سرورق کے ساتھ ساتھ اداریہ کے لطیف بیان، نئے تغیر وتبدل کی آفاقی سچائیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ ادب پر طاری جمود میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے جدید تر اختراعی Self innovative موضوعات، نئی انفرادی فکر، جدید ترین رجحانات وصورت حال پر مبنی خیالات، ندرت بیان کے ساتھ منفرد انداز بیاں سے آراستہ مباحث کی آج اشد ضرورت ہے کہ 'ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یہ بین الاقوامی جریدہ حرف حرف جدید تر افکار اور اردو زبان وادب سے محبت کا پرخلوص گلدستہ ہے۔

زیرنظر شمارے میں 'ادب زاویے اور جہات' کے تحت 'شعر کی نحوی اور عروضی صوتیات' سے بحث کی گئی ہے، 'اردو میں انگریزی رموز اوقاف اور صہبائی' پرمغز مضمون ہے۔ 'وحشت کی شاعری میں تصوف' تصوف کے رمز کی وضاحت کرتا ہے۔ 'استعماری نظام سے مزاحمت اور اردو فکشن' فکشن کے اس عہد میں مزاحمت اور احتجاج کے باب میں بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ 'میر کی شاعری میں مستعمل تلمیحات اور مضمون آفرینی' جیسے مضامین جہاں معلومات میں اضافے کا ایک نیا جزیرہ ہیں، جو نہ صرف اپنے موضوع کا حق ادا کررہے ہیں بلکہ ایک پرمغز بحث کو ندرت زبان اور دلکش انداز بیاں سے 'اردو دنیا' کے ادبی تقاضوں سے عین مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ 'لعل و گہر' کے عنوان سے مندرج مشمولات 'گل گلشن اور گلفام' کے مصداق ہیں جو نازک احساسات اور جذبات کی ترجمانی، کلاسکیت کے منفرد آہنگ کا استعارہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔

نگر نگر اردو، سلسلۂ صحافت، جہان کلیم میں عمدہ مضامین ہیں۔ اردو پر خصوصی گفتگو زبان وادب کی بقا اور ارتقا کے لیے نئی راہیں ہموار کررہی ہے۔ آج کے وقت کی یہ سب سے اہم ضرورت ہے کہ ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اس حوالے سے گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار مادری زبان پر مکمل دسترس حاصل کرسکیں۔ 'ذکر جمیل' جمیل مظہری کی نظم نگاری یا نظمیہ شاعری کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہے۔

'نیا آسماں نئے ستارے' تانیثیت کی فکر اور مزاحمتی لب و لہجے کے ساتھ ساتھ نسائی کرداروں کے حوالے سے حوا کی بیٹیوں کی طبیعت کی جو نامساعد حالات اور ناموافق

ماحول کے خلاف باغی کردارو ں کا احتجاج زندہ ضمیری کی علامت ہے 'وہیں تپتی ہے زمیں، جہاں دھوپ گھنی ہوتی ہے۔' چنانچہ رشید جہاں سے لے کر ثروت خان تک اور تاحال کی فکشن نگار خواتین کی نفسیاتی گرہ کشائی اور تانیثی کردارو ں کی جرأت مندیاں ادب کو ایک نئی دشا دکھا رہی ہیں۔ احمد جمال پاشا کے فن پر خاطرخواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتابوں کی دنیا، تعارف تبصرے گویا ایک مختصر کتاب میلہ کا منظرنامہ ہے کہ گھر بیٹھے قاری اردو زبان وادب کی نئی دریافت۔ تحقیق تنقید، تاریخ وتراجم فکشن اور شاعری سے محظوظ ہورہا ہے۔ 'خبرنامے' قومی و بین الاقوامی علمی وادبی سرگرمیوں کا مینابازار ہے کہ جہاں ہر قدم معلومات کا ایک نیا جہان موجود ہے۔ بہرحال تمام مشمولات اردو زبان وادب کے اعلیٰ تعلیمی نصاب کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہیں اور شائقین علم وادب کو دعوت مطالعہ دے رہے ہیں۔ خدا کرے آپ اراکین 'اردو دنیا' بخیر وعافیت ہوں!

ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ، انڈیا

اردو دنیا میرا من پسند رسالہ ہے۔ اس کی ڈزائننگ، آرٹ کاغذ، رنگین پرنٹنگ اور سب سے بڑھ کر معلوماتی اور بہترین مقالات اور مضامین کی شمولیت مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ کئی مضامین ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ اداریے میں پہلی لائن قابل غور وعمل ہے ''کسی بھی مہذب معاشرے کی شناخت ادب سے ہوتی ہے'' اور آگے بڑھنے سے پہلے آخری بھی دیکھ لیجیے ''ادب اور ادیب کا بنیادی کام عالم انسانیت کو تاریکیوں سے نجات دلانا ہے'' لکھنے کی اور سیکھنے کی کوشش کرنے والے ہم جیسے طالب علموں کے لیے تو مفید ہے ہی ساتھ ہی معاشرے کے لیے بھی ان دو لائنوں میں اعلی ترین سبق دیا گیا ہے۔ اس شمارے میں مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اویس سنبھلی کا مضمون 'عرفان عباسی کی یاد میں' شائع ہوا ہے۔ مجھے کہہ لینے دیجیے کہ میں اویس سنبھلی کی مستقل قاری اور ان کی رواں دواں تحریروں کی معترف ہوں۔ ان کے انداز بیان میں روانی بھی ہوتی ہے اور تفصیل بھی۔ مضمون کی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ خامیوں یا کوتاہیوں کو پس منظر میں عام سے لہجے میں اس خوبصورتی سے بیان کر جاتے ہیں کہ قاری کی نظر میں انسان کا مجسم رویہ بشری کمزوریوں کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔

عرفان عباسی کی شخصیت اپنی جگہ لیکن اویس سنبھلی کے مزاج میں شامل عاجزی اور سادگی بھی متاثر کن ہے۔ عمیر منظر اپنی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ شعری فہم و فراست کے معاملے میں بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا مضمون 'کرشن بہاری نور کا رنگ سخن' معیاری اور پرمغز مقالہ ہے۔ منتخب اشعار کی پیشکش بھی ذہن سے محو نہیں ہوئی ہے۔

زندگی سے بڑی سزا ہی نہیں — اور کیا جرم ہے پتہ ہی نہیں
زندگی پھر زندگی پھر زندگی — کچھ نہیں بس تہہ بہ تہہ تنہائیاں

واہ! اس شمارے میں میرے ساتھیوں کے بھی مضامین شامل ہیں۔ ساتھیوں کی کامیابی پر خوشی بھی ہوتی ہے اور کہیں تھوڑی سی آگے بڑھنے کی ہوک بھی اٹھتی ہے۔ ان میں فرقان عالم کا 'دارالمصنفین اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی تحقیقات' اور میسرہ اختر کا 'کلام درد کا ہمہ جہت رنگ' حالانکہ درد کے کلام پر بہت سے ناقدین نے قلم اٹھایا ہے لیکن نوجوان اسکالر اگر کسی پہلو سے بات کرتے ہیں تو اس میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ نصرت جہاں بھی نوجوان اسکالر ہیں انھوں نے شکیلہ اختر کے فن پر مفصل بات کی ہے۔ مجھے ان تمام کو دیکھ کر دلی مسرت کا احساس ہوا۔

عزہ معین: دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' ادبی وعلمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ خدمت علم کی غرض سے قلمکار قطار میں تو حصول علم کی غرض سے قارئین انتظار میں رسالہ 'اردو دنیا' کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ شمارہ اکتوبر کا سرورق کلاسکی طرزِ بناوٹ سے مستعار نہایت جاذب نظر ہے۔ مشمولات کے بیک نظر جائزے کے بعد سمجھ نہیں آتا کہ مطالعے کا آخر کہاں سے آغاز کیا جائے؟ بہرحال آداب میخانہ بجالاتے ہوئے اداریہ سے فارغ ہوکر دیگر مشمولات کی جانب متوجہ ہوئے۔ محترم اداریہ نگار نے اردو ادب کے تاریخی ورثے کی تجدید سے متعلق ایک توجہ طلب پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے بالکل صحیح کہا، لکھتے ہیں ''اسی طرح تاریخ نگاری میں معاصر شعرا اور ادبا کو بھی زبان وادب کی تاریخ کا حصہ بنایا جانا چاہیے اگر صرف سابقہ روایت کے مطابق مرکزی لوگوں پر ہی توجہ مرکوز رہے گی تو بہت سے نئے قلم کار، شعرا اور ادبا تاریخ کے صفحات میں جگہ پانے سے محروم رہیں گے۔'' کالم 'ادب: زاویہ اور جہات' سے پیوستہ تمام مضامین معلومات آفریں ہیں، یقیناً بعض مضامین خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جیسے 'صحت زبان و بیان اور اردو املا' از تابش مہدی، نفسیات اطفال اور تخلیق ادب سے متعلق ثاقب عمران کی تحریر واقعی اہم ہے۔ کالم زبان و تعلیم کے تحت سید عاصم سہیل کا مضمون بلاشبہ ہزاروں معصوم بے زبان روحوں کی آواز ہے، اس کا عنوان 'طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے میں' روز بروز طلبہ میں بڑھتی ذہنی ونفسیاتی کیفیت عدم صحت جو کہ ایک بڑے سماجی اور اجتماعی مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے اس کی تفہیم پیش کرتا۔ تحریر نگار نے مسئلے کی حیثیت وحساسیت، تناؤ کی وجوہات اور سماجی سطح پر اصل کرنے کے کام کی جانب توجہ مبذول کرواتے ہوئے مختلف جہات سے موضوع پر مبسوط بحث کی اور یقیناً اس کا حق ادا کیا ہے۔ امید کہ فاضل مضمون نگار اس سلسلے کو مزید دراز فرمائیں گے۔ دیگر ذیلی کالموں کے مضامین بھی پرمغز اور اضافۂ علم، غور وفکر کا باعث بنے۔ 'ناشاد اورنگ آبادی' کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے مجھے بالکل واقفیت نہیں تھی جس جانب مضمون نگار ساحر داؤدنگری نے روشنی ڈالی ہے۔

ابو شبلی: حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' بہت اچھی میگزین ہے۔ اس میں بہت اچھی اچھی معلومات ہوتی ہیں جو ہم اسکول یا کالج میں بھی نہیں پڑھ پاتے تھے اور نہ سن پاتے تھے۔ دعا گو ہوں کہ مالک اس رسالے کو اسی طرح ہردلعزیز بنائے رکھے۔

بشن چودھری: منڈی گوبند گڑھ، پنجاب

خواب رو اور جوگندر پال کا فن

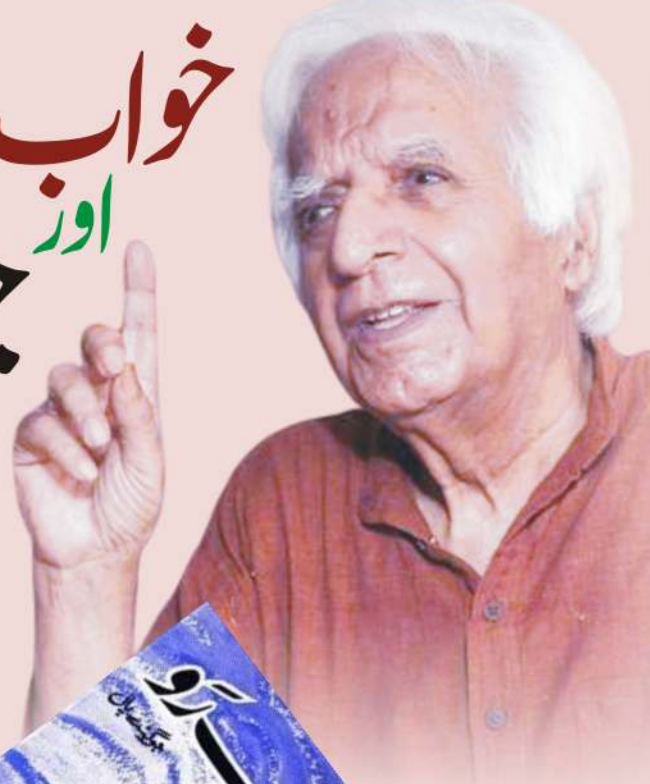

ظہیر انور

تاریخی اعتبار سے تقسیم کے نتیجے میں جو فکشن رقم کیے گئے اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ ہندو مسلم فساد، بے گھری، ہجرت کا کرب، مسلم اکثریت جو تقسیم سے قبل پاکستان میں مقیم تھی اور وہ مسلم خاندان جو ہجرت کر کے اِدھر سے ادھر گئے ان کی یادیں ان کا ناسٹلجیا، ان کی اولادوں کے مسائل اور اجڑتے بستے شہر پر کہانیاں اور ناول نہایت ہنر مندی اور فنکاری سے لکھے گئے، لیکن جب فساد کے جنون اور اثر سے ذہن آزاد ہوا تو ایسے ناول بھی احاطۂ تحریر میں آئے جو سنجیدگی اور فکرمندی سے حقیقت اور زندگی کی سچائی کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے اور جہاں لوگ اپنے شہر، اپنے عزیز، اپنے ساتھی سنگی، اپنے گھر اور اپنی تہذیب کو ترک کر کے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کر گئے اور تقریباً نفسیاتی مرض کے شکار بھی ہوئے۔ اس تقسیم کے سائے میں ان فنکاروں نے تقسیم کے پہلے اور بعد کے حالات اور مناظر بلکہ ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کو گہرے مشاہدے کے ساتھ تحریر کے احاطے میں زندہ و جاوید کیا ہے۔ ہر زبان میں تقسیم ہند کا گہرا اثر پڑا ہے۔ جوگندر پال کا 'خواب رو' اگرچہ مختصر ناولٹ ہے تاہم اس طرح کی کہانیوں اور ناولوں میں ایک زندہ مثال ہے جہاں کہانی کے گھنے پن، بنت کاری، سماجی سطح پر نہایت ارضی حقیقت، کرداری سطح پر ذہنی افق کی صورت اور ان کی سائیکی کی تصاویر جھلکتی ہیں۔

اپنے عہد کے تمام اہم فنکاروں نے زندگی کے تلخ حقائق کا حسن کے ساتھ فنکارانہ اظہار کیا ہے، لہٰذا تقسیم ملک کے تلخ حقائق کو درشانے کے لیے جوگندر پال کو بھی بار بار اپنے ماضی کی طرف لوٹنا پڑا ہے (Journey Back in time) اور 'خواب رو' (سالِ اشاعت 1991) کی شکل میں ایک شاہکار تخلیق ہمیں ملی جہاں زندگی کی حقیقت، خواب، معدومیت، عدم وجودیت، شناخت اور عدم تشخص کے مسائل اور منظرنامے ابھر آئے ہیں جو صرف خارجی عوامل کا شاخسانہ نہیں ہیں بلکہ داخلی کیفیات کے بھی نمائندہ ہیں۔ یہ منظر نامہ صرف فساد کا نہیں ہے بلکہ مابعد تقسیم کی لہروں (Post Partition Ripples) کو بھی تحریر کی گرفت میں لینے کی کوشش ہے۔ اگرچہ تشدد، مارکاٹ، نفرت، بم دھماکے اور ضمنی واردات بھی کہانی کے دروبست میں جگہ پاتے رہے ہیں۔

اکیسویں صدی کی ابتدا سے اب تک کے دو عشروں میں صنف ناول کو ہمارے فنکاروں نے خصوصی طور پر اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس دورانیے میں زندگی کے آثار میں نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سماجی، سیاسی اور تہذیبی حقائق تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔ سیاسی بحران کے ساتھ انسانی زندگی کے رنگ و روپ اور نفسیاتی سطح پر بدلتے ہوئے رویے اور رجحانات کے لیے ناول کو صیغۂ اظہار بنانے میں عافیت محسوس کی گئی۔ ناول کی وسعت اور کشادگی میں ایسے تمام موضوعات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں جن کی جڑیں ہماری تہذیبی، سماجی، سیاسی زندگی میں پیوست ہیں۔ اس دور میں اتنے ناول لکھے گئے اور اس قدر مختلف موضوعات کو مختلف تکنیک میں پیش کیا گیا کہ ہم اسے ناول کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ مغرب میں تو اس کا چلن پہلے سے ہی تھا اور اس کا اعتراف بھی ہوا ہے کہ بیسویں صدی سے اب تک ناول کی اشاعت میں کمی نہیں آئی۔ ان ناولوں میں اس قدر رنگارنگی، پھیلاؤ اور تنوع ہے کہ اسے صرف نظر کر کے گزرا نہیں جا سکتا۔ اس کے موضوعات میں تہذیبی قدروں کے زوال، ماضی کی بازیافت، اخلاقی اور مذہبی مسائل، سیاسی اتھل پتھل نیز تغیر پزیر انسانی تقدیر کی کہانیاں رقم ہونے لگی ہیں۔ علاوہ ازیں ان ناولوں کا بغور مطالعہ کریں تو زبان و بیان میں نیا پن ہے، اسلوب میں بھی انفراد اور تازگی ہے، تکنیک میں بھی ترمیم و تبدیلی اور بوقلمونی نے جگہ بنائی ہے۔ ایسے میں جوگندر پال کے اس ناولٹ کو دوسری بار پڑھنے کا موقع میسر آیا تو احساس ہوا کہ ناول کی تازگی اپنے وقت اور اپنی سرحد کو پار کر کے آج سے آملی ہے۔ انسانی دکھ، درد اور ہجرت کی یہ کہانی اپنی بنت کاری، اپنے سماجی سروکار، اپنی حقیقت اور خواب

کے امتزاج اور اپنے ناسٹلجیا کے حوالے سے اس طرح رواں اسلوب میں تحریر ہوئی ہے کہ اس کی اہمیت میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ آج کے ناول میں جہاں جدید، مابعد جدید تصورات اور نظریے کی گونج کے ساتھ طلسمی حقیقت نگاری اور دیگر تکنیکی طرز کے اظہار کو اپنایا گیا ہے اور جن پر مارکیز، پال کیلھو، ہرمن ہسیئے، مورا کامی اور دیگر جہانوں کے ناول نگار کے اثرات کا ذکر ہوتا رہا ہے وہاں 'خواب رو' بھی اپنے موضوع، اپنے برتاؤ اور تہہ داری نیز تکنیک میں کسی طرح کم نہیں ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بساط بھر دلچسپی کے باوجود ناول کا میرا مطالعہ غیر محدود نہیں، تاہم پچھلی صدی کے کئی ایسے ناول نگاروں کی تخلیقات پر جہاں نگاہ جاتی ہے تو فکشن کی روایت اور پچھلی صدی کے ناولوں میں وہی دلچسپی، وہی سحر انگیزی، وہی حقیقت نگاری موجود ہے اور موضوعات کے ہر طرفے کو قاری کے لیے تمام تر ترسیلی گنجائشوں کے ساتھ کھولنے اور احسن طریقے سے پیش کرنے کی مہارت صاف جھلکتی ہے۔ وہ زمانہ مختلف تھا، فضا ایسی نہ تھی، زمانے کی رفتار میں بھی فرق تھا، لہٰذا قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، عبداللہ حسین، انتظار حسین، جوگندر پال، عصمت چغتائی، اقبال مجید وغیرہ نے ایسے ناول لکھے جن کے سائے میں ناول کی روایت پروان چڑھی اور آج تک سفر جاری ہے۔ اچھی کتابوں کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ اپنے وقت کی سرحد وں سے نکل کر قاری کی پسند اور مطالعے میں رہے اور ناقدین کی نگاہ میں بھی محترم ہو، ان مصنّفین کے بیشتر ناولوں کے ہمراہ 'خواب رو' بھی مجھے ایسا ہی ایک ناول نظر آیا جس کی خوبیاں اس کی دیرپا مقبولیت کی ضمانت ہیں۔ ان ناولوں میں زبان و بیان کے نہایت خلاقانہ استعمال کے ساتھ ساتھ عام انسان کی بولی ٹھولی پر خاص توجہ دی گئی ہے اور اسی کے حوالے سے ماحول اور وقت کے عکس کو تحریر کے ذریعے معقول سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

'خواب رو' جوگندر پال کا ایک مختصر ناول ہے، اسے ناولٹ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن بڑا فنکار اپنے وژن یا اپنی بصیرت کو اپنے کردار اور واقعات کے حوالے سے نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی جیسا کہ البیر کامیو نے اپنے دو مختصر ناولوں میں فرد کی مرکزیت اور موضوعات کے تنوع کو سمو دیا ہے۔ جوگندر پال کا ناول ہجرت کے مسائل سے جڑا ہے اور جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں سنہ اشاعت 1991 درج ہے، لہٰذا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جوگندر پال کو بہ حیثیت ادیب اور ناول نگار اپنے ماضی کی طرف سفر کرنا پڑا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے، جذبے کی شدت سے لکھا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تصور وقت اور دنیا کے تصوّر کے ساتھ جوگندر پال اپنے ملک کے سنگین ترین المیے اور انسانی نفسیات کے مختلف اور متضاد پہلوؤں سے الجھتے اور اندر ہی اندر پگھلتے رہے ہیں لہٰذا انھوں نے ناول کے مربوط (Coherent) اسٹرکچر کے لیے اس بات کو دھیان میں رکھا ہوگا کہ کہانی میں معقول اور مناسب ابتدا اور انتہا ہونا چاہیے اور درمیان میں واقعات کا تانا بانا احتیاط سے بنا جائے۔ ناول کا پہلا جملہ ہے:

''یہ لکھنؤ ہے''

اور آخری جملہ جب دیوانے مولوی صاحب کا پوتا یہ کہہ کر گیند کے پیچھے بھاگتا ہے:

''لکھنؤ یہی تو ہے، بڑے ابو''

تو ہم سمجھ پاتے ہیں کہ درمیانی واقعات یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہو کر ناول نگار کے نقطۂ نظر یعنی 'وژن' کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم ان کے Vision of Reality سے قریب ہو جاتے ہیں۔ پورا ناولٹ پڑھ جایئے بیان کنندہ First Person Observer کے طور پر پلاٹ کے باہر سے کہانی کے خوبصورت، بامقصد اور بامعنی انسلاک و انضمام میں ہمیں شریک رکھتا ہے۔ یہ مشاہدہ کرنے والا بیان کنندہ کہیں بھی کرداروں کو اپنے نظریے کا ہمدرد یا نمائندہ یا موید نہیں بناتا ہے۔ 'خواب رو' میں ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ کہانی پن ہے جو رواں دواں ہے۔ اس کی ترتیب و تشکیل اور واقعات و سانحات نیز قصے کی مستحکم بنیاد اپنی جگہ ہر صفحے پر قائم رہتی ہے جو اس ناولٹ کو اعلیٰ درجے کے ناولٹ کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ناول کی ساخت اور اس کی گہری پرتوں کو کھنگال کر دیکھیے تو کئی باتیں از خود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ پورا ناولٹ ہجرت کے ایک اہم لیکن تنہا واقعے کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے اور انجام کار وسیع حقیقی فارم کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ سارے کردار جنھیں ہم پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پاتے ہیں یعنی دیوانے مولوی صاحب، ان کی اچھی بیگم، ان کے دوست، ان کی اولادیں، حکم صاحب دیگر رشتے دار، چوکیدار، یہاں تک کہ سندھی باورچی اور مولوی صاحب کی ایک اولاد کی سندھی بہو ایک حیرت انگیز سماج کا ہیولا قائم کرتے ہیں اور آخر آخر تک تکثیری انسانی جہتوں کو کہانی کی ساخت میں پیوست کر کے انسان دوستی کے مقام پر لے آتے ہیں۔ یہ سارے واقعات اور کردار مل کر مابعد تقسیم کا ایک Panormic View پیش کرتے ہیں۔ کرداروں کی نفسیات، اپنے وطن عزیز، کھوئی ہوئی اور پائی ہوئی نئی جنت کی تہیں، سب ایک دوسرے میں پیوست نظر آتی ہیں۔ وقت کے مارے ہوئے ان پرندوں کے جسموں پر نئے بال و پر آ رہے ہیں اور انسانی انضمام و اختلاط (Assimilation) کی صورت پیدا ہو رہی ہے اور اس طرح ناول نگار کا اپنا بسیط وژن، ذاتی تجربے، تلخ ترین حقائق اور گہرے مشاہدے کے حوالے سے ناول کی تہہ سے نہایت فنکاری کے ساتھ ابھرتا ہے۔ ناول نگار کا ایک سماجی وژن بھی ہے جو اس کے مقصد کو باوقار بناتا ہے اور ناول کا فارم ابتدا تا انتہا پہاڑ سے بہتے ہوئے چشمے کی مانند بہتا چلا جاتا ہے جو اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔

نقل مکانی کی اس کہانی میں نئی زمین پر آباد ہونا اور اپنی شناخت کے مسائل سے نبرد آزما رہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ نا مساعد حالات کی تاریک راہوں سے گزرتے ہوئے نئی جگہوں میں اپنے جانے پہچانے راستے، اپنے گھر بار، اپنے بازار اور اپنی کھوئی ہوئی جنت کو از سر نو دریافت کرنا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بقول شاعر وہ شام کے منظروں میں پرندوں کے اس غول کی طرح ہیں جن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا، انھیں تعمیر کرنا پڑتا ہے لیکن اس تعمیر سے پہلے ان کا اپنا پیچھے رہ گیا شہر ان کی ذات کے نہاں خانے میں ازلی طور پر بسا ہے۔ وہ اس قدر ناسٹلجیا کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کے تصور میں بسے ہوئے ان کے اپنے شہر کی ہر دلعزیزی پر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ پاگل نہیں ہوتے بلکہ نواب مرزا کمال الدین کی طرح دیوانے مولوی صاحب کے روپ اپنے لکھنؤ کو کراچی میں من و عن بسا لیتے ہیں۔ یہ دیوانگی ان کی زندگی کا جواز بھی ہے۔ اس حیرت زا Eccentricity کی بنیاد کو جوگندر پال نے ناولٹ کے پہلے صفحے پر کس قدر اختصار مگر فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے:

''یہ لکھنؤ ہے۔''

ملک کی تقسیم پر جب لکھنؤ کے مہاجرین کراچی چلے آئے تو ذرا سنبھلتے ہی انھوں نے یہاں بھی اَمین آباد کا چوک کھڑا کر لیا......اَمین آباد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور مہاجرین اَمین آباد کے گرد و پیش پاؤں جمانے لگے۔ کہتے ہیں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقامات ہمیشہ وہ مقام کیے رہتے ہیں مگر یہاں تو مہاجرین دل ہی دل میں شہر کا شہر اٹھا لائے، کوئی اپنے گھر کی اینٹیں، کوئی جوں کا توں پورا گھر، کوئی ساری گلی، کوئی گلی سے باہر تیز تیز چلتی سڑک، جو بھی جس کا دل میں سمایا اور جب کراچی پہنچ کر ان کی سانس میں سانس آئی تو انھوں نے دلوں سے اینٹ اینٹ سارا شہر برآمد کر لیا۔ خدا جانے جہاں یہ شہر واقع تھا وہ اب کیا رہ گیا ہوگا۔ یہاں تو اس کی پھبن کا یہ عالم ہے کہ کوئی کراچی کے اسیر کو آئے تو اس سے بار بار پوچھا جاتا ہے، کراچی میں لکھنؤ دیکھا۔'' (صفحہ 7)

جوگندر پال کو افسانے اور کہانی کے بیانیے پر گہری دسترس حاصل ہے۔ ناول کے ابتدائی اقتباس سے ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ تفصیلات میں حقیقت اور خواب کے انضمام کی کیسی گنجائشیں ہیں، بیان کی طوالت میں نہ جاتے ہوئے مشاق فن کار جوگندر پال اپنے طرز بیان میں حقیقت کی زمین پر خواب یا فنتاسیہ کا تاثر پیدا کرتے ہیں جو میرے خیال میں جادوئی حقیقت نگاری کی ہی ابتدائی شکل ہے۔ اس طرح کی تکنیک کی بنیاد پر بھی ناول نگار نے پورے ناولٹ میں جذبے اور رنگ آمیزی سے نہایت دانشورانہ انداز میں دردمندی کا ماحول قائم کیا ہے جو بحران تقسیم کے ساتھ کردار کی نفسیات کو ہمارے ذہنوں میں آباد کر دیتا ہے۔ اس Meandering narrative میں دیوانے مولوی صاحب یعنی نواب مرزا کمال الدین صاحب اپنے وطن عزیز لکھنؤ اپنے اندر بسا کر کراچی چلے آئے ہیں۔ لکھنؤ ان کے اندر پھانس کی طرح اٹکا پڑا ہے۔ یہ تقسیم وقت کا گہرا اور سنگین ترین المیہ ہے جو زندہ لوگوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ بھائی چارے کے ہمراہ بسی بسائی جنت کو (Divide & Rule) کی سیاست نے تہہ و بالا کر دیا لیکن کچھ لوگ اس طرح بھی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے جو اپنی جڑوں سے گہرے طور پر مربوط اور نئے مقام پر اپنے وطن کو اپنے تصور میں لیے چلتے رہے۔

یوں دیکھا جائے تو ناول خواب کے پل پر تیار کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کی اصل جنت تو پیچھے رہ گئی لیکن ان کی دیوانگی میں نئے مقام پر ہی ان کے خوابوں کا شہر آباد ہو گیا۔ کراچی کو درحقیقت لکھنؤ مان کر جینا بھی طلسم ہے اور اس بنیاد پر ناول کے واقعات کو ترتیب و تشکیل دینا اور انسانی محبت اور انسانی سائکی کے ساتھ نہایت ہنرمندی سے دونوں ملکوں کی تہذیب، طرز رہائش اور مرتبے کو پیش کرنا جوگندر پال کا کارنامہ ہی کہلائے گا۔ اس مختصر ناولٹ میں انسانی دردمندی کی ایسی فضا قائم کی گئی ہے کہ کہیں بھی ناول نگار کا جبر یا مداخلت ناول پر گراں بار نظر نہیں آیا بلکہ ناول اپنی رفتار سے، بغیر فریقین کی جانب داری کے، کرداروں، ان کی اولادوں، ان کے عزیزوں (دیوانے مولوی صاحب، اچھی بیگم، اولادیں نواب مرزا، اسحاق مرزا، سالے حکیم جمال الدین، ہاشم علی، چائے والا عزیزو، باورچی اور دیگر کردار) اور ان کے حالات کے حوالے سے اپنی منزل، اپنے Denouement تک پہنچتا ہے۔ پورے ناول میں ناول نگار نے ماحول، صورت حال، مہاجروں کی ذہنی کیفیت، نئے مقام کے لوگوں کی روداد اور وہاں کے تشدد اور ہنگامے کے مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ معروضی طور پر اور Detatched ہوتے ہوئے بھی تقسیم ہند کے اہم گوشے، ہجرت کا کرب اور عام انسان کے انضمام و اختلاط اور سندھی پنجابی خاندان کے تناظر نہایت قرینے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک پرامن مستقبل میں ہم آہنگی کی صورت نظر آنے لگتی ہے۔ یہ سبھی گوشے قصے کے درمیان سے دھیرے دھیرے ابھر آتے ہیں۔

'خواب رو' میں جوگندر پال نے کہانی میں موجود رہ کر بھی Dispassionate اور معروضی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ صرف اور صرف جوگندر پال کا حصہ نظر آتا ہے جو دردمندی اور انسانی نظریے (Humanistic View) کو ناول کی ساخت میں سمو کر ناول کا اہم جز بنا دیا ہے۔ کراچی سے بے دخل ہو کر لکھنؤ آ کر بس جانے والے خاندان کے بیان میں اپنے طرز کے مطالعے کی سمت کو طے کرنے کے بعد واقعات اور کرداروں کی تشکیل و ترتیب نہایت قابل فہم بیانیے کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے تا کہ گفتگو، کردار، واقعات کا عمل دخل معنی خیزی کے پل صراط سے گزر سکے۔ یہاں دیوانے مولوی صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں جو ان کا بہت خیال رکھتی ہیں اور ان کی دیوانگی کو ان کے جینے کا اہم سبب گردانتی ہیں۔ نواب مرزا کی بیگم چاند بی بی اور دل سے نہایت قریب نواسی آخر آخر تشدد اور نفرت کا شکار بن جاتی ہیں۔ اگرچہ مرزا کی فیکٹری میں مقامی لوگوں کا کام کرنا اُمید افزا معلوم ہوتا ہے، لیکن چھوٹا فرزند اسحٰق مرزا دوری، دوئی مخالفت اور نفرت کے باوجود نئی فضاؤں میں جینے کی تمنا کرتا ہے، سندھی لڑکی سے نکاح بھی کرتا ہے، بچے بھی ہوتے ہیں اور محبت کے پل کی تعمیر بھی ہوتی ہے۔ ان کے پنجابی دوست فقیر محمد کا نئے رشتوں کی طرف مثبت رویہ اور بھائی چارہ یا انضمام واختلاط (Assimilation) انسان دوستی کی طرف مثبت اشارے ہیں۔ اس مختصر سے ناولٹ میں باورچی کا کردار بڑا دلکش اور محبت کی دھیمی آنچ میں سلگتا ہوا کردار ہے جس میں گہرائی اور گیرائی ہے اور معنی خیز اعمال و افعال کی بنیاد پر وہ دیوانے مولوی صاحب کے نازک ترین لمحے میں سہارا بن کر کشمیری بھائی چارگی اور محبت کی کلید فراہم کرتا ہے۔

کراچی اور لکھنؤ مولوی صاحب کے تصور میں ایک دوسرے سے گھلے ملے اور گتھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں شہر بیک وقت ایک ہی مقام پر آباد ہیں۔ یہ خواب اور حقیقت کا ایسا افسانہ ہے جو ایک خاندان کے حوالے سے پورے منظر نامے کا بیانیہ بن گیا ہے، ایک خاندانی کل میں سمٹ کر اس طرح اس کی ساخت کو ناول میں پیش کیا گیا ہے کہ جس کے گرد کئی ضمنی کہانیاں، سیاسی اتھل پتھل، ہنگامے، تشدد، بم اندازی، رشتوں میں دراڑ اور نفرت کی فضا میں سب کچھ حل نظر آتا ہے۔ ہجرت کا موضوع، نقل مکانی کے درد اور اس کی کیفیات، نئے موسموں اور نئے مقاموں کی خبریں لوگوں پر مختلف اسرار کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور ناول نگار مختصر روداد کے بڑے سے کینوس پر ساری جزئیات کو یکجا کر دیتا ہے۔ ناول نگار کا ایک کمال تو یہ ہے کہ دو ملکوں کے افراد کے منفرد احساسات، جذبات، انفرادیت اور عام سی عادتوں کو بھی کرداروں کے حوالے کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو کراچی کا جغرافیہ کہیں نہیں بدلتا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ پورے کا پورا جڑ سے اکھڑ کر یہاں بسا ہے۔ پہلے جملے سے ہی ہم اس سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں اور جلد یا بدیر یہ احساس ہوتا ہے کہ کرداروں کے رویے میں، خاص طور پر دیوانے مولوی صاحب کے رویے اور برتاؤ میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اس کے ساتھ چپکے چپکے ہم کراچی میں لکھنؤ ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ چوکیدار کا یہ بلیغ جملہ ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔

''یہ لوگ ہو بہو دکھنے لگے جو خواب کے راستے چوک میں نکل آئے ہوئے ہوتے۔'' (صفحہ 7)

یا پھر:

''لکھنؤ کے راستے ہر جانب سے کراچی میں کچھ اس طرح کھل گئے ہیں کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہی میرٹھ، ملیح آباد، اعظم گڑھ یا الہ آباد جا پہنچے ہیں۔ چار پانچ برس پہلے دیوانے مولوی صاحب کا چچیرا بھائی ہندوستانی لکھنؤ سے ان سے ملنے آیا تو اسے حیرت سے اپنا دماغ ادھڑے ہوئے محسوس ہونے لگا تھا۔'' (صفحہ 12)

یا پھر:

''آنا جانا تو ٹورسٹ کا کام ہوتا ہے جیسے آپ کا اور سنیے، ایک مقام دو مقامات پر واقع نہیں ہوتا۔ ہمارا لکھنؤ واحد لکھنؤ ہے۔ ہم کسی اور لکھنؤ کو تسلیم نہیں کرتے۔ آیا سمجھ میں؟'' (صفحہ 13)

اور یہ سارا ماجرا اس وقت بھی وقوع پذیر ہوتا ہے جب مہاجرین نے معاشی طور پر نئے مقام پر اپنی حیثیت ایک بڑی حد تک مستحکم کر لی ہو۔ اسحٰق مرزا لکھنؤ کو دل سے نکال کر سندھی بستی میں آباد ہوتا ہے لیکن ناول نگار کی دور بین نگاہوں نے تاریخ کے جبر کو تاریخ دانوں سے بہتر انداز میں دیکھا ہے۔ تقسیم پر ان کے فلسفیانہ خیالات اور گہرے تجربات کا اظہار ملاحظہ فرمائیں:

''کیا تمھارا یہی مشاہدہ نہیں ہاشم؟ ہندوستان کے تعلق سے تو ہمارے بڑے بڑے تو اس قدر ناستلجیا کا شکار ہیں کہ یہیں کے آموں کو ملیح آباد کا آم نہ کہہ لیں تو انھیں دو کوڑی کا بھی نہیں گردانتے ہیں۔ ایک طرف یوروپ کے ترقی یافتہ ممالک ہیں کہ وہاں بیسیوں ریل گاڑیاں ہر

روز ایک ملک سے دوسرے ملک میں اس مانند داخل ہوتی رہتی ہیں جیسے ایک ہی ملک کے ایک ہی شہر سے دوسرے شہر میں، دوسری طرف ان دو بدقسمت پڑوسی ملکوں کے باشندے تصوّر میں بھی اِدھر سے اُدھر کترا جاتے ہیں کہ کہیں ویزا کے عوض دھر نہ لیے جائیں۔'' (صفحہ 82)

ہاشم اور اسحٰق مرزا کے درمیان خط کے حوالے سے جو باتیں درج ہیں، سیاسی طور پر آج بھی Relevant ہیں اور اس کی سچائی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہاں واقعات یا ماجرے کے مرکز سے دوری پر رہ کر بھی ناول نگار نے راوی/ بیان کنندہ کے حوالے سے رونما ہونے والے سنگین حالات کی بھی ساری کیفیات اور معلومات قاری کے سامنے پیش کر دی ہیں۔ یہاں جوگندر پال کا نکتۂ نظر، ان کا فکر و فلسفہ بھی ہم تک کرداروں کے حوالے سے پہنچتا ہے تاہم وہ فریقین میں سے کسی کو بھی موردالزام نہیں ٹھہراتے ہیں اور اپنی بے جا ہمدردی اور غیر منصفانہ طرزِ بیان سے کہیں بھی سوائے مختصر تبصرہ کے کہ جہاں وہ وقت اور حالات کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی طرح کی واضح شکل میں کوئی بات نہیں کہتے۔ یہاں ان کا فلسفیانہ وژن اپنے شباب پر ہے۔ یہی Destiny تھی دونوں ملکوں کی اور یہیں پر دیوانے مولوی صاحب کردار سازی کا ایک اعلیٰ نمونہ بن کر ہمارے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ دیوانے مولوی صاحب کی دیوانگی کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں، اور اچھی بیگم اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کی یہ دیوانگی ہی ان کے زندہ ہونے کی دلیل اور علاج ہے۔ وہ پاگل نہیں۔ اسحٰق مرزا کو بھی آخر اس حقیقت کا عرفان ہو جاتا ہے۔ دیکھیے انسان دوستی کو بیانیے کے عرصے میں رکھ کر حقیقی معنی کی دریافت کی طرف کس مستعدی سے لیے چلتے ہیں اور قاری کو اعتماد میں لے کر یہ منوا لیتے ہیں کہ دیوانگی کا علاج یہی دیوانہ پن ہے:

''اسحٰق مرزا اپنی اس خواہش سے بے چین ہو اٹھا کہ جو مہاجرین اپنے چھوٹے ہوئے مقامات کی دید کو ترستے ہیں، انھیں زبردستی پاگل پن کا ٹکیہ لگا دیے جائیں۔ ایک لمحے کی چھبیں یہی ہے تو ہے جس کے بعد سرکاری شعبوں کے صابطوں سے آزاد ہو کر وہ اپنے اولین مقامات پر ہنستے کھیلتے بسر کرنے لگتے ہیں۔ پاگل لوگ اتنے نیک اتنے انجان اور کھلنڈرے ہوتے ہیں کہ کڑی سے کڑی سرکاریں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرمسار ہو جاتی ہیں۔'' (صفحہ 64)

اس طرح جوگندر پال بیشتر مقامات پر اپنے بیانیے میں اپنی فکر و نظر کے حوالے سے معنی کی لہریں فراہم کرتے جاتے ہیں اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ ناول نگار کا عمل میکانیکی صورت حال کے تابع اپنا مطمح نظر پیش کر رہا ہے۔ یہیں سے انسان دوستی کہانی کے تانے بانے کو روشن کرتی جاتی ہے۔ ایسی معنی آفرینی اور کردار سازی نیز پلاٹ کی گنجائشیں کم ناول نگار کے حصے میں آئی ہیں۔ اس طرح کی معلومات اور تہہ داری ہمیں انتظار حسین کے افسانے اور ناولوں میں دکھائی دے جاتی ہے۔

جوگندر پال نے اپنے کردار دیوانے مولوی صاحب کو خلق کرتے ہوئے یونہی تو نہیں لکھا تھا کہ ''جہاں بھی جاؤں گا اپنے باطن سے باہر تھوڑے ہی پہنچوں گا'' یا ''میرے سر میں دیکھو۔ گھونسلوں کا ایک پورا شہر پاؤ گی۔'' (صفحہ 65)

شک وشبہے سے دور، جینے کے لیے تصورات کی یہی طلسمی دنیا جوگندر پال کا بڑا کارنامہ ہے، اسی طرح کے خیالات و معروضات کے سہارے پورے ناول میں ہجرت کا کرب، مہاجر اور سندھی پنجابی کی دوئی، منافرت اور عناد کا ماحول، ہنگامی صورت حال، دھماکوں میں بار بار شہر کا لرز اٹھنا، کہانی کو ایک رواں بیانیے میں آگے بڑھاتے ہیں۔ ناول میں عام انسانوں، مہاجروں کی آرزوؤں اور تمناؤں، خوابوں اور دُکھوں کی عکاسی اور ان کے جذبات کی ترجمانی ترتیب وار، تاریخ وار اور گہری شناخت کے ساتھ کی گئی ہے کہ قاری ناول نگار کی انسان دوستی، داخلی کشادگی اور بصیرت افروزی کا دھیرے دھیرے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب اپنی ساری یادوں، تہذیب کی ساری نعمتوں سمیت بکھر کر کراچی میں آباد ہو کر بھی لکھنؤ سے کبھی رخصت ہی نہیں ہوئے اور ہوئے تو لکھنؤ ہی پہنچے۔ آخر میں جب بم دھماکے میں ان کا خاندان خاکستر ہو جاتا ہے تب بھی انھیں یہ احساس رہتا ہے کہ لکھنؤ تو یہیں ہے۔ یہ خواب ایک نوع کی تمہید ہے۔ ایک طرح کا طلسم، جو حقیقت کے برعکس اپنی ذاتی حقیقت تراش لینے کے عوض مولوی صاحب کے جینے کا بہانہ ہے اور اس کے ڈانڈے آج کی موہوم/طلسمی حقیقت نگاری سے کہیں تو جا کر ملتی ہے اور جب اختتام میں دھماکے کے بعد ان کی بیوی اچھی بیگم اور چہیتی ثریا تک تہہ خاک ہو جاتی ہے تو ایک مقامی شخص ان کا باورچی سہارا دے کر انھیں بحال کرتا ہے۔ یہاں نئی تکنیک کے استعارے، اشارے، علامتیں بعیداز فہم نہیں بلکہ خواب اور حقیقت کی زمین پہ بیانیہ راست زبان میں ہے اور حسن اختلاط اور انضمام کے گوشے پر بھی اس خوبی اور آہستگی اور غیر مرئی انداز میں روشنی پڑتی ہے کہ جوگندر پال کا دیوانہ مولوی صاحب زندۂ جاوید کردار کی صورت ابھرتا ہے، اپنی دیوانگی میں خواب کی راہ پر چل کر جینے کا حوصلہ پاتا ہے اور اپنے نئے مقام میں 'خواب رَو' کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے۔

خواب اور حقیقت کا یہ تا دیر ایک دوسرے میں الجھاؤ کہانی میں کشش پیدا کرتا ہے اور ماہر فنکار کی طرح ایسا رنگ کہانی کے دروبست میں بھرتا ہے کہ بعیداز فہم علامتوں اور ترسیل کی ناکامیوں کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑتا۔ لہٰذا یہ ناول ہر خاص و عام قاری کے لیے بلکہ آنے والے وقت کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ قیام پاکستان، بٹوارہ، بے گھری، ہجرت کے کرب کے پہلو بہ پہلو سیاست کی پیچیدگیاں اور انسانی دردمندی کی مثالیں بھی ناول میں لرزتی نظر آتی ہیں۔ جوگندر پال نے بغیر لڑکھڑائے اور ایک غیر جانب دار بیان کنندہ کی حیثیت سے اس خطرناک خلیج کو پار کیا ہے۔ وہ Detached انداز میں اپنی ذات کو قربان کر کے کہانی کو آباد کر لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ کہیں انھوں نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ''کہانی کار کو اپنی ہنرمندی میں نمائش نہیں کرنا ہوتی بلکہ اپنی کہانی کو ویسے ہی جینا بھوگنا پڑتا ہے جیسے وہ زندگی کو جینے بھوگنے کا خوگر ہو'' کہانی پُرخار وادیوں سے گزر کر فن کے عروج پر پہنچتی ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ:

''قدم قدم پر بہک جانے کا ڈر تھا مگر جس کامیابی بلکہ فنکارانہ کامیابی کے ساتھ وہ اپنے موضوع سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کے تجربے میں بڑی گہرائی، پختگی اور صلابت ہے۔ ناول نگار کا فن وہاں اپنے عروج پر ہوتا ہے جہاں ناول نگار اپنے نقطۂ نظر میں اس کے فن میں ایک دوسرے کی تکمیل کی صورت میں حل ہو جائیں۔ 'خواب رَو' اسی فنی ارتکاز، دھیمے آہنگ اور لمحۂ سکوت کی ایک تشکیل تریں صورت ہے۔''

(جوگندر پال 'ذکر، فکر، فن' ترتیب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص 457)

'خواب رَو' میں موضوعات کا تنوع تو ہے ہی، ایک ایسا توازن بھی ہے جو زبان، تکنیک، کردار اور خود پلاٹ کی دین ہے۔ جوگندر پال نے اس ناول کے بیانیہ ڈھانچے کو نہایت باخبری اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ترتیب دیا ہے جو انسانی روح کے داخلی ارتعاشات اور اس کی طاقت کی دریافت میں ممد و معاون ہیں اور ہجرت کے کرب و بلا کو پاٹ کر اپنی زندگی گزارنے کے اہل بھی ہوتے ہیں۔ پورے ناول میں زبان اپنے 'مقامی گھنے پن' کے باعث جدید ناولاتی تکنیک سے جا ملتی ہے اور یادداشت کے مرحلے کو ہنرمندی سے طے کرتی جاتی ہے۔ یہیں پر حقیقت اور فنتاسیہ کا اہتمام اور ذیلی تہذیبی جڑوں (Sub-Altern Cultural Root) سے ناول کا رشتہ قائم ہوتا نظر آتا ہے۔

■

Mr. Zahir Anwar
10/1- Ahiri Puker, 1st. Lane
KOLKATA-700019 (W.B)
Ph:9831260504

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ایس ایم شکیل

خاندیش میں اردو تحقیق و تنقید

خاندیش میں شعراء علما صوفی حضرات تو خوب ہوئے۔ شاعری پر سیر حاصل کام بھی ہوا۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو تحقیق و تنقید میں جس قدر کام ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہوپایا۔ شاید اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس میدان میں کافی نشیب و فراز ہے۔

اردو تحقیق وتنقید کا نقطۂ آغاز شعرائے اردو کے تذکرے ہیں۔ تذکرہ جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی یاد کرنا یا ذکر کرنا ہوتے ہیں۔ اردو تنقید کی نشو ونما میں ان تذکروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہماری ناقدانہ بصیرت ان ہی تذکروں کی فضا میں پروان چڑھی اور ان ہی تذکروں سے ذوقِ ادب کے عام ہونے میں مدد ملی۔ محقق بھی اپنے تحقیقی سفر کے آغاز میں ان ہی تذکروں کا سہارا لیتا ہے۔ اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز حالی کے 'مقدمہ شعروشاعری سے ہوتا ہے۔ جب حالی نے اپنا دیوان ترتیب دیا تو اس پر انہوں نے ایک مقدمہ لکھا جو 1893 میں مقدمہ شعروشاعری کے نام سے علاحدہ شائع ہوا، جس میں شاعری کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی کوتاہیوں کی صرف نشاندہی نہیں کی بلکہ اس کی اصلاح کی تجویزیں بھی پیش کی ہے۔ حالی نے اس مقدمہ کے ذریعہ اردو شاعری کو ایک نئی سوچ، نیا طرز اور اسلوب عطا کیا۔ اس کتاب کی مقبولیت نے حالی کو جدید اردو تنقید کا بانی قرار دیا۔ حالی کے بعد اردو تنقید اپنا کامیاب سفر طے کرتی رہی۔ اردو کے اہم ناقدین اور محققین میں محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، وحید الدین سلیم، امداد امام اثر، مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی، عبدالرحمن بجنوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، حافظ محمود شیرانی، نصیر ہاشمی، سید وقار عظیم، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، محی الدین قادری زور، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ہی ناقدین و محققین ادب کی راہ پر چلتے ہوئے مہاراشٹر کے قدیم و تاریخی صوبہ علاقۂ خاندیش کے محققین و ناقدین نے اس میدان میں قدم رکھا اور اس علاقے میں اردو تحقیق وتنقید کے لیے راہ ہموار کی۔

خاندیش میں شعرا، علما اور صوفی حضرات تو خوب ہوئے۔ شاعری پر سیر حاصل کام بھی ہوا۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو تحقیق وتنقید میں جس قدر کام ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہو پایا۔ شاید اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس میدان میں کافی نشیب وفراز ہے۔ محققین اور ناقدین کو بہت عرق ریزی اور محنت سے کام لینا ہوتا ہے۔ تب جا کر وہ فنکار کی ذہنی سطح اور ان کے شعور سے آگاہ ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر کے قلمکاروں کا رجحان سہل پسندی کی طرف کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ اکثر ایسا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں انھیں کسی قسم کی دشواری اور مشکل پسندی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ باوجود اس کے اس علاقے میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے جتنا بھی کام ہوا ہے وہ اطمینان بخش ہی نہیں بلکہ ادب میں اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ ان ہی کاموں کی وجہ سے ہم یہاں کے ابتدائی دور اور اردو شعروادب کو سمجھ پائے ہیں۔ گذشتہ صدی کے آخر میں اس علاقے میں نثر نگاروں کی تعداد میں اضافہ اردو زبان کی ترقی اور بقا کا ضامن بن گیا ہے۔ خاندیش میں جن قلمکاروں نے اردو تحقیق وتنقید کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ ان میں ناظر انصاری جلگانوی، فخر دھولیوی، اکبر رحمانی جلگانوی، قاضی مشتاق احمد، ذاکر عثمانی راویری، ڈاکٹر سلیم انصاری دھولیوی، ڈاکٹر شبیر اقبال دھولیوی، ڈاکٹر ایم اقبال شیخ جلگاؤں، ڈاکٹر اقبال شاہ جلگاؤں، ڈاکٹر رشید صہبائی دھولیوی، ایم رفیق بیاولی، مقیم اثر بیاولی، معین الدین عثمانی جلگانوی، ڈاکٹر محسن جلگانوی، عبدالعزیز انصاری دھولیوی، ڈاکٹر ساجد علی قادری شیر پور، ڈاکٹر ایس ایم شکیل وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

خاندیش میں بیسویں صدی کی ابتدا کے بعد ہمیں جو نقاد نظر آتے ہیں ان میں ناظر انصاری جلگانوی کا نام نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ غلام محمد ناظر انصاری جلگاؤں کے نصیر آباد میں 9 نومبر 1909 کو پیدا ہوئے۔ 1930 کے آس پاس جلگاؤں میونسپل میں آپ درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ آپ نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی اہم اور کلیدی کردار ادا کیا۔ 1967 میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مالیگاؤں میں سکونت اختیار کرلی۔ جہاں یکم اپریل 1973 کو مالکِ حقیقی سے جاملے۔

ناظر انصاری نے شاعری خصوصاً نظموں کے ساتھ اردو تنقید میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'آہنگِ ادب' کے نام سے جون 1967 میں علوی پریس بھوپال سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ان

مضامین کا انتخاب ہے جو نگار لکھنؤ، فاران، العلم، جامِ نو، نیرنگِ خیال، دورِ حیات، ہماری زبان، معیارِ ادب، رہنمائے تعلیم، پیامِ مشرق وغیرہ ہندو پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ خلیل الرحمٰن اعظمی اور تبصرہ عبدالقوی دسنوی نے لکھا ہے۔ آہنگِ ادب میں مختلف عنوانات پر کل دس تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جو اس طرح ہے۔ (1) سراج اونگ آبادی (2) یادگارِ انیس (3) جدید ادب کا امام حالی (4) کلام اقبال میں طنز و ظرافت (5) مجاز لکھنوی (6) کلام جگر میں عصری رجحانات (7) علامہ محوی صدیقی لکھنوی (8) آنجہانی تلوک چند محروم (9) ادب منزل بہ منزل (10) اختر الایمان اور یادیں۔ ان مضامین میں قدیم و جدید شعرا کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے، جس پر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

''ناظر صاحب چونکہ خود بھی ایک معلم ہیں اور انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس میں صرف کیا ہے اس لیے اپنے موضوع کی طرف ان کا رویہ عام طور پر توضیح و تشریح، تعبیر و ترجمانی اور افہام و تفہیم کا رہا ہے وہ ایک ذہین تجربہ کار استاد کی طرح زیر بحث شاعر کے بارے میں محض رائے دینے یا محاکمہ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس سے متعلق بعض بنیادی اور اہم معلومات فراہم کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تا کہ شاعر مذکور کے کلام کی خصوصیات کے لیے ایک مناسب پس منظر تیار ہو سکے اور آگے چل کر جو کچھ کہا جائے اس کے سلسلے میں کسی طرح کے ابہام یا پیچیدگی کو راہ نہ ملے۔'' (آہنگِ ادب ص 19)

ناظر انصاری نے آہنگِ ادب میں شامل تمام شعرا کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے اور اپنی ناقدانہ رائے بھی پیش کی ہے۔ آپ کی زبان نہایت سلیس اور سادہ ہے جس کا اعتراف عبدالقوی دسنوی (صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال) یوں کرتے ہیں:

''ناظر انصاری صاحب کی تحریر میں سادگی اور صفائی ہے وہ اپنی بات قاری کے ذہن و دماغ میں آسانی سے اتار دیتے ہیں۔ طریقۂ استدلال بھی سلجھا ہوا ہے۔'' (ایضاً 22)

آہنگِ ادب کے علاوہ آپ کے مضامین کے دو مجموعے 'نگارِ ادب'، 'بساطِ ادب' اور 'مجاز لکھنوی حیات اور فکر و فن' کا ذکر ناظر انصاری کے ایک انٹرویو میں ملتا ہے۔ مگر یہ تصانیف شاید منظر عام پر نہ آسکیں۔ 1971 میں ناظر انصاری نے اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی جو فہرست تیار کی تھی اس میں ان دو کتابوں کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں! اس فہرست میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کی دو کتابوں کے نام 'نیرنگِ ادب'، 'نقشِ ادب' تحریر کیے گئے ہیں۔ شاید ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کے نام بعد میں بدل دیے گئے ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناظر انصاری اپنے مجموعے کے عنوان کو لے کر کافی محتاط تھے۔ وہ مناسب نام کی تلاش میں تھے۔ کیونکہ کبھی انہوں نے اپنی کتاب کا نام مقالاتِ ناظر رکھا تو کبھی مصباحِ ادب یا پھر نگارِ ادب یا بساطِ ادب۔ لیکن بعد میں اس غیر مطبوعہ کتاب کا نام نیرنگِ ادب ہی تجویز کیا۔

بقول اکبر رحمانی جلگانوی:

''تنقیدی مضامین پر مشتمل اس کتاب میں کل 15 مضامین شامل تھے۔ ان میں دو مضامین کے بارے میں یہ وضاحت کی گئی کہ انھیں لکھنا باقی ہے۔ فہرست مضامین اس طرح ہیں: غالب نقطہ داں، قاضی عبدالغفار اور ان کا فن، حسرت موہانی کی شاعری (لکھنا باقی)، فانی کا تغزل، اقبال ایک عظیم شاعر اور مفکر، شاعر و فنکار۔ اقبال میری نظر میں، فیض احمد فیض، جگر مغنیِ حیات، شہنشاہِ تغزل، وامق جونپوری، مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت کا فن (تراشیدہ کی روشنی میں)، اردو غزل میں زلف و گیسو کا تصور، علی سردار جعفری کی شاعری (لکھنا باقی)۔''

(خاندیش کی ادبی تاریخ، ص 152)

نیرنگ ادب کا پیش لفظ ماہنامہ شاعر ممبئی کے مدیر اعجاز صدیقی نے لکھا اور اظہارِ عقیدت کے عنوان سے ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر ظفر الاسلام نے دیباچہ 'کھو دودھ کا دودھ' کے عنوان سے، تقریظ سید سلیمان ندوی نے اور خواجہ محمد شفیع دہلوی نے تاثرات تحریر کیے ہیں۔

ممتاز ناقد ڈاکٹر قمر رئیس نے نیرنگِ ادب (غیر مطبوعہ) میں ناظر انصاری کی تنقید نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''ضبط و توازن کا احساس اور افراط و تفریط سے گریز ناظر صاحب کی تنقید کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ جانب داری تنگ نظری اور کٹر پن کہیں بھی ان کی تنقید میں بار نہیں پاتا۔ اس طرح ان کے نظریۂ ادب میں بھی صالح اور صحت مند قدروں کا احترام نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ تخلیقی اظہار اور شعر و ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات کی گہرائی اور بلندی پر بھی نظر رکھتے ہیں... الغرض ایک معقول اور متوازن اندازِ نظر ان کی اکثر تنقیدوں کو ایک معروضی اور علمی وقار بخش دیتا ہے۔'' (ایضاً ص 156)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناظر انصاری نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خاندیش میں اردو تنقید کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ناظر انصاری کے بعد علاقۂ خاندیش میں اردو تنقید و تحقیق میں منفرد مقام حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر افتخار احمد فخر دھولیوی کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ منشی عبدالجبار کے علمی و ادبی گھرانے میں 10 مئی 1924 کو افتخار احمد نے آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے اسماعیل یوسف کالج ممبئی سے بی اے اور سینٹ زیویئز کالج ممبئی ہی سے ایم اے اردو کی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1953 میں آپ ایم جے کالج جلگاؤں میں اردو فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ لگ بھگ 1973 میں آپ نے 'سیماب اور دبستانِ سیماب' پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ جس پر آپ کو پونہ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ غالبًا آپ علاقۂ خاندیش کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ (سندی تحقیق میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے) نثر کے ساتھ ہی فخر تخلص رکھتے ہوئے آپ نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے معیاری اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ افتخار احمد فخر نے کئی تحقیقی سیمناروں میں علاقۂ خاندیش کی کامیاب نمائندگی کی ہے۔ فخر کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ 'ادب و نظر' 1980 میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ جسے مہاراشٹر اردو اکادمی نے 1981 میں دوسرے انعام سے نوازا تھا۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات پر لگ بھگ 9 تحقیقی و تنقیدی مقالے شامل کیے گئے ہیں۔ جو مضامین شامل کتاب ہیں وہ اس طرح ہیں:

غالب کی دقت پسندی اور فارسیت، جگر مراد آبادی فن شخصیت اور شاعری، غالب کے کلام میں رشک و حسد کا عنصر، ریاض خیر آبادی اور ان کی شاعری، غالب کے کلام میں شوخی اور طنز و ظرافت، ابوالبیان حضرت حنیف کریمی، خصوصیاتِ کلامِ غالب، نکہت و نور کا شاعر سلام سندیلوی، اردو غزل کے جدید رجحانات۔ اس کتاب میں ڈاکٹر شیخ فرید (برہان پور)، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (برہان پور) اور ڈاکٹر محمد فاروقی (احمد آباد گجرات) کی آرا شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروقی (سابق صدر شعبۂ فارسی اردو واسلامی کلچر گجرات کالج، احمد آباد) ادب و نظر کے مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''ڈاکٹر فخر اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ زیر نظر مقالے ان کی نثری صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں ان میں فخر کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی ژرف نگاہی کا

فراواں ثبوت ملتا ہے۔فخر شاعر کی شخصیت اور کردار کے تناظر میں کلام کا بڑی چابک دستی سے تجزیہ کرتے ہیں۔''

(فلیپ کور، ادب ونظر)

آپ کی دیگر غیر مطبوعہ تصانیف میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ معیارِادب اور تلامذۂ سیماب کے نام لیے جاسکتے ہیں۔اردو ادب کی یہ شمع 26 اپریل بروز بدھ 2000 کوصرصرِ اجل سے خاموش ہوگئی۔

اس علاقے میں اردوتنقید کوایک نئی راہ عطا کرنے والوں میں ذاکر عثمانی راویری کا نام نہایت معتبر ہی نہیں بلکہ مقبول بھی ہے جنھوں نے اپنی تنقیدی بصیرت سے اردو دنیا میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔شیخ اسماعیل یکم دسمبر 1929 کوشیخ عثمان کے گھر راویر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ضلع پریشد اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دینے لگے۔آپ کا شمار خاندیش کے استاد شعرا میں ہوتا تھا۔شاعری میں ذاکر عثمانی کے نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے نثر نگاری خصوصاً تنقید میں اپنی پہچان بنائی۔ ذاکر عثمانی کوعلم عروض پر بے پناہ ملکہ حاصل رہا۔آپ کا شمار ہندوستان ہی نہیں بلکہ برصغیر کے ماہرین عروض میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور نقاد اور ماہرعروض شمس الرحمٰن فاروقی ذاکر عثمانی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''جناب ذاکر عثمانی کی حیثیت علم عروض میں مجتہد کی ہے۔اور مجتہد کا سب سے بڑا کام یہی ہوتا ہے کہ گذشتہ کی روشنی میں اپنی عقل کا استعمال کریں اور حال کے معاملات پر اپنا حکم جاری کرے۔ جناب ذاکر عثمانی نے یہ کام بڑی خوبی سے کیا ہے۔''

(عروضِ خلیل ملکفی ،فلیپ کور)

ذاکر عثمانی نے علم عروض کی بدولت بڑے بڑے شعرا کے کلام پر بیباک تنقیدی رائے پیش کی ہے۔علم عروض اورتنقید پر آپ کے سیکڑوں مضامین ہندوستان کے معیاری رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔آپ کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے بڑے بڑے اور مقبول نقاد بھی آپ کی تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے۔ ماہنامہ شاعر ممبئی نومبر 2004 کے شمارے میں جس کا اعتراف ملتا ہے:

''ذاکر عثمانی کا مضمون 'تحقیق بحر ووزن اورفن تقطیع' دیکھ کرعقل دنگ رہ گئی۔معتبر ومستند ناقدوں نے مترنم فن پاروں کو سہل پسندی کے تحت مروجہ منتشر بحور میں ڈبوکر ناموزوں قرار دیا تھا۔موصوف نے بروزن ثابت کردیا کہ فن پارے واقعی ذوق و وزن میں ہیں لیکن مختلف ناقدوں کے مختلف بحر ووزن اور ذاکر عثمانی کے قائم کردہ نایاب بحر ووزن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔وہ اتنا کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں حیرت زدہ ہوجاتی ہیں۔

موصوف کا شمار برصغیر کے ماہرین عروض میں تو ہے ہی لیکن یہاں وہ خداداد نمایاں حیثیت وصلاحیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ کہ صحیح بحر ووزن کا تعین 'جوئے شیر لانے کے مترادف ہے' اس قول کے مصداق زنگ آلودہ تنقید کو صاف و شفاف آئینۂ تحقیق دکھا کرآپ نے مفادِعامہ کے ساتھ ساتھ ثقہ عروضوں کے لیے بھی کام آنے والی تحقیق کی ہے۔''

ذاکر عثمانی کی تنقیداورفن عروض پر 'نکات العروض، میری تنقید اور اصلاحیں، عروضِ خلیل ملکفی' کے علاوہ ضربِ احساس (مجموعۂ غزلیات) اردو معلم (اردو تعلیم پر) کلیدِ قواعد، پھول پھول لہو (سلام کا مجموعہ) جیسی اہم تصانیف منظرِعام پرآچکی ہیں۔جن کی اردو دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کہا تھا:

''تنقید وہی لکھ سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دوربین ہو۔ ذوقِ صحیح کے ساتھ ساتھ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو،ایک مدت کے مطالعہ اور غور وفکر کے بعد اپنی رائے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور دوسروں کو دلنشین کرسکتا ہو۔تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی بلکہ اعلیٰ درجہ کا کلام اور اعلیٰ پائے کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔''

مندرجہ بالا تمام خصوصیات ذاکر عثمانی میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔اپنے پیچھے علمِ عروض، تنقید اور شاعری کا اثاثہ چھوڑکر ذاکر عثمانی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

خاندیش میں اردو تحقیق وتنقید کی آبیاری کرنے والوں میں اکبر رحمانی جلگانوی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے، جن کے ذکر کے بغیر اس علاقے کی ادبی تحقیقی وتنقیدی تاریخ نامکمل مانی جائے گی۔ اکبر خان کی پیدائش 17 اکتوبر 1942 جلگاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں سے ایس ایس سی پاس کیا۔ پھر پونہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی بعدازاں ممبئی سے بی ایڈ کیا اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ ابتدا میں پاچورہ، پھر مادرِعلمی اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے۔ اکبر خان بے پناہ صلاحیتوں کے مالک رہے جہاں آپ ایک مشفق استاد کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو وہیں ایک بیباک صحافی، قابل مترجم، محقق، مؤرخ ناقد اور شاندار مقرر کے ساتھ ساتھ ماہرِ تعلیم بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بچپن ہی سے آپ میں کچھ کرگزرنے کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود رہا۔ ایسے تو آپ کی مختلف موضوعات پر کئی کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔مگر بحیثیت مؤرخ محقق اور نقاد جن تصانیف کا ذکر اہمیت رکھتا ہے ان میں تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق، خاندیش کی ادبی تاریخ، تحقیقات و تاثرات اور اورنگ زیب کی داستانِ معاشقہ کیا حقیقت کیا فسانہ، قابل ذکر ہیں۔ان تمام تصانیف میں آپ کی محققانہ اور ناقدانہ صلاحیتیں نمایاں اور صاف جھلکتی ہیں۔ خاندیش کے بکھرے اوراق میں آپ نے خاندیش کی تاریخ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ساتھ ہی اس علاقے کی تعلیم اور یہاں کے مدارس پر بھی تفصیلی معلومات فراہم کی ہے۔ اس کتاب پر شیخ الحدیث مالیگاؤں محمد حنیف ملّی یوں رقم طراز ہیں:

''پروفیسر اکبر رحمانی نے اپنی بساط سے زیادہ اس تاریخی کتاب میں ژرف نگاہی جگر کاوی اور غیر معمولی مغز ماری سے کام لے کر نہ صرف اس موضوع پر بلکہ اس سے شغف رکھنے والوں پر بھی ناقابل فراموش احسان وکرم کیا ہے۔ موصوف نے ذوق تحقیق و جستجو سے خاندیش کے بکھرے حقائق، منتشر اوراق اور پراگندہ صفحات کو بڑے سلیقے سے یکجا کرکے سیکڑوں سال کی تاریخ پیش کرکے دیدہ ودل دونوں کو غذا بہم پہنچائی ہے اور بڑی خوبی وکمال اور ہوش مندی سے جو حقائق پیش کیے ہیں وہ بجائے خود ان کا بڑا تاریخ ساز کارنامہ ہے۔''

(تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق، ص 12)

پروفیسر اکبر رحمانی کی دوسری اہم تصنیف 'خاندیش کی ادبی تاریخ' میں آپ نے اس علاقے میں اردو شاعری، یہاں کے مشاعرے، مرثیہ نگاری، ڈرامہ نگاری وافسانہ و ناول نگاری کے ابتدائی پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو ہم موصوف کا اہم اور دستاویزی کارنامہ تسلیم کرسکتے ہیں۔جس کے ذریعے ہم خاندیش کی ادبی تاریخ اور یہاں کے ادب کو سمجھنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ لمعہ حیدرآبادی اور علامہ اقبال جیسے مشکل اور نایاب موضوع پر آپ نے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ بھی تحریر کیا، مگر کچھ وجوہات کی بنا پر پونہ یونیورسٹی نے ڈگری تفویض نہیں کی۔اس تحقیقی مقالے کے ذریعے آپ نے لمعہ حیدرآبادی، ٹیگور اور علامہ اقبال کے تعلقات کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی موضوع پر آپ کی 'تحقیقات وتاثرات' کے نام سے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ بھی منظرعام پر آچکا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر

مشتمل ہے۔ جس کے پہلے حصے میں تنقید وتاثرات کے تحت ''مثنوی سحرالبیان کا تنقیدی مطالعہ، منشی پریم چند اور احتشام حسین کی افسانہ نگاری، ادب، زندگی اور مقصد کے تحت بڑے ہی پرمغز تنقیدی مقالات تحریر کیے ہیں۔ دوسرا حصہ شخصیات کا ہے جس میں احتشام حسین، پریم چند، مولوی عبدالحق کے شخصی خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا تیسرا حصہ تحقیق کے لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے، جو اقبالیات پر مشتمل ہے، اس حصے میں اقبال، ٹیگور اور لمعہ حیدرآبادی سے متعلق، اقبال اور لمعہ حیدرآبادی کے مراسم، لمعہ حیدرآبادی کے نام اقبال کے خطوط ایک جائزہ، اقبال اور لمعہ حیدرآبادی کے شخصی تعلقات کا جائزہ (مکاتیبِ اقبال کی روشنی میں) وغیرہ تحقیقی مقالات کے ذریعے اقبال اور لمعہ حیدرآبادی کے تعلقات کو دنیائے ادب کے سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ تحقیق اقبالیات کے باب میں اضافی حیثیت کی حامل ہے۔ لمعہ حیدرآبادی کے ساتھ علامہ اقبال کے تعلقات کا ازسرِ نو پتہ لگانے کا سہرہ پروفیسر اکبر رحمانی کے سر جاتا ہے۔ پاکستان سے شائع ہونے والا نیاز فتح پوری کا معروف ادبی رسالہ 'نگار' ادبی دنیا میں بے حد مقبول اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگست 1989 کا خصوصی شمارہ پروفیسر اکبر رحمانی پر فرمان فتح پوری کی نگرانی میں شائع کیا گیا۔ نگار کا خصوصی شمارہ خاندیش کے کسی ادیب کے نام سے شائع ہونا اس علاقے کے لیے قابل مسرت ہی نہیں بلکہ باعثِ فخر بھی ہے۔ 80 صفحات کے اس شمارے میں 76 صفحات اکبر رحمانی کے مقالے پر مبنی ہے۔ نگار کے مدیر فرمان فتح پوری اکبر رحمانی کی تعلیمی وتحقیقی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''جناب اکبر رحمانی ہندوستان کے نہایت سنجیدہ اور خاموش طبع قلمکار ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں پورے سوچ بچار اور کمالِ محنت سے لکھتے ہیں۔ ان کے فکر ونظر کی جولا نگاہ علم وادب دونوں ہیں۔ چنانچہ وہ تحقیق وتنقید کے ساتھ تعلیم وتدریس کے مسائل پر بھی مسلسل لکھتے رہتے ہیں اور مجھ جیسوں کو اپنی فکر انگیز تحریروں سے چونکاتے رہتے ہیں... کچھ روز پہلے ادب سے متعلق ان کی ایک اہم کتاب بعنوان 'تحقیقات وتاثرات' منظر عام پر آئی ہے۔ یوں تو اس کتاب کے سارے مضامین معیاری ہیں لیکن اقبالیات کے عنوان سے اس میں جو کچھ ہے وہ حقیقتاً ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اقبال اور ٹیگور و ڈاکٹر لمعہ کے تعلقات اور ان کے مابین خطوط قضیہ ہمارے پاس بہت دنوں سے شک وشبہات کا شکار تھا اور مغالطے پیدا کر رہا تھا۔ اکبر رحمانی نے اس موضوع پر سچے محقق ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ ان کے تحقیقی بیانات کے بعد اب لمعہ اور اقبال کے خطوط کو جعلی کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ رحمانی صاحب کا یہ کام کئی اعتبار سے قابلِ تحسین اور اقبالیات کے سلسلے میں نمایاں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (نگار، اگست 1989، ص4)

پروفیسر اکبر رحمانی کی ادبی تحقیقی وتعلیمی خدمات پر خاندیش ہمیشہ فخر کرے گا۔ آپ کی خدمات کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ 17 ستمبر 2003 کو خاندیش کے ادبی افق کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

سرزمین خاندیش کے ارنڈول سے تعلق رکھنے والے قاضی مشتاق احمد کا نام ادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ یہ وہ شخصیت ہیں جن کی اردو خدمات پر اہل خاندیش ہمیشہ ناز کرتے ہیں۔ قاضی مشتاق احمد کا شمار ملک کے معروف افسانہ، ناول و ڈرامہ نگار اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش ارنڈول میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ مہاراشٹر سول سرویسز میں اڈیشنل کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے بعد ازاں محکمۂ سماجی و بہبود مہاراشٹر کے اڈیشنل ڈائریکٹر کے عہدے سے 1998 میں سبکدوش ہوئے۔ افسانہ، ناول اور ڈرامہ نگاری کے علاوہ آپ نے صحافت، ترجمہ نگاری، ادبِ اطفال، سفر نامے، رپورتاژ، سوانح، خاکے کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید میں بھی اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ اردو کی مختلف اصناف اور مختلف عنوانات پر آپ کی لگ بھگ چالیس سے زائد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ خاندیش کی پہلی شخصیت ہیں جن کی اردو خدمات پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے قاضی مشتاق احمد فن اور شخصیت عنوان کے تحت محمد عبدالقدیر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ قاضی مشتاق احمد کی کل 5 کتب تحقیقی وتنقیدی مضامین پر شائع ہوچکی ہیں جو اس طرح ہیں 'اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک'، 'اردو نثر ایک مطالعہ'، 'اردو شاعری آج، کل اور ہمیشہ'، 'خاندیش تاریخی، تہذیبی ادبی مطالعہ'، 'پونہ ہے جس کا نام'۔ قاضی مشتاق احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں آپ کی اردو خدمات کا اعتراف ماہنامہ اسباق پونہ، گلہائے خنداں رام پور، گونج نظام آباد، انتساب سرونج اور سہ ماہی رنگ دھنباد وغیرہ نے قاضی مشتاق احمد فن اور شخصیت پر معیاری نمبر شائع کیا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں آپ کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین ملک کے مختلف ومعیاری اخبارات ورسائل میں شائع ہورہے ہیں۔ عمر کی اس دہلیز پر بھی آپ کے قلم کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آپ کا قلم آج بھی جوان ہے، جو صفحۂ قرطاس پر سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ فی الحال آپ پونہ میں مستقل قیام پذیر ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ اردو تحقیق میں ایک الگ مقام بنانے والوں میں ڈاکٹر رشید صہبائی کا نام قابل احترام ہے۔ 1924 میں سید علی کی ولادت مصطفیٰ آباد (چوپڑا) میں ہوئی۔ حکمت وطب اپنانے کے بعد آپ نے دھولیہ مونسپل کمیٹی میں شعبۂ حفظانِ صحت میں ملازمت اختیار کرلی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ نے نثر میں بھی اپنے قلم کو جنبش دی ایک وقت میں آغا حشر کاشمیری پر لکھا گیا آپ کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ کافی مقبول ہوا۔ شعری مجموعہ 'رقصِ صہبا' کے علاوہ اپنے استاد حضرت غریب دھولیوی کے نام سے ایک کتاب 'یادگارِ غریب' تحریر کی، جس میں خاندیش کی ادبی وشعری تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس علاقے کے اولین مشاعروں پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ کتاب نہایت اہمیت رکھتی ہے۔

بغرضِ ملازمت دیگر ریاستوں میں زندگی گزار کر اپنی سرزمین کا نام روشن کرنے والوں میں ڈاکٹر محسن جلگانوی کا نام عزت کا حامل ہے۔ غلام غوث خان کی ولادت مولانا عبدالواحد نقشبندی کے یہاں 15 اکتوبر 1939 کو مصطفیٰ آباد (چوپڑا) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سکندرآباد میں محکمۂ ریل میں ملازمت اختیار کرلی۔ شاعری میں سلطان نقشبندی کو اپنا رہنما بنایا۔ آپ نے شاعری کے ساتھ ساتھ بحیثیت صحافی، نقاد اور محقق دکن میں اپنی پہچان بنائی۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے 'روزنامہ اعتماد' کے آپ نائب مدیر اور اسی اخبار کے ادبی صفحہ 'اوراقِ ادب' کے مدیر بھی رہے۔ محسن جلگانوی نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے 'اردو شاعری میں جدید حسّیت' عنوان کے تحت تحقیقی مقالہ قلمبند کیا۔ جس پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ آپ نے 'اردو ہائیکو میں پیکر تراشی' عنوان کے تحت ایم فل کے لیے بھی مقالہ تحریر کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ نثر میں خصوصاً تحقیق وتنقید کے موضوع پر آپ کی 6 کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ جن میں سکندرآباد کی ادبی دستاویز، تجرباتی مطالعہ اور مصاحبے، اردو ہائیکو میں پیکر تراشی، جدید شاعری کی نمائندہ آوازیں، عصری حسیت تفہیم وتجزیہ اور روشن دان' قابل ذکر ہیں۔ بحیثیت محقق ونقاد اور صحافی آپ نے خاندیش ہی نہیں بلکہ دکن میں بھی اپنی تحریروں کا لوہا منوایا۔ مختلف عنوانات پر

لکھی گئی آپ کی نثری تصانیف اردو ادب میں اضافی اہمیت کی حامل ہے۔خصوصاً آپ کی تصنیف روشن دان کا ذکر یہاں ضرور کرنا چاہوں گا۔اس کتاب میں لگ بھگ 30 ایسے شعرا پر تبصرے اور تجزیے شامل ہیں جو روزنامہ اعتماد کے ادبی صفحے اوراقِ ادب میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں آپ کی بیباک تنقید قارئین کو ادب کی ایک الگ شخصیت سے روشناس کراتی ہے۔ بحیثیت نقاد آپ کی رائے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ایک جگہ دورِ حاضر کے قلمکاروں پر لکھتے ہیں:

’’دنیائے ادب میں دو طرح کے اہل قلم ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے وہ لوگ جو خوامخواہ ہی شب و روز اپنے قلم گھسیٹتے ہیں۔ وہ کیوں لکھتے ہیں؟، کیا لکھتے ہیں؟ اس کا ادراک ہی نہیں۔ مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی بہانے سے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے اور اپنے نام کو ادب سے وابستہ لوگوں کی نظر میں رکھا جائے۔‘‘

’محسن جلگانوی شخصیت اور شاعری‘ عنوان پر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے شاجہاں بیگم کو 2017 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ ادب کا یہ خاموش، ملنسار اور سچا خدمت گار فی الحال حیدرآباد میں رہ کر خاندیش کا نام روشن کر رہا ہے۔

اپنے والد محترم کی تحقیقی روایت کو برقرار رکھنے والوں میں ڈاکٹر افتخار احمد فخر کے فرزندِ جلیل ڈاکٹر شبیر اقبال کا نام تحقیق و تنقید کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے۔ ڈاکٹر شبیر اقبال دھولیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو تعلیم و ادبی ماحول ورثے میں ملا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے ایم اے اردو کی سند حاصل کی بعد ازاں 1989 میں ’مہرلال سونی ضیا فتح آبادی‘ عنوان پر پی ایچ ڈی کے لیے ممبئی یونیورسٹی میں مقالہ پیش کیا۔ جس پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اس سے قبل 1980 میں آپ نے ’منتشر خاکے‘ نام سے ایک اہم تحقیقی کتاب پیش کی، جس میں علاقۂ دھولیہ کی علمی، ادبی، تاریخی اور شعری تاریخ پر قلم اٹھایا گیا۔ اس کتاب میں کل 24 شعرا کا تذکرہ شامل ہے۔ جس میں ان شعرا کی سوانح حیات اور کلام پر اہم معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر شبیر اقبال نے ’شہر دھولیہ کی علمی، ادبی و شعری حیثیت‘ عنوان سے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو بڑا ہی اہم اور تحقیقی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ ڈاکٹر شبیر اقبال کے متعدد تحقیقی مضامین ملک کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی خوب پذیرائی ہوتی رہی ہے۔ فی الحال آپ دھولیہ میں اردو ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

درس و تدریس سے وابستہ رہ کر اردو تحقیق و تنقید پر کام کرنا نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے ہی محققین میں ڈاکٹر سلیم انصاری کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ محمد سلیم انصاری نے محمد عثمان انصاری کے یہاں 4 اپریل 1955 کو پہلی سانس لی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی اے، ایم اے (ہندی، اردو) اور بی ایڈ کی سند حاصل کی اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ آپ نے ’مغربی خاندیش کے اردو شعرا اور ان کی شعری خدمات‘ عنوان پر ڈاکٹر نظام الدین گوریکر کی نگرانی میں ممبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند 1989 میں حاصل کی۔ ڈاکٹر سلیم انصاری ایس ایس وی پی ایس آرٹ اینڈ کامرس کالج دھولیہ کے صدر شعبۂ اردو بھی رہے ساتھ ہی کویتری بینا بائی چودھری نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی جلگاؤں کی فارسی، اسلامک اسٹڈیز اور اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئر مین اور ریسرچ گائیڈ بھی رہے۔ آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے لیے کئی تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم انصاری کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہاراشٹر حکومت نے آپ کو مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکیڈمی کا ممبر بھی نامزد کیا تھا۔ مختلف اخبارات و رسائل میں آپ کے متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ اچھا لکھتے ہیں اور صاف و سلیس زبان میں اپنی بات کہنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم انصاری کی مختلف موضوعات پر تین تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں’ ارمغانِ ماجد، تفرداتِ نعیم، صریر خامہ‘ اول الذکر دونوں کتابیں آپ نے ترتیب دی ہے اور صریر خامہ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جو ادب میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب میں مختلف عنوانات پر 28 مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں علاقۂ خاندیش کے شعرا کے ساتھ اردو ادب کے دیگر شعرا و قلمکاروں کی شاعری اور اردو خدمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ سبکدوش ہونے کے بعد بھی آپ کا قلم پوری روانی کے ساتھ اردو کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔

معین الدین عثمانی کا شمار خاندیش ہی نہیں بلکہ مہاراشٹر کے قابلِ ذکر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ درس و تدریس کے باعزت پیشے سے سبکدوش ہوئے۔ استادِ محترم معین الدین عثمانی نے کچھ عرصہ جامنیر کے اردو اسکول میں بھی تدریسی خدمات انجام دی۔ آپ کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ آپ نے بحیثیت ناقد اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ’ادبی معاصرین کا مطالعہ‘ منظر عام پر آچکا ہے۔ جس میں شامل 38 مضامین میں سے بیشتر مضامین آپ کی ناقدانہ بصیرت کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس مجموعے کو چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا چار تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، دوسرے حصے میں چار مختصر تاثراتی مضامین شامل ہے۔ تیسرا حصہ شخصیات پر مبنی ہے۔ چوتھے حصے میں چار کتابوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں حصے میں وہ دس تبصرے شامل ہیں جو معین الدین عثمانی نے مختلف کتابوں پر کیے ہیں۔ کتاب کے چھٹے حصے میں آپ کے حیدرآباد سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ ان تمام مضامین کے مطالعے سے معین الدین عثمانی کی جو شخصیت ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے وہ ایک افسانہ نگار، مبصر و محقق کی ہی نہیں بلکہ ایک بہترین اور بے باک ناقد کی بھی ہے۔ مشہور ناول و افسانہ نگار نور الحسنین معین الدین عثمانی کی تنقید نگاری پر اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

’’معین الدین عثمانی نے اپنے افسانوی سفر میں بھی کسی خاص رجحان سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا۔ اسی طرح تنقیدی عمل میں بھی وہ کسی مخصوص آئیڈیالوجی کے شکار نہیں ہے۔ جو بات جیسی جس طرح محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار دوٹوک کر دیتے ہیں۔ نا تعلقات سنوارنے کی آرزو اور نہ کشیدہ ہونے کا ڈر۔ یعنی حق بہ حقدار رسید۔‘‘

محمد حسن محمد اسحاق کے فرزند عبدالعزیز انصاری کا دھولیہ کے ادبی حلقوں میں نام نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اردو ادب سے بے پناہ محبت کرنے والے اس فرزندِ دھولیہ کی دو تحقیقی کتابیں ’سوزِ دل (اول)، اور سوزِ دل (دوم) شائع ہو چکی ہیں۔ عبدالعزیز انصاری نے دھولیہ کے مرحوم شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کے نمونۂ کلام کو نہایت عرق ریزی، محنت اور تلاش و جستجو کے بعد جمع کر کے سوزِ دل کی شکل میں جمع کیا۔ سوزِ دل (اول) میں 1888 سے 2001 تک کے مرحوم شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سوزِ دل (دوم) بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے جس میں مرحومین کے علاوہ نئی نسل کے شعرا کا ذکر شامل ہیں۔ عبدالعزیز انصاری کی دونوں کتابیں مغربی خاندیش کی شعری خدمات کے نقطۂ نظر سے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت ہی نہیں رکھتی بلکہ تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ جو اس علاقے کے ادب میں اضافی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو ادب کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا کوئی ڈاکٹر ساجد علی قادری سے سیکھے۔ آپ نے 15 نومبر 1970 کو شہادہ میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے

کے بعد ڈاکٹر ایم اقبال کی نگرانی میں 'اردو کا مذہبی سرمایہ' ایک مطالعہ عنوان پر جلگاؤں یونیورسٹی سے 2009 میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور ایس پی ڈی ایم کالج شیر پور میں لکچرار کے فرائض انجام دینے لگے۔ فی الحال آپ شعبۂ اردو کے صدر اور جلگاؤں یونیورسٹی کی فارسی، اسلامک اسٹڈیز اور اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین اور اردو ریسرچ گائیڈ بھی ہیں۔ آپ کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین ملک کے معیاری اخبار ورسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد کی ادارت میں خاندیش کا پہلا یو.جی سی سے منظورشدہ ادبی رسالہ 'سہ ماہی عالمی ریسرچ جرنل تزئینِ ادب' شائع ہورہا ہے۔ اس رسالے میں ہندوستان ہی نہیں بلکہ مختلف ممالک کے نامور قلمکاروں کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل رہتے ہیں۔ تزئینِ ادب کے کئی نمبر بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں 'علامہ فضل حق خیرآبادی نمبر، ابن صفی نمبر، تحقیق وتنقید نمبر، غزل نمبر، ڈرامہ نمبر، غالب نمبر' کافی مقبول ہوچکے ہیں۔ آپ کی دو ضخیم تصانیف 'آئینۂ شعری ادب'، 'فرہنگِ قلی قطب شاہ' اور 'رسالہ نقوش کا ادبی سفر' منظرِ عام پرآچکی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی تحقیقی وتنقیدی سمیناروں میں شرکت بھی کی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

راقم الحروف کا تعلق بھی علاقۂ خاندیش کے جامنیر شہر سے ہے۔ یکم جنوری 1973 کو ادبی شہر برہان پور میں وارد ہوا۔ والد محترم شیخ محمود صاحب کا تعلق متوسط گھرانے سے رہا۔ ابتدائی تعلیم جامنیر اور ہائی اسکول کی تعلیم بھساول سے حاصل کرنے کے بعد اپنے نانا حاجی وہاب الدین قاضی اور ماموں حمیدالدین قاضی کے یہاں برہان پور آگیا۔ جہاں کے سیوا سدن کالج سے بی اے اور ایم اے میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسی کالج میں بحیثیت لکچرار تدریسی خدمات دینے لگا۔ اس دوران راقم کو استادِ محترم ڈاکٹر محمد شفیع صاحب (صدر شعبۂ اردو فارسی سیوا سدن کالج) کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر شفیع صاحب کا شمار مدھیہ پردیش ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے معروف محققین، شعرا وادبا میں ہوتا رہا ہے۔ آپ کی لگ بھگ 12 تصانیف مختلف عنوانات پر شائع ہوچکی ہیں۔ آپ کی نگرانی میں 15 ریسرچ اسکالر نے پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ہی احقر نے 'خاندیش میں اردو شاعری کی روایت' عنوان کے تحت تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ جس پر دیوی اہلیہ یونیورسٹی، اندور نے 2008 میں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی۔ یہاں بتاتا چلوں کہ راقم کو جامنیر تحصیل کا اردو میں پہلا پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کے انتقال 2009 کے بعد راقم کو شعبۂ اردو فارسی کی ذمے داری سونپی گئی۔ بعد ازاں دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور کے اردو عربی اور فارسی بورڈ آف اسٹڈیز کا چیئرمین اور یونیورسٹی کی کئی اہم کمیٹیوں میں ممبر بھی نامزد کیا گیا۔ 2014 میں ناچیز کو دیوی اہلیہ یونیورسٹی نے اردو کے لیے پی ایچ ڈی کا گائیڈ بھی بنایا۔ مختلف عنوانات کے تحت میری نگرانی میں 10 ریسرچ اسکالرس نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور 6 پر کام جاری ہے۔

خاندیش کے مختلف مقامات پر خصوصاً جلگائوں، بھساول، بیاول، چوپڑا، دھولیہ، جامنیر وغیرہ میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے تعاون سے مختلف موضوعات پر ریاستی و قومی سطح پر تحقیقی سمیناروں کا کامیاب انعقاد بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان سمیناروں میں مہاراشٹر ہی نہیں بلکہ ملک کے دیگر علاقوں کے ادبا و محققین شرکت کرتے ہیں۔

راقم الحروف کے تحقیقی وتنقیدی مضامین ملک کے مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں جن کی تعداد لگ بھگ 60 سے زائد ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے دو مجموعے 'گنجِ سربستہ'، 'شگفتہ تحریریں' اور 'خرمن (جامنیر کا ادبی منظر نامہ)' تین کتابیں منظرعام پرآچکی ہیں۔ لگ بھگ 50 سے زائد تحقیقی سمیناروں میں بحیثیت مقالہ نگار، صدر اجلاس اور ریسورس پرسن شرکت بھی ہوچکی ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے بورڈ آف اسٹڈیز اور دیگر کمیٹیوں میں بحیثیت ممبر خدمات انجام دے رہا ہوں۔ مختلف شہروں کی ادبی سوسائٹیوں اور تنظیموں نے ہی نہیں بلکہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال نے بھی احقر کی تحقیقی وتنقیدی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے گراں قدر 'شعری بھوپالی' ریاستی ایوارڈ سے نوازا ہے۔

احقر کی 'خاندیش میں اردو شاعری کی روایت، ڈاکٹر محمد شفیع ایک مطالعہ، کلامِ جمال انور، اور ہندی میں ہمارے رحیم' زیرطبع تصانیف ہیں۔

مندرجہ بالا محققین اور ناقدین کے علاوہ اس علاقے میں کئی تحقیقی تصانیف اور مضامین کے مجموعے منظر عام پرآچکے ہیں، جن میں قاضی عبدالرحیم دھولیوی کی تاریخِ خاندیش، ایم رفیق بیاولی کا 'تذکرۂ شعرائے خاندیش'، فاروق اعظمی کی 'میری سوانح'، پرنسپل عبدالرؤف شیخ کی 'اجالے اپنی یادوں کے' مشتاق کریمی جلگانوی کا 'بتائے نہ بنے'، ایس ایم انور بیاولی کی 'خاندیش کے اردو لوک گیت'، شیخ یاسین کی 'اردو اور مراٹھی کے باہمی رشتے'، ڈاکٹر شفیق ناظم جلگانوی کی 'تین صدابہار راتیں'، مشرقی خاندیش کے مرحوم فنکاروں کی حیات وخدمات پر منحصر ڈاکٹر عبدالکریم سالار کی 'اردو کے بے لوث سپاہی' ادھومہاجن بسمل کا 'لفظوں کا حصار' شعرائے خاندیش کا انتخاب 'پلک پلک تیشہ'، 'سخن درسخن'، 'سخنورانِ شہر جلگاؤں'، شکیل انصاری کا 'تذکرۂ اولیائے خاندیش' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ساتھ ہی یہاں کے محققین و ناقدین کے تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی معیاری اخبارات و رسائل میں شائع ہوکر دادوتحسین حاصل کرچکے ہیں۔ ایسے ہی فنکاروں میں ڈاکٹر ایم اقبال، ڈاکٹر اقبال شاہ، ڈاکٹر غیاث عثمانی، ڈاکٹر زیدی، ڈاکٹر ساجد علی قادری، ڈاکٹر آفاق انجم، جاوید انصاری، علی انجم رضوی، حاجی انصار احمد وغیرہ شمار کیے جاتے ہیں۔

خاندیش کے مختلف مقامات پر خصوصاً جلگاؤں، بھساول، بیاول، چوپڑا، دھولیہ، جامنیر وغیرہ میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے تعاون سے مختلف موضوعات پر ریاستی وقومی سطح پر تحقیقی سمیناروں کا کامیاب انعقاد بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان سمیناروں میں مہاراشٹر ہی نہیں بلکہ ملک کے دیگر علاقوں کے ادبا و محققین شرکت کرتے ہیں۔

اس طرح پوری ذمے داری سے کہا جاسکتا ہے کہ علاقۂ خاندیش میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے معیاری کام ہوا ہے۔ جتنا بھی کام ہوا وہ ادب میں اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں اس علاقے کے ناقدین و محققین نے دنیائے ادب میں اپنی اور اپنے علاقے کی نہ مٹنے والی پہچان بھی ضرور بنائی ہے۔

■

Dr. S.M. Shakil
HOD. Urdu-Persian, Research Guide
Seva Sadan College, Shanwara.
Burhanpur 450331 (M.P)
Mobile No. 9425086923
drsmshakil1973@gmail.com

قمر الحسن

منٹو کے افسانوں کی سماجی وتہذیبی معنویت

> سعادت حسن منٹو اپنے عہد کے حالات وواقعات سے خوب آگاہ تھے۔ ان کی حساس طبیعت پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے نوع بشر کے احساسات اور جذبات کے ساتھ ان کی اخلاقی اور غیر اخلاقی زندگی کے پہلوؤں پر خاص توجہ دی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو افسانوں میں منتقل کردیا۔ انھوں نے اپنے دور کے ہندوستان کی ابتر صورت حال کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے انھوں نے افسانوی نگارشات میں ابتدا ہی سے سیاسی موضوعات و مسائل کو برتا ہے۔

اردو کے افسانوی وغیر افسانوی ادب کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو کی فن کارانہ شخصیت نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ ان کے موضوعات اور رجحانات میں کافی تنوع ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے اپنی افتادطبع کے لحاظ سے بہت سے رجحانات اور میلانات کو حالات کے مطابق قبول کیا۔ انھوں نے زمانے کی ہوا کے ساتھ بعض رجحانات کی پرورش وپرداخت بھی کی۔ مگر منٹو کے بے باک مزاج نے کسی خاص رجحان کی تقلید گوارا نہیں کی۔ بلکہ اپنی آزاد طبیعت کی وجہ سے انفرادی شناخت قائم کی۔ انھوں نے اسی کے باعث غیر معمولی مقبولیت بھی حاصل کی۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز روزنامہ 'مساوات' کی کالم نگاری سے کیا تھا۔ وہ عہد ترجمہ نگاری کے عروج کا دور تھا۔ تو منٹو نے بھی ترجمہ نگاری کے عمل سے خوب استفادہ کیا۔ انھوں نے فرانسیسی اور روسی ادیبوں کی افسانوی تخلیقات کا ترجمہ کیا۔ وہ روسی افسانوں کے بڑی پابندی سے تراجم کرتے، جو معروف رسالہ 'ہمایوں' میں شائع بھی ہوتے رہے۔ بعد میں 'روسی افسانے' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ افسانوی مجموعہ منٹو کی ترجمہ کاری کے فن پر مہارت کا بین ثبوت ہے۔

یہ بدیہی حقیقت ہے کہ انسان جس ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ منٹو زمانۂ طالب علمی سے غیر ملکی ادیبوں کی تخلیقی اور غیر تخلیقی نگارشات کا مطالعہ کررہے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ باری علیگ کی تحریک پر ترجمہ کاری کی طرف مائل ہوئے۔ بعد ازاں انھوں نے طبع زاد افسانے قلم بند کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی تخلیقات میں مغربی افسانوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اولین افسانوی مجموعہ 'آتش پارے' مغربی ادیبوں کے افسانوں کے تاثرات کی چغلی کھاتا ہے۔ انھوں نے آزادی سے قبل کی افسانوی نگارشات میں، مغربی افسانوں سے موضوعی اعتبار سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ تاہم ان کے منفرد اسلوب نے قارئین کے دل ودماغ پر خاص تاثر قائم کردیا تھا۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں روسی ادیب میکسم گورکی کی کہانیوں کے دبے کچلے مفلوک الحال انسانوں کی طرح، خود ان کے قرب وجوار کی سماجی زندگی کے غریب نادار اور مجبور انسان بھی نظر آتے ہیں۔ یہ انسان اپنے عہد کے تہذیب وتمدن اور اس کی بنیادی ضرورتوں کو بروئے کار لانے والے وسائل سے بھی محروم ہیں۔ منٹو اس سیاق میں

نظریاتی طور پر گورکی کے انتہائی قریب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ابتدائی نگارشات میں اشتراکیت سے لگاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے مضامین کسان مزدور، سرمایہ دار اور زمین دار... وغیرہ اشتراکیت سے ان کی فکری وابستگی کا مظہر ہیں۔

سعادت حسن منٹو اپنے عہد کے حالات وواقعات سے خوب آگاہ تھے۔ ان کی حساس طبیعت پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے نوع بشر کے احساسات اور جذبات کے ساتھ ان کی اخلاقی اور غیر اخلاقی زندگی کے پہلوؤں پر خاص توجہ دی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کو افسانوں میں منتقل کردیا۔ انھوں نے اپنے دور کے ہندوستان کی ابتر صورت حال کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے انھوں نے افسانوی نگارشات میں ابتدا ہی سے سیاسی موضوعات و مسائل کو برتا ہے۔ وہ زمانے کے حقیقی حالات و واقعات کو پیش کرنے میں تذبذب کا شکار نہیں ہوئے۔ بلکہ پریم چند کی حقیقت پسندی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی حالات وکوائف کو افسانوں کے پلاٹ کا حصہ بنادیا۔ منٹو کے سیاسی میلان ورجحان کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کا پہلا افسانہ 'تماشا' اسی موضوع کا عکاس ہے۔ منٹو نے یہ افسانہ جلیا نوالا باغ کے سانحے سے متاثر ہوکر قلم بند کیا تھا۔ جو ان کے اولین افسانوی مجموعہ 'آتش پارے' میں شامل ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے سیاسی حالات وکوائف کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کے اس عہد کی سیاسی فضا انگریزوں سے ٹکراؤ کی تھی۔ وہ سیاسی تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے تقسیم ہند سے قبل بھی بے باکانہ انداز میں لکھا مگر بعد ازاں بڑی شدت سے سیاسی رجحان کے زیر اثر اپنے خیالات کو افسانوں کے قالب میں ڈھالا۔ انھوں نے اپنے عہد کی ناگفتہ بہ صورت حال اور انسان کی ذلت ورسوائی کو اپنے احساسات اور جذبات کا حصہ بنا کر اپنی نگارشات میں محفوظ کردیا۔ ان کے ابتدائی افسانے اسی سیاسی صورت حال کی غمازی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے خونی تھوک، تماشا، نیا قانون، عزت کے لیے، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ وغیرہ قابل غور ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے کمال فن کاری سے سیاست کے روکھے سوکھے واقعات کو بھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کی یہ سچائی اس عہد کی سیاست کا آئینہ بن گئی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے ظلم وجبر، منافرت، بے چینی اور سیاسی گھٹن کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں غم وغصے کی زیریں لہریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ 'آتش پارے' مجموعے کا پہلا افسانہ 'خونی تھوک' فرنگی سامراجی نظام سے شدید نفرت کی عکاسی کرتا ہے، جس میں ایک مفلوک الحال قلی مزدور کے کردار کے ذریعے اس بات پر توجہ مبذول کی ہے کہ وہ مزدور عملی کارکردگی، فرض شناسی سے پہلوتہی نہیں کرتا۔ تاہم وہ اس نظام کی خرابیوں کے باعث انتہائی مفلسی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس طبقے کے عوام کی زندگی کی حیثیت حکمراں جماعت کے

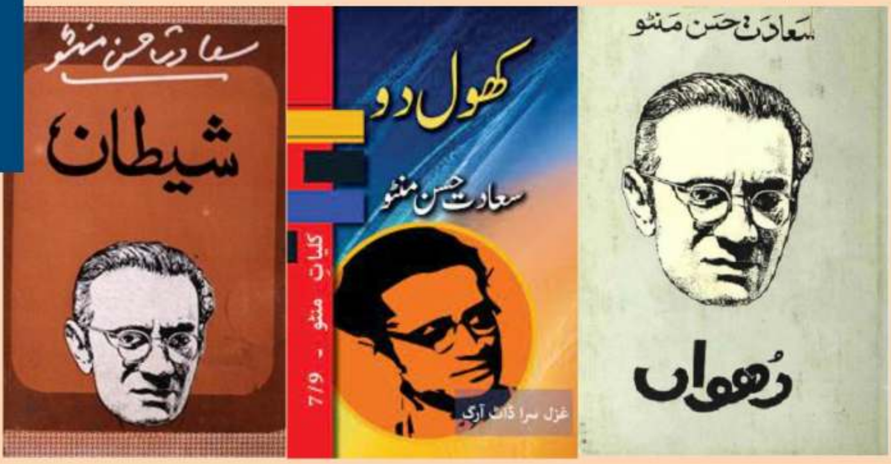

نزدیک کیڑے مکوڑوں کے مترادف ہے۔ وہ اپنے غیظ وغضب کی شدت کے کیتھارسس کے لیے محنت کش طبقے پر ظلم وستم کو روا رکھتے ہیں۔ مظلوم طبقہ تمام پریشانیوں کو بڑی خاموشی سے برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ اس کا عادی بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن کبھی غریبوں کا اپنی ذلت ورسوائی کا پیمانہ چھلک پڑتا ہے۔ تو ان کی اس جرأت کا انجام، ان کو موت سے ہمکنار کردیتا ہے۔ حکمراں طبقہ نہ صرف غریبوں کی تذلیل کرتا ہے بلکہ مذاق بھی اڑاتا ہے۔ منٹو کے اس افسانے میں ایک رئیس، انتہائی تشویشناک حال میں دم توڑتے ہوئے قلی کو دھکیل کر چند روپیوں سے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ ہاں مگر یہ قلی خودداری کے باعث زخمی حالت میں بھی اپنے ضمیر کی طاقت کو مجتمع کرکے اس رئیس پر خونی تھوک پھینک کر اپنی جان خالقِ حقیقی کے حوالے کردیتا ہے۔ مگر عدل وانصاف سے عاری نظام مسافر رئیس کو دو مہینے عدالت میں پیشی کے بعد معمولی رقم کے جرمانے کے بعد بری کردیتا ہے۔ افسانہ نگار نے منصفین عدالت پر کیا خوب طنز کیا ہے:

''مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔ آخر فیصلہ سنا دیا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو معمولی جرمانہ کرنے کے بعد بری کردیا، فیصلے میں یہ لکھا تھا کہ قلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔ فیصلہ سناتے وقت خالد اور مسعود بھی موجود تھے ملزم ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ قانون کا قفل صرف طلائی چابی سے کھل سکتا ہے۔''

(آتش پارے خونی تھوک، اشاعت اولیں، ص 32)

سعادت حسن منٹو کے بعض افسانوں کے مرکزی کردار سیاسی نظام کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' نیا قانون' افسانے کا منگو کوچوان ریاستی مظالم، سیاسی چیرہ دستیوں، اس کے جبر اور تنگ نظری کا پروردہ ہے۔ وہ کافی عرصے تک انگریزی سامراج کے ظلم وجبر کا شکار رہا ہے۔ مگر وہ جیسے ہی موقع پاتا ہے انجام سے عاری اس نظام کے جابرانہ سلوک کے خلاف انتہائی اقدام سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کے اندر سلگتی ہوئی نفرت کی چنگاری شعلے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ وہ مظلوم انسانوں کا نمائندہ بن کر، موقع پاتے ہی ایک انگریز شخص کی جی بھر کر پٹائی کردیتا ہے اور اسے زدوکوب کرکے اپنے نفرت آمیز جذبات کی تسکین کرلیتا ہے۔

سعادت حسن منٹو کے حوالے سے عام تاثر یہ ہے کہ ان کے یہاں جنسی رجحان حاوی ہے۔ ان کے چند افسانے اس کی چغلی ضرور کھاتے ہیں۔ مگر بیشتر افسانوں میں سماجی رجحان کے ساتھ سیاسی رجحان بھی حاوی رہتا ہے، جس کو عام قارئین نظر انداز کرجاتے ہیں۔ برصغیر میں تقسیم ہند کے بعد جو فسادات ہوئے اس میں لاکھوں انسانوں کی موت ہوئی۔ جو اس عہد کی سیاست کی ناکامی تھی۔ فسادات کے تعلق سے بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ہیں۔ مگر منٹو ان سب میں منفرد اور ممتاز افسانہ نگار ہیں، جن کے متعدد افسانے جیسے 'شریفن' ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، رام کھلاون، سہائے، موذیل اور خدا کی قسم... وغیرہ موضوع اور فن کے اعتبار

سے نہایت ہی عمدہ افسانے ہیں۔

فسادات کے حوالے سے سیاسی رجحان کی نمائندگی کرنے والے افسانوں میں انسان کا بہروپی رنگ سامنے آتا ہے۔ وہ کہیں شوہر، کہیں باپ، کبھی محافظ اور کبھی مذہب کا لبادہ پہن کر، مختلف روپ میں ڈھل جاتا ہے۔ منٹو نے ایسے انسانی حیوانوں کی بہیمیت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں انسان کی اخلاقی قدروں کی پامالی دکھائی گئی ہے۔

منٹو نے 'شریفن' افسانے میں انسان کی اخلاقی اور ذہنی پستی کی تصویر پیش کی ہے۔ اس کہانی میں فسادات کے تعلق سے بڑی تشویشناک صورت حال ملتی ہے یہ افسانہ اپنے واقعے کے اعتبار سے سیاسی ماحول کا ترجمان ہے۔ اس افسانے کا کردار قاسم زخمی حالت میں اپنے گھر پہنچتا ہے تو وہ گھر کے اندر اپنی بیوی اور کم سن بیٹی کی برہنہ لاش کو دیکھتا ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر انتقام کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ غیظ و غضب کی حالت میں گھر سے گنڈاسا لے کر نکلتا ہے اور چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ بملا نام کی ایک لڑکی کی آبروریزی کر کے اس کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ مگر قاسم کو بملا کی برہنہ لاش دیکھ کر خود اپنی بیٹی شریفن کی یاد آجاتی ہے۔ تو وہ احساس ندامت کے فطری جذبہ سے مغلوب ہو کر بملا کی لاش پر کمبل ڈال دیتا ہے۔ منٹو کے اس افسانے میں انسانی ظلم و جبر کے وحشیانہ پن کے باوجود انسانیت کے فطری جذبے کی ہلکی سی رمق بھی ہے۔ اس کیفیت کو منٹو کے الفاظ میں دیکھیے:

''جب قاسم نے آنکھیں کھولیں، تو اس کے دونوں ہاتھ لڑکی کی گردن میں دھنسے ہوئے تھے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ انھیں علاحدہ کر کے وہ اٹھا، پسینے میں غرق اس نے ایک نظر اس لڑکی کی طرف دیکھا، تاکہ اس کی اور تشفی ہو سکے۔ ایک گز کے فاصلے پر اس جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی، ننگی... دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ بدن پر گرم گرم پسینہ برف ہو گیا اور اس کی رگوں میں کھولتا ہوا لاوا پتھر کی طرح منجمد ہو گیا۔'' (نمرود کی خدائی ص 14-113)

منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ فسادات کے بعد سیاسی پس منظر میں لکھا گیا بہترین افسانہ ہے جو فسادات کے ظلم و جبر سے قطعی الگ اچھوتے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ جس میں ہندوستان کی تقسیم کے چند سالوں کے بعد قیدیوں بٹوارے اور ان کی منتقلی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقی طور پر دماغی معذور یعنی پاگلوں کے تبادلے کا معاملہ بھی ایک سیاسی نوعیت اختیار کر گیا۔ اس میں دونوں طرف کی حکومتوں کو تبادلے کی تاریخ مقرر کرنی پڑی۔ لاہور کے پاگل خانے کے ایک پاگل بشن سنگھ عرف ٹوبہ ٹیک سنگھ کو بٹوارے کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی آبائی زمین کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ دونوں مملکتوں کے مابین زمین کے اس قطعے پر جان کی بازی ہار جاتا ہے جس کا کوئی نام نہ تھا۔ منٹو نے اس افسانے کے خیال کو ضروری تفصیلات کے ساتھ ایک ایسی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا اہم کردار بشن سنگھ جو قطعی بے ضرر انسان تھا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے کی تاب نہ لاکر جان دے دیتا ہے۔ آخری پیراگراف پر توجہ دیجیے:

'' آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ ادھر ادھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا، اوندھے منھ لیٹا تھا۔ ادھر خار دار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔'' (اردو کے تیرہ افسانے۔ اطہر پرویز ص 10)

سعادت حسن منٹو کے چند افسانوں میں جنسی رجحان کی بازگشت ضرور ہے۔ مگر ان کا مقصد جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ معاشرے میں موجود برائی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو واضح کرنا ہے۔ ان کے یہاں آزادی سے پہلے اور بعد کے افسانوں میں جنسی رجحان میں اعتدال ہے۔ جنونی کیفیت کی شدت نہیں پائی جاتی ہے۔ جنس ایک ابدی حقیقت ہے۔ یہ نوع بشر کا محبوب موضوع بھی ہے۔ اس کا تعلق حیات انسانی کے ساتھ بیشتر ذی روح کے فطری رجحان سے بھی ہے۔ اس کو حیات انسانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کو سماجی بندشوں کے ذریعے روکا نہیں جا سکتا۔ درحقیقت حیات انسانی جنسی جذبے سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتی۔ منٹو نے انسان کی جنسی جبلت کو بغیر حدود و قیود کے اس کے اصلی روپ میں پیش کر دیا۔ مگر اس کے اظہار میں لذتیت اور سستی جنس نگاری سے گریز کیا ہے۔ وہ معاشرے میں پائی جانے والی جنسی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ انھوں نے سماج میں جو برائی دیکھی اور محسوس کی ہے، اس کو اپنے افسانے کے موضوع میں کمال فن سے ڈھال دیا ہے۔ وہ تو ایک سماجی ماہر نفسیات کی طرح معاشرے میں نمو پانے والی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس تعلق سے ان کے چند افسانے، کلمہ، بلاؤز، پھاہا، دھواں اور ہتک وغیرہ قابل توجہ ہیں۔

'کھول دو' منٹو کا اہم مگر متنازع فیہ افسانہ ہے۔ جب اس افسانے کو ''نقوش'' میں شائع کیا گیا تو اس کی چھ ماہ کے لیے اشاعت بند کر دی گئی تھی۔ اس میں منٹو نے کیمپ کے رضا کاروں کے ذریعے ایک نوجوان خاتون کی کئی دن تک کرتے رہنے کے گھناونے واقعے کو بیان کیا ہے۔

اردو کے افسانوی ادب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں جنسی رجحان کا فروغ سماج میں ٹھکرائی گئی عورتوں اور طوائفوں سے ہوا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر بہت لکھا۔ مگر منٹو نے اپنے کمال فن سے اس موضوع میں بھی جدت طرازی اور حقیقت پسندی کو پیش نگاہ رکھا۔ ہاں طرفہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ایک یا دو افسانوں پر اکتفا نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کی استحصال زدہ عورتوں کے بہت سے حالات کو ایک ہی افسانے میں قلم بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس موضوع پر ہتک، کالی شلوار، ممی، جانکی، خوشیا، شانتی وغیرہ بے مثل افسانے اردو ادب کو دیے۔

منٹو نے اپنے کمال فن سے درجن بھر سے زائد افسانوں میں طوائف کی گناہ آلود زندگی کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی بدکردار زندگی کے باوجود، ان سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ منٹو نے ان کے ساتھ مردوں کے غیر انسانی رویے کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسے بدقماش لوگوں سے ان طوائفوں کو آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔

منٹو نے جنسی رجحان سے متعلق بیشتر افسانوں میں مرکزی کردار طوائف کے طبقے سے لیے ہیں۔ ان کے افسانوں سے طوائف اور جنس کی ہولناک صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے معاشرے کے گھناؤنے تلخ حقائق کی نقاب کشائی کی ہے۔ دراصل منٹو کا یہ جنسی رجحان سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی تھا۔

منٹو نے معاصر حالات و واقعات کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ یوں بھی ان کی حساس طبیعت اور شعور انتہائی توانا تھا۔ انھوں نے عصری زندگی کے حقیقی حالات و معاملات کو اپنے افسانوی فن کی بنیاد بنایا۔ ان کے افسانوں کے غائر مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے برصغیر کے سیاسی سماجی اور تہذیبی کوائف سے گہری واقفیت تھی۔ وہ دنیائے ادب کا مطالعہ کرنے کے

باعث اس بات کا گہرا شعور رکھتے تھے کہ کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے سماج سے روگردانی کر کے بڑا ادب تخلیق نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ اپنے ہی سماج کا پروردہ ہوتا ہے وہ اپنے سماج کے حالات وواقعات کے نشیب وفراز اور اس کی تبدیلیوں کا بہتر ترجمان ہوتا ہے۔ منٹو نے ہندوستان کے بٹوارے سے قبل اور بعد کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی اور انسانی قدروں کی شکست وریخت کی اپنی نگارشات میں خاطر خواہ عکاسی کی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے ہندو مسلم معاشرے کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ انھوں نے معاشرتی حالات وکوائف کو بغیر کسی تعصب کے افسانوی فن میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیا۔ ان کے افسانوں میں بعض ہندو کردار مسلم کرداروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کرداروں میں بابو گوپی ناتھ، ایشر سنگھ، ترلوچن، سریتا، سوگندھی، رام کھلاون اور جانکی وغیرہ اردو افسانوں میں زندہ جاوید ہیں۔ منٹو انسانیت میں یقین رکھتے تھے۔ ان کی تخلیقات مذہبی تنگ نظری سے مبرا ہیں انھوں نے افسانوں کے موضوعات اور نفس مضمون میں انسان دوستی اور عظمت ووقار کو مقدم رکھا ہے۔ ان کا یہ خاص امتیاز ہے جو ان کو افسانے کی تاریخ میں سرفرازی اور جاودانی عطا کرتا ہے۔

منٹو نے سماجی ومعاشرتی رجحان کے تحت جو افسانوی تخلیقات پیش کی ہیں، اس میں سماجی زندگی کے مسائل کا زبردست اظہار ملتا ہے جو بیسویں صدی کے درمیانی دور میں تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول اور شہری سماج کا عکس ہے۔ اس دور میں بھی امیر اور ظالم طبقہ اپنے سے کمزور طبقے کا استحصال کرتا تھا۔ منٹو خود بھی کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ان کے مسائل ومعاملات سے خاطر خواہ واقف تھے۔ وہ ہر طرف معاشی بدحالی، ذہنی ونفسیاتی کشمکش، جہالت اور ظلم وجبر دیکھ رہے تھے۔ جس کے باعث بہت سے افراد معاشی وسماجی مجبوریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے غلط کاریوں میں مبتلا ہو رہے تھے۔ منٹو نے اپنے سماج کے ایسے لوگوں کے حالات کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے ان کی بدعنوانی اور بدکرداری کو قریب سے دیکھا اور ان کرداروں کے تحت الشعور میں اتر گئے، تو انھوں نے بابو گوپی ناتھ، ممد بھائی، میرا نام رادھا ہے، سرکنڈوں کے پیچھے وغیرہ کہانیاں قلم بند کیں۔

سعادت حسن منٹو نے اپنی افسانوی تخلیقات میں سماج میں پھیلی برائیوں اور خامیوں کو بغیر مبالغہ آرائی کے پیش کیا ہے انھوں نے حقیقت پسندانہ انداز میں معاشرے کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ اپنے کرتوت اور مکروہ چہروں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ البتہ انھوں نے واعظ اور مصلح بننے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ وہ سماج کی حقیقی تصویر کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ وہ معاشرے کی ابتر صورتِ حال اور اس کے مسائل کے حل کی تلاش نہیں کرتے۔ بس وہ سماج کے افراد کی ترجمانی کرتے ہیں اور لوگوں کو جھنجھوڑتے اور بیدار کرتے ہیں۔ ان کا مقصد سنسنی پھیلانا نہیں ہے بلکہ وہ معاشرے کے بدعنوان افراد کی مکاریوں اور کینہ پروری کو طشت ازبام کرتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو یوں تو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ مگر ان کی زندگی کا زیادہ وقت بمبئی دہلی اور لاہور میں گزرا۔ ان کے افسانوں اور خاکوں کے زیادہ تر کردار بمبئی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ شہر کی معاشرتی زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا، تو انھوں نے وہاں کی سماجی زندگی کے حالات اور واقعات کو بڑی فن کاری سے اپنے افسانوں اور خاکوں میں پیش کر دیا۔ ان کے یہاں سماجی شعور گہرا ہے وہ خاص طور سے انسان دوستی اور دردمندی سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تاریخی اور سماجی شعور کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔ انھوں نے افسانوں میں مجبور عورتوں کی خوبی وخامی ہی نہیں دکھائی ہے بلکہ مردوں کی شرافت ورذالت کی بھی خوب تصویر کشی کی ہے۔

منٹو کا معروف افسانہ 'بابو گوپی ناتھ' سماج کی اسی کیفیت کا عکاس ہے جس میں مردوں کے دجل وفریب کے ساتھ خلوص ومحبت اور رواداری دکھائی دیتی ہے۔ افسانے کی ہیروئن 'زینت' جو بابو گوپی ناتھ کی داشتہ ہے وہ اخلاق باختہ ضرور ہے مگر وہ فطری طور پر سادہ لوح، ملنسار اور ناتجربہ کار بھولی بھالی لڑکی ہے۔ ہاں بابو گوپی ناتھ مجرب شخص ہے جس کی لاہور کی تقریباً تمام طوائفوں سے شناسائی رہی ہے۔ اس کو مزاروں اور کوٹھوں پر صرف مکروفریب ہی دکھائی دیا۔ وہ اس مکروفریب کا اس قدر عادی ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی باقی حیات کو مزاروں پر گزارنے کا خواہشمند ہے۔ کیونکہ وہ کنگالی کی حالت میں کوٹھوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس حالت پر پہنچانے والے اس کے مطلبی دوست عبدالرحیم سینڈو، غلام علی، سردار بیگم اور غفار سائیں پیش پیش ہیں جو اس کی دولت کو حیلوں بہانوں سے لوٹتے رہے۔ بابو گوپی ناتھ کو ان کی فریب کاریوں اور اپنی بربادی کا خوب احساس تھا۔ تاہم اس نے چشم پوشی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ وہ جان بوجھ کر قطعی انجان بنا رہا۔ وہ خود فریبی کا شکار ہوتا رہا۔ مگر اس نے دوسروں کی دل آزاری اور دھوکہ دینا گوارا نہ کیا۔ بابو گوپی ناتھ اپنی داشتہ 'زینت' کو اس کی خوبیوں کے باعث چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں وہ اس کی معصوم حرکتوں اور بھولے پن سے گہری محبت وعقیدت رکھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ میری دولت ختم ہونے سے پہلے زینت اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے۔ وہ اس کو طوائفوں جیسی چالاکی اور عیاری کے گر سکھانے کے لیے لاہور کی مشہور طوائف سردار بیگم کو بھی بلواتا ہے۔ اس نے 'زینت' کو ایکٹریس بنانے کی خاطر بمبئی کے بہت سے جعلی ڈائریکٹروں کی دعوتیں بھی کیں۔ مگر وہ اپنی نادانی اور بیوقوفی کے باعث محمد شفیق طوسی، محمد یاسین، عبدالرحیم سینڈو اور سردار بیگم جیسے عیار ومکار انسانوں کا کھلونا بنتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ اپنی عزت وناموس کے احساس بھی عاری ہوگئی۔ مگر بابو گوپی ناتھ اس کو اس گندے ماحول سے نکالنے کی تدبیریں کرتا ہے۔ جب کہ اس کے دیگر مصاحبین زینت کو اسی گندے ماحول میں زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ زینت کی شادی جب حیدرآباد کے دولت مند زمیندار سے طے ہوجاتی ہے تو بابو گوپی ناتھ بے حد خوش ہوتا ہے۔ وہ اس کی شادی کے تمام اخراجات اور انتظامات ایک باپ کی مانند خود کرتا ہے۔ حتیٰ کہ مہمانوں کی ضیافت کے بعد ان کے ہاتھ خود بابو گوپی ناتھ دھلواتا ہے۔

اس افسانے میں منٹو نے اپنے سماج کو اس طرف توجہ دلانے کی مستحسن سعی کی ہے کہ گناہ آلود معاشرے میں بھی روشنی اور نیکی کی جوت جلائی جاسکتی ہے۔ بابو گوپی ناتھ جیسا انسان غلیظ معاشرے میں بھی خیر اور نیکی کی علامت بن کر سامنے آسکتا ہے۔

منٹو نے سماجی رجحان کے تحت جتنے بھی افسانے لکھے ہیں ان میں معاشرے کے ہی اچھے برے کردار ظالم ومظلوم، امیر غریب، آجر واجیر وغیرہ اپنے جملہ خصائص کے ساتھ موجود ہیں۔ منٹو نے اپنے معاصر دور کی سماجی زندگی کو اس کے حقائق کے ساتھ پیش کرنے کی خوب سعی کی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں جو سماجی، سیاسی اور جنسی رجحان کی نمائندگی ملتی ہے، ان میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ بلا شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ منٹو کے یہاں یہ تینوں یا ان کے علاوہ دیگر رجحانات میں حقیقت نگاری کے اثرات حاوی ہیں۔

■

Dr. Qamar-ul-Hasan
Dept of Urdu, Satyawati College
Delhi University
Ashok Vihar, New Delhi
Delhi- 110052

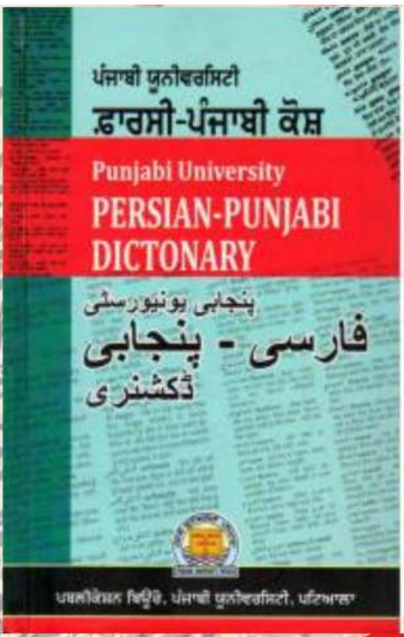

طارق حسین

پنجابی زبان پر فارسی کے اثرات

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہند و ایرانی تعلقات کوتقویت ملی۔ مسلم بادشاہ وسلاطین نے ہندوستانی زبان وادب، فلسفہ و مذہب، علم نجوم، ہیئت، طب، تہذیب اور ہندوستانی معاشرے میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ بادشاہوں کے علاوہ امرائے سلطنت اور اعیان حکومت نے بھی یہاں رہتے ہوئے جس تہذیب کواپنایا وہ خالص ترکی، افغانی یا ایرانی تہذیب نہیں تھی بلکہ اس میں مقامی عناصر بھی آہستہ آہستہ شامل ہوتے گئے۔

برصغیر ہندو پاک کے ہر علاقے پر فارسی زبان نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مگر پنجاب پر اس کے اثرات دیگر علاقوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ کچھ محققین کا یہ بھی ماننا ہے کہ اس علاقے کا نام پنجاب (پنج آب) بھی فارسی زبان کا ہی لفظ ہے۔ اس خطے کو صوبے کی حیثیت سے 'پنجاب' کا نام شیر شاہ سوری (1540-45) کے عہد حکومت میں حاصل ہوئی اور اکبر (1556-1605) کے دور حکومت میں پنجاب کا نام کثرت سے استعمال ہونے لگا۔ ابوالفضل کی جامع تصنیف 'آئین اکبری' میں پنجاب کو دو صوبوں میں منقسم بتایا گیا ہے۔ اور ان دو صوبوں کا متحدہ نام 'پنجاب' تھا۔ 'آئین اکبری' کی جلد دوم میں ایک فصل کا عنوان ملتا ہے:

"نهضت موکب اقبال شاهنشاهی از حدود پنجاب بدارالخلافه آگره ظل اقبال بدهلی انداختند۔"

(اقبال شہنشاہی حدود پنجاب سے دارالخلافہ آگرہ و دہلی میں جلوہ گر ہوا۔)

ہندوستان کے دیگر علاقوں کی نسبت پنجاب سے فارسی زبان و ادب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے دیگر حصوں کی علاقائی زبانوں پر فارسی زبان کے اثرات مرتب ہوئے اسی طرح پنجابی زبان و ادب پر بھی اس نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کے حملے کے بعد پنجاب کا علاقہ غزنوی حکومت میں شامل ہو گیا۔ جس کے باعث بہت بڑی تعداد میں ترک اور ایرانی صوفی، شاعر اور ادیب خطہ پنجاب میں منتقل ہو گئے اور لاہور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ فارسی چونکہ فاتحوں کی زبان تھی اور اس کے برعکس اس خطے میں رہنے والے پنجابی زبان بولتے تھے۔ جب ان دو تہذیبوں کے لوگوں کو ایک ساتھ رہنے کا موقع ملا تو یہ ایک دوسرے کی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ بعض نے شوق سے نئی زبان کو سیکھا، کیونکہ ہر نئی چیز میں لذت ہوتی ہے۔ زبانوں کے اس تال میل کی بدولت آہستہ آہستہ فارسی کے کچھ الفاظ اور محاورات پنجابی میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ فارسی الفاظ نے آہستہ آہستہ ہندی زبان میں بھی سنسکرت اور پراکرت الفاظ کی جگہ لینی شروع کر دی جو کہ بعد میں مستقل صورت اختیار کر گئی۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ زبانوں کے اس میل ملاپ سے ایک نئی زبان معرض وجود میں آئی جس کو آج ہم 'اردو' زبان کے نام سے جانتے ہیں۔

دو تہذیبوں کے اس سنگم سے فارسی زبان کے الفاظ کثرت سے پنجابی زبان میں داخل ہوتے گئے۔ پنجاب شاعروں، ادیبوں، فن کاروں، صوفیوں اور دانشوروں کا اہم مرکز رہا ہے اور اس کے علاوہ مسلمان فاتحین کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ سے بہت سارے مسلمان صوفی بزرگوں نے بھی اس خطے کا رخ کیا جنھوں نے پنجابی زبان میں بے مثال منظوم تحریریں رقم کی ہیں۔ ان صوفی شعرا میں دو قسم کے گروہ تھے پہلا گروہ ان صوفیائے کرام کا ہے جن کا کام تھا اور دوسرے گروہ میں وہ بزرگان دین شامل تھے جنھوں نے دینی مسائل کو فلسفیانہ رنگ میں جانچا اور مذہب کے ظاہری عقائد کے برعکس باطنی عقائد کی تعلیم پر زیادہ زور دیا اور شریعت کے مقابلے میں طریقت کو ترجیح دی ان کا یہ نظریہ تھا کہ مذہب دراصل خدا اور انسان کے درمیان ایک روحانی رشتے کا نام ہے اور یہ رشتہ دنیا کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں پنجابی زبان کو صوفیانہ خیالات، عقائد اور روحانی تجربوں کو بیان کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس کی ابتدا شیخ ابراہیم فرید ثانی سے ہوئی جو حضرت فرید گنج شکرؒ کے عزیز اور اسی سلسلے کے جانشین بھی تھے۔ فرید ثانی کے بعد سلطان باہو، بابا بلھے شاہ، علی حیدر اور ہاشم جیسی شخصیتوں نے اس تحریک کو چلایا اور اپنی شاعری سے پنجابی شاعری کی صوفیانہ

روایات کو مضبوط کہا۔ یہ صوفی شاعر اس دنیا کو اپنے خالق حقیقی کی ذات کا مظہر سمجھتے تھے۔ یہ وحدت الوجود کا فلسفہ در اصل فارسی شاعری سے ہی پنجابی میں داخل ہوا، اور ہندوؤں کے ویدانت فلسفے نے بھی اس کو قوت بخشی۔

فارسی کے پنجابی پر اثرات

فارسی زبان جب اس خطے پنجاب میں داخل ہوئی تو فارسی کے الفاظ پنجابی زبان میں اس طرح شامل ہو گئے کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ ان لفظوں میں اکثر تو ایسے ہیں کہ ان کی شکل وصورت اور معنی دونوں اصلی حالت میں قائم ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کی صورتیں بدل چکی ہیں لیکن ان کے معنی میں فرق نہیں آیا۔ مثال کے طور پر چند الفاظ: ''قول، اقرار، رنج، خوشی، زندگی، موت، صبح، شام، زمین، آسمان'' وغیرہ یہ سب الفاظ اپنی صورت اور معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور ان کے بولنے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ الفاظ عام بول چال کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی استعمال ہونے لگے۔ پنجاب کے مختلف علاقوں میں پنجابی بولی میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے مگر فارسی کے الفاظ ہر جگہ مشترک نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وارث شاہ کی 'ہیر' جو کہ پنجاب کا ایک بلند ادبی شاہکار ہے۔ مثال کے طور پر 'ہیر' کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

ہیر آکھیا عشق دے راہ پوناں نہیں کم ملوانا قاضیاں دا
ایس عشق میدان دیاں کُٹھیاں نوں درجہ ملے شہیداں تے نمازیاں دا
ترت وچ درگاہ قبول ہونا سجدہ عاشقاں پاک نمازیاں دا
راہ حق دے جان قربان کرنی ایہہ کم نہیں جھوٹھیاں پازیاں دا
کر کے قول زبان جھیں ہار جانا کم بے ایماناں دھوکے بازیاں دا
عشق سر ہے ذات خدائی داوے عاشق شان ویکھن کارسازیاں دا
رانجھا نال ایمان قبولیا میں قصہ ختم کر دور درازیاں دا
رانجھا چھڈ کے انگ نہ لاں کھیڑا ہوندا گدھے نوں حق نہ تازیاں دا
جدوں کدوں کرداترس عاشقاں تے مالک رب غریب نوازے دا
وارث شاہ حقیقی دی لین لذت پہلاں چکھ کے لون مجازیاں دا

''ہیر بولی عشق کے راستے پر قدم رکھ لیا، تو پھر عاشق اور معشوق کو ملوانا قاضیوں کا کام نہیں۔

عشق کے میدان میں جو پوری طرح اتر گیا اس کو شہیدوں اور نمازیوں کے برابر کا درجہ ملتا ہے۔

پاک نمازیوں کی طرح بہت جلدی اس کی بارگاہ میں عاشق کا سجدہ قبول ہو جاتا ہے۔

جھوٹے لوگوں کا کام راہ حق میں جان قربان کرنا نہیں ہے۔

ایک بار قول واقرار کر کے مکر جانا دھوکے باز اور بے ایمانوں کا کام ہے۔

عشق ذات خدائی کا سر ہے عاشق اس کی کارسازیوں کی شان دیکھتے ہیں۔

اپنے ایمان کے ساتھ میں نے رانجھے کو قبول کر لیا اور دور درازیوں کا قصہ اب ختم کر دے۔

رانجھا اب چھوڑ کر مت جا گدھے کو تازیوں (جو مسلسل دوڑتے ہیں) کا حق نہیں ہے۔

جب کبھی عاشقوں پر ترس کرتا ہے اس غریب نواز کا رب (خدا)

وارث شاہ! حقیقی عشق کی لذت لیتے ہیں پہلے عشق مجازی کے نمک کا ذائقہ چکھ کر۔

(یہاں ہیر قاضی سے گفتگو کر رہی ہے۔)

ان اشعار میں فارسی کے الفاظ بڑی طراوت کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔

عشق، راہ، درجہ، شہید، غازی، نمازی، کارساز، تازی وغیرہ، یہ تمام الفاظ اپنے محل کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی معنوں میں ان اشعار میں شامل ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی بیشمار الفاظ ہیں جو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ مستعمل ہیں اور ان میں بعض تبدیلیاں صرف تلفظ کی ہیں مثلاً۔ سادہ کی جگہ سادی۔ طرح کی جگہ طراں۔ ان کے علاوہ بعض اتنے بدلے ہیں کہ آج ان کو پہچاننا بھی مشکل ہے۔

خواجہ غلام فرید جو کہ پنجابی کے بلند پایہ صوفی شاعر تھے۔ ان کے کلام میں بھی فارسی کے کثیر الفاظ شامل ہیں۔

ان کا دیوان کافیوں پر مشتمل ہے۔ دیوان فرید سے ایک کافی نقل پیش ہے۔ اس میں بھی فارسی الفاظ کثرت سے شامل ہیں۔

نازک ناز نگاہ سجن دے
عشوے غمزے من موہن دے
لگڑے کاری تیر وو
سے سینے پل پل چبھدے چھل
سسّی شودی پیر پیادی
ناں تیڑ تاڈے جھوک آبادی
مٹھڑی بے تقصیر وو
نا خرچ پلے نہ گنڈھ سمل
ماہی باجوں سوُل قہر دے
ڈیہاں رات فرید ہجر دے
نیناں نیر و ہیر وو
جھر، جنگل، بیلے چھلو چھل

''میرے محبوب کے ناز (نخرے) بھی نازک ہیں اس کے اشارے، ادائیں دل کو بہلانے والی ہیں۔

بہت تیز تیر لگے اور وہ میرے سینے میں ہر پل (وقت) چُب رہے ہیں۔

سسی بیچاری بے آسرا ہے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کے پاس کوئی آبادی ہے۔

یہ بغیر کسی گناہ کے مٹ چکی ہے (اسکا کوئی قصور نہیں ہے) نہ اس کے پاس کوئی خرچ ہے اور نہ ہی کچھ سامان (زادراہ)

محبوب کے بغیر بے پناہ دکھ ہیں دن رات اس ہجر کے دکھ ہیں۔

آنکھوں میں تیز آنسو ہیں جن سے میدان اور جنگل بھر چکے ہیں۔''

اس کافی میں نازک، ناز، نگاہ، عشوہ، غمزہ، تیر، سینہ، پیادہ، آبادی، تقصیر، فارسی کے الفاظ ہیں ان الفاظ کو لوگ آسانی سے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ پنجابی میں شعر و شاعری کے علاوہ فارسی لفظوں کی ترکیب بھی ہے جو پنجابی کے انداز میں ظاہر ہوتی ہے اور یہاں پر فارسی کا اثر بہت واضح اور نمایاں ہے۔

پنجابی قصے فارسی زبان میں

جس طرح فارسی زبان کے الفاظ پنجابی میں داخل ہوئے وہیں اسی طرح فارسی زبان کے شعرا اور نثر نگاروں نے پنجابی قصے کہانیوں کو فارسی زبان میں داخل کیا۔ ان قصوں کو زیادہ تر شاعروں نے مثنوی کی شکل میں مختلف عناوین سے فارسی زبان میں شامل کیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ شاعری نثر کے مقابلے عوام میں زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ ان قصوں میں مشہور ترین قصے درج ذیل ہیں۔

سسی پنوں، مرزا وصاحبہ، مثنوی ہیر رانجھا، سوہنی و مہیوال وغیرہ۔

ان سب قصوں میں 'ہیر رانجھا' کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ قصہ 'ہیر رانجھا' کا فارسی میں سب سے قدیم قلمی نسخہ 'فسانہ دلپذیر' ہے جو کہ سعید سعیدی نے نظم کیا ہے۔ 'فسانہ دلپذیر' کے متن کی ابتدا میں سعیدی نے اپنے بارے میں بھی لکھا ہے اور اس کے ساتھ شاہجہاں بادشاہ کی مدح بھی لکھی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے یہ قصہ شاہجہاں کے دور حکومت میں نظم کیا ہو گا۔ مدح کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

یا رب که همیشه باد خرم — و ز گردش زمانه بیغم
او شاه جهانست شاه باده — عالم همه در پناه باده
بر مسند دین بلطف داور — شاهنشه ما ابوالمظفر
صاحب صاحبقران ثانی — خوش بر سر تخت کامرانی

''اے میرے رب وہ ہمیشہ خوش وخرم رہے اور

گردش زمانہ سے بےغم رہے۔

وہ جہاں کا بادشاہ ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے اس کی پناہ میں پوری دنیا ہے۔

وہ مسند دین پر خدا کی مہربانی سے جلوہ گر ہے ہمارا وہ بادشاہ ابوالمظفر ہے۔

وہ دوست رکھتا ہے دوسرے صاحبقران (یہ لقب ان حکمرانوں کو دیا جاتا تھا جن کی مدت حکومت تیس سال سے زیادہ ہو) لوگوں کو جو کامیابی کے تخت پر جلوہ نشین ہے۔

قصے کی ابتدا میں شاعر اس قصے کے ہیرو 'دھیدو' عرف رانجھا کا تعارف ان اشعار سے کراتا ہے۔

افسانہ عشق را زبان نیست　　این گفت شنود رابیان نیست
حرفی شنو از دیار دھیدو　　بشنو ھمہ کار و بار دھیدو
از خوبی آن جون چہ گویم　　محبوبی از جوان چہ گویم
مشھور زمانہ نام است　　در دھر خانہ رانجہ نام است
دیدم پدرش مقدم دھر　　مشھور جھان معلم دھر

"عشق کے افسانے کی کوئی زبان نہیں ہوتی ہے، اس گفتگو کا کوئی بیان نہیں ہے۔

دھیدو کے گھر سے اس کا قصہ سنو، اور اس کی زندگی کے تمام کاروبار سنو!

اس جان کی خوبی میں کیا بیان کروں، اس محبوب کی جوانی کے بارے میں کیا بیان کروں۔

اس کا نام پورے زمانے میں مشہور ہے، زمانے میں وہ رانجہ کے نام سے مشہور ہے۔

میں نے اس کے باپ کو زمانے میں آگے دیکھا، دنیا بھر میں معلم کی حیثیت سے مشہور ہے۔

ہیر رانجھا قصہ پنجاب میں ہر شخص جانتا ہے اور یہ قصہ نظم اور نثر میں کئی بار لکھا جا چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی ہجری میں پنجاب میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً اس قصے کو بہت ہردلعزیزی حاصل تھی۔ سجان رائے 'خلاصہ التوریخ' میں لکھتا ہے:

"اھل پنجاب... درمحبت وآشفتگی این ھردو (رانجھا وھیر) نقشھای بدیعہ واشعار عجیبہ بستہ سرود ونغمہ دلفریب میکند"

(پنجاب کے رہنے والے لوگ... ان دونوں کی محبت اور آشفتگی (رانجھا اور ہیر) میں کلام بدیعہ اور عجیب اشعار دلفریب نغمے گاتے تھے)۔

پنجابی رسم الخط پر فارسی رسم الخط کے اثرات

سنسکرت اور پنجابی سمیت اس خطے کی تمام پرانی زبانیں جن میں ایرانی زبان فارسی بھی شامل ہے یہاں کی

عہد وسطی میں فارسی زبان ثقافتی اعتبار سے عروج پر تھی۔ اس عہد کو فارسی زبان و ادب کا عہد زرین کہا جاتاہے۔فا رسی چونکہ سرکاری زبان تھی۔ اور تمام سرکاری کام اسی زبان میں انجام پاتے تھے، اس لیے اس کا اثر براہِ راست یہاں کی دیگر زبانوں پر پڑا، اور اس خطے کی بیشتر زبانیں اسی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں، جس کے اثرات آج بھی ہم پنجاب سے متصل علاقوں میں دیکھتے ہیں، مثلًا کشمیری، پہاڑی، گوجری، پوٹھواری وغیرہ۔

(ہندآریائی) انڈویورپی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب عربوں نے ایران کو فتح کیا تو اس سے پہلے ایران کی سرکاری زبان قدیم فارسی تھی جو کہ اس کے اپنے پہلوی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ عربوں نے ایران میں عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا لیکن کچھ عرصے تک فارسی کا قدیم رسم الخط زندہ رہا مگر آہستہ آہستہ یہ رسم الخط ختم ہوگیا۔ تقریباً نویں صدی عیسویں میں فارسی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگی جو کہ موجودہ فارسی کا رسم الخط ہے۔ اس کے بعد جب یہی فارسی زبان ہندوستان میں داخل ہوئی تو یہ یہاں کی سرکاری زبان بن گئی تو اس کا رسم الخط بھی یہاں پر رائج ہو گیا اور پھر یہ رسم الخط سنسکرت اور دیگر مقامی زبانوں سے زیادہ معتبر ٹھہرا۔

بابا فرید اور گرونانک کے زمانے میں جب کچھ لوگوں نے ان بزرگوں کا اعلیٰ کلام لکھ کر محفوظ کرنے کا سوچا تو ظاہر ہے کہ اس وقت پنجابی کا اپنا کوئی معتبر رسم الخط نہ ہونے کی بنا پر اس کلام کو اسی رسم الخط میں لکھنے کا فیصلہ کیا جو اس وقت اس علاقے میں رائج تھا۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی جو کہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی لہٰذا یہ پنجابی کلام بھی فارسی رسم الخط میں ہی لکھے گئے۔

پنجابی زبان کو دسویں صدی عیسویں کے ایک مورّخ مسعودی نے 'ملتانی' زبان کہا ہے۔ البیرونی نے اس کو 'الہندیہ' اور 'لہوری' کہا ہے۔ اس کے علاوہ مسعود سعد سلمان نے اپنے دیوان میں اس کو 'ہندوی' لکھا ہے۔

سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو نے جب 'گرو گرنتھ صاحب' تالیف کی تو یہ کتاب 'گرمکھی' رسم الخط میں لکھی گئی۔ یہ رسم الخط 'سنسکرت' رسم الخط سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے یہ رسم الخط سکھوں میں زیادہ مقبول ہوگیا۔ دوسری طرف مسلم صوفیا اور شعرا کا بہت سارا کلام فارسی رسم الخط میں تھا۔ یہ کلام بھی اس خطے میں بسنے والے سبھی لوگوں میں بہت مقبول تھا۔

تقسیم ہند کے وقت پنجاب بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔ مشرقی پنجاب جو کہ ہندوستان میں شامل ہوا یہاں پر سکھ مذہب کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے یہاں پر دفتری زبان 'پنجابی' کو تسلیم کرلیا گیا۔ جو کہ 'گرمکھی' رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ اس کے برعکس پاکستان کی سرکاری زبان اردو تھی۔ وہاں پنجابی کو سرکاری زبان کا درجہ نصیب نہ ہوسکا۔ اس لیے پنجابی زبان، فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی۔ جو بعد میں 'شاہ مکھی' رسم الخط کہلایا۔ تقسیم ہند کے وقت جہاں ایک طرف پنجاب دو حصوں میں بٹ گیا وہاں پنجابی زبان کا رسم الخط بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

المختصر یہ کہ عہد وسطی میں فارسی زبان ثقافتی اعتبار سے عروج پر تھی۔ اس عہد کو فارسی زبان و ادب کا عہد زرین کہا جاتا ہے۔ فارسی چونکہ سرکاری زبان تھی۔ اور تمام سرکاری کام اسی زبان میں انجام پاتے تھے، اس لیے اس کا اثر براہِ راست یہاں کی دیگر زبانوں پر پڑا، اور اس خطے کی بیشتر زبانیں اسی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں، جس کے اثرات آج بھی ہم پنجاب سے متصل علاقوں میں دیکھتے ہیں، مثلاً کشمیری، پہاڑی، گوجری، پوٹھواری وغیرہ۔

کتابیات

1 فخر زمان، پنجاب، پنجابی اور پنجابیت، لاہور 2003
2 عارف نوشاہی، پنجاب میں فارسی ادب، لاہور
3 ڈاکٹر کے ایس بیدی ایم اے، تین ہندوستانی زبانیں، دہلی
4 حمیداللہ شاہ ہاشمی، پنجابی زبان وادب، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی 1988
5 خالد پرویز ملک، پنجاب کے عظیم صوفی شعرا، علم وعرفان پبلشر، لاہور 2001
6 محمد سرور، پنجابی ادب، اداری مطبوعات پاکستان، کراچی
7 وڈی ہیر وارث شاہ، جواہر سنگھ کرپال سنگھ، امرتسر
8 دیوان فرید، قیس فریدی، خانپور، 1992
9 دکتر محمد باقر، پنجابی قصے فارسی زبان میں، لاہور 1908

■

Tarique Husain
Research Scholar, Dept of Persian
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202201 (UP)
Mob.:8492959143

انیسویں صدی میں ہندوستان کا تعلیمی نظام

عمر رضا

اٹھارہویں صدی کے اخیر میں جس نوع کے تعلیمی نظام کو فروغ دیا جانے لگا تھا، اس نے انیسویں صدی میں ایک توانا شکل اختیار کرلی تھی۔ اتنی توانا کہ اسے ہندستان میں جدید تعلیم کے آغاز کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جس میں 'حکومتِ برطانیہ' نے ہندستان میں موجود 'ایسٹ انڈیا کمپنی' پر براہ راست نظر رکھنے کے لیے 'ریگولیٹنگ ایکٹ 1773 ' پاس کیا۔[1] وارن ہسٹنگز (Warren Hastings:1732-1818) کو ہندستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کیا اور کمپنی کے بعض اختیارات 'برطانوی عہدیداران/حکمران' کے ہاتھوں منتقل کرنا شروع کردیا تھا۔ اس حوالے سے ولیم پٹ دی ینگر (William Pitt the Younger:1759-1806) کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے 1783 میں برطانیہ کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا اور 1784 میں ایک ایسا قانون[2] پاس کیا جس کے تحت ایک 'بورڈ آف کنٹرول' کا قیام عمل میں آیا۔ اسی بورڈ کے ذریعے حکومت برطانیہ نے کمپنی کے 'دیوانی'، 'فوجی' اور 'مالی' معاملات پر پورا اختیار حاصل کرلیا تھا۔ یہی نہیں اب 'گورنر جنرل' ہندستان کا حقیقی حکمراں بن گیا تھا جو 'برطانوی پارلیمنٹ' کے تحت کام کرتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا کام چونکہ تجارت کرنا تھا اور اس معاملے میں اب بھی اس کی اجارہ داری قائم تھی، اس لیے کمپنی نے ہندستان کے تعلیمی اور کسی قدر سیاسی معاملات و مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ البتہ برطانوی عہدیداران اس میں خصوصی دلچسپی لینے لگے تھے۔ کیونکہ اب انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ ہندستان پر وہ اپنی حکومت قائم کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قیام کے لیے وہ نت نئے پروگرام تشکیل دینے لگے تھے۔ انھی میں ایک اہم پروگرام ہندستان کے عوام کو 'انگریزی/عیسائی' رنگ میں رنگنا بھی تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہندستانی عوام کو عیسائی بنانے کی قواعد شروع کردی تھی۔ اس حوالے سے اس زمانے کے دو برطانوی عہدیداران 'چارلس گرانٹ' اور 'ولیم ولبرفورس' کا ذکر ناگزیر ہے۔

چارلس گرانٹ (Charles Grant: 1746-1823) کی آمدِ ہندستان 1767 میں ایک ملٹری عہدیدار کے طور پر ہوئی، لیکن بہت جلد اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی امور کی ذمے داری سونپ دی گئی تھی۔ ابتدا میں اسے بنگال کی تجارت کا Superintendent بنایا گیا تھا۔ گرانٹ چونکہ اس زمانے میں سرگرم عیسائیوں کے ایک مذہبی، اخلاقی اور سیاسی جماعت Clapham Sect سے متاثر تھا، اس لیے بہت جلد اُس نے عیسائی مشنری کی تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے ہندستان کے زیادہ تر باشندوں کو عیسائی بنانا، اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 1787 میں گورنر جنرل کارن والس (Charles Cornwallis:1738-1805) نے گرانٹ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی بورڈ کا رکن مقرر کردیا تھا۔ 1790 میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر وہ برطانیہ واپس چلا گیا جہاں اس کی

ملاقات ولیم ولبرفورس سے ہوئی۔

ولیم ولبرفورس (William Wilberforce: 1759-1833) ایک برطانوی سیاست داں اور غلاموں کی تجارت کوختم کرنے کی تحریک کا رہنما تھا۔ اس نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز 1780 میں کیا اوراپنے آبائی شہر یورکشائر (Yorkshire) کے لیے ایک آزاد رکن پارلیمنٹ (MP) منتخب ہواتھا۔ 1785 میں مسیحی بن کر وہ Clapham Sect کاروح رواں بن گیاتھا۔ولیم ولبرفورس کی ملاقات نے گرانٹ کی مذہبیت پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ اس نے 1792 میں Observations on the State of Society Among the Asiatic Subjects to Great Britain, Particularly with Respect to Morals, and on the Means of Improving it کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس میں گرانٹ نے بےحد پُر جوش انداز میں ہندستان کوتبلیغ کے ذریعے عیسائی بنانے کی تجویز پیش کی۔[3] بقول مالک رام:

”...ان [چارلس گرانٹ] کا خیال یہ تھا کہ اس مقصد میں کامیابی کی پہلی منزل یہ ہے کہ یہاں انگریزی کا عام رواج ہو۔جونہی لوگ انگریزی پڑھنے لگیں گے،وہ لامحالہ عیسائیت کا بھی مطالعہ کریں گے اوراس کے بعد وہ آسانی سے اسے قبول کرلیں گے۔اس لیے انھوں نے انگریزی کی ترویج پر خاص زوردیا اوراس کے لیے دو تجویزیں پیش کیں:اول، ہندستان میں کمپنی کی حکومت کا سارا کاروبارانگریزی زبان میں ہونا چاہیے۔دوم، ہندستانی مدارس میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کردیا جائے۔

اس مضمون میں انھوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ ہمیں کام کی وسعت سے گھبرانا نہیں چاہیے۔خود ہندستانی باشندے انگریزی پڑھنے کے بہت مشتاق ہیں۔اگر ایک مرتبہ ہم نے انگریزی پڑھانا شروع کردی تو کوئی دن جاتا ہے کہ خود ہندستانی اس میں اتنی مہارت اورلیاقت حاصل کرلیں گے کہ وہ ہماری مدد کے بغیر اپنے ہم وطنوں کو یہ زبان پڑھانے کے قابل ہوجائیں گے۔“[4]

1793 میں برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے کمپنی کا مشرقی ممالک سے تجارتی اجارہ داری کا قانون چارٹر ایکٹ[5] پیش کیا گیا تو برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن کی حیثیت سے ولیم ولبرفورس نے ایک قرارداد پیش کی جو گرانٹ کے کتابچے پر مبنی تھی۔اس میں اس نے کہا کہ ’قانون میں یہ لکھاجائے کہ کمپنی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ وقتاً فوقتاً ولایت سے ایسے تجربہ کار اور اہل علم لوگوں کو ہندستان بھیجتی رہے، جومدرس اورمشنری کے فرائض سرانجام دے سکیں۔‘[6] ولیم ولبرفورس کی اس تجویز پر کمپنی کے ڈائرکٹر بھڑک اٹھے اوراس کی پرزورمخالفت کی۔نتیجتاً ولیم ولبرفورس کی قرارداد اس وقت تورد ہوگئی تھی لیکن عیسائی مبلغین کو اس سے تقویت ضرورملی۔ 1797 میں گرانٹ کے کتابچے کی اشاعت کے بعد تو اس خیال کومزید فروغ ملنا شروع ہوگیا تھا اور برطانیہ کے بیشتر عہدیداران کی یہ رائے ہوگئی تھی کہ عیسائی مبلغین کو ہندستان جانے کی کھلی آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ تبلیغ کے ذریعے ہندستانیوں کو عیسائی بناسکیں۔اس کے ساتھ ہی برطانوی عہدیداروں کی ایک جماعت انگریز ملازمین کو ہندستانی زبان وتہذیب سے بھی آشنا کرنا چاہتی تھی تاکہ یہاں کے انتظام وانصرام کو وہ بخوبی نبھاسکیں۔اس حوالے سے گورنر جنرل ویلزلی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ریچرڈ کولے ویلزلی (Richard Colley Wellesley: 1760-1842) نے 1798 میں گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور وہ اس عہدے پر 1805 تک برقراررہا۔اسی کی رہنمائی میں چوتھی اور آخری اینگلو-میسور جنگ 1799 میں لڑی گئی۔یہی وہ جنگ ہے جس میں 4 مئی 1799 کوشیر میسور ٹیپو سلطان (Sultan Fateh Ali Sahab Tipu:1750-1799) کوشہید کردیا گیا تھا۔اسی سال ویلزلی نے Censorship of Press Act, 1799 نافذ کیا جس کی رو سے کسی بھی اخبار میں خبریں شائع کرنے سے پہلے حکومت کی اجازت لینی پڑتی تھی۔علاوہ ازیں اس نے کمپنی کے ڈائرکٹرز کے سامنے ایک ایسے کالج کا منصوبہ پیش کیا جس میں انگریز سول ملازمین کو ہندستان کی زبان وثقافت اورعدالتی نظام سے روشناس کرایا جاسکے۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی تعلیم کا باربرداشت نہیں کرنا چاہتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ لندن میں موجود بورڈ آف ڈائرکٹر نے قیامِ کالج کی پرزور مخالفت کی، کیونکہ ان کے خیال میں اس کام کے لیے انگلینڈ میں تعلیم کا نظام موجود تھا جہاں سے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ہندستان بھیجا جاتا تھا۔اس کے باوجود ویلزلی نے انگریز سول ملازمین کو ہندستان کی زبان وثقافت اورعدالتی نظام سے روشناس کرانے، نیز ان کی تربیت کے لیے سنۂ 1800 میں کلکتہ کے ’فورٹ ولیم‘ میں ایک کالج قائم کردیا۔ اسی میں ’ہندستانی‘ کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جس کی سربراہی جان گل کرسٹ (John Borthwick Gilchrist: 1759-1841) کو دی گئی۔گل کرسٹ نے انگریز سول ملازمین کی تدریس کے لیے اگرچہ مختلف زبانوں کی کتابوں کواردو میں منتقل کروایا،لیکن اس کے ساتھ ہی بعض کتابوں کو ناگری میں شائع کرکے ایک زبان کو دو زبان میں تبدیل کرنے کی بنیاد بھی ڈالی جس کا بنیادی مقصد یہاں کی دو بڑی اقوام کے درمیان نفرت اورتفرقہ کا ماحول پیدا کرکے ہندستان پر اپنی حکمرانی کو مستحکم کرنا تھا۔[7]

برطانوی سول ملازمین کے لیے ہندستانی زبان و ثقافت اور یہاں کے افکاروعلوم سے آگاہی کوضروری قرار دے کرفورٹ ولیم کالج میں ویلزلی نے جس طرح سے ’ہندستانی‘ کا شعبہ قائم کیا اوراس کے تحت مختلف النوع علوم وفنون اورتہذیبوں کوترجموں کی مدد سے متعارف کرانا شروع کیا، کچھ اسی طرح کا خیال برطانوی حکمرانوں کو 1803 میں جنرل لیک[8] کی قیادت میں دہلی اور آگرہ وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد آیا۔

تعلیمی معاملات و مسائل اور خصوصاً عیسائیت کی تبلیغ کو کمپنی شروع ہی سے اپنے لیے مضر ثابت کرتی رہی، کیونکہ اسے اس بات کا بخوبی تجربہ تھا کہ ہندستانیوں کو عیسائی مذہب کی تعلیم دینااورعیسائی بنانا،انھیں بغاوت پر آمادہ کرنا ہے۔لیکن برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے سابقہ قانون کی تجدید کے لیے Charter Act of 1813 پیش کیا گیا تو تمام تر کمپنی کی مخالفت کے باجوداس میں عیسائی پادریوں کو ہندستان آنے اور یہاں تبلیغ کرنے کی

برطانوی سول ملازمین کے لیے ہندستانی زبان و ثقافت اور یہاں کے افکار و علوم سے آگاهی کو ضروری قرار دے کر فورٹ ولیم کالج میں ویلزلی نے جس طرح سے 'هندستانی' کا شعبہ قائم کیا اور اس کے تحت مختلف النوع علوم و فنون اور تهذیبوں کو ترجموں کی مدد سے متعارف کرانا شروع کیا،کچھ اسی طرح کا خیال برطانوی حکمرانوں کو 1803 میں جنرل لیک[8] کی قیادت میں دهلی اور آگرہ وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعدآیا۔

اجازت دے دی گئی تھی۔ نیز گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا تھا کہ وہ علم وادب کی ترقی، ہندستانی علما کی حوصلہ افزائی اور علم وسائنس کو ہندستان کے برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں رائج کرنے کے لیے کم از کم ایک لاکھ روپے سالانہ کی رقم خرچ کرے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ 1814 میں London Missionary Society نے رابرٹ مے (Robert May: 1752-1814) کی نگرانی میں مغربی بنگال کے چنسورہ (Hugli- Chuchura/ Hooghly- Chinsurah) میں 36 ابتدائی اسکول قائم کیے۔ 1817 میں Calcutta School Book Society اور 1818 میں Calcutta School Society جیسے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔

کلکتہ اسکول بک سوسائٹی جسے کلکتہ بک سوسائٹی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کا مقصد ہندستان میں تعلیم کے مغربی طریقوں کو فروغ دینا، نصابی کتب اور لغات کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوسائٹی نے نئے پرائمری اسکولوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی اور نئے اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر اداروں کے لیے نصابی کتابیں شائع کیں۔

کلکتہ اسکول بک سوسائٹی جسے کلکتہ بک سوسائٹی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کا مقصد ہندستان میں تعلیم کے مغربی طریقوں کو فروغ دینا، نصابی کتب اور لغات کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوسائٹی نے نئے پرائمری اسکولوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی اور نئے اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر اداروں کے لیے نصابی کتابیں شائع کیں۔

کلکتہ اسکول سوسائٹی ایک آزاد تعلیمی ادارہ تھا جس کا مقصد مختلف اسکولوں میں یکساں تدریسی طریقۂ کار کو متعارف کروانا، پاٹھ شالہ یا روایتی اسکولوں کی تعمیر نو اور ترقی، اور نئے اسکولوں کی تعمیر کرنا تھا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں جان ہربرٹ ہیرنگٹن (John Herbert Harington: 1765-1828) نے اپنے صدارتی خطبے میں ہنر مند مقامی اساتذہ اور مترجمین کی ضرورت پر زور دیا تھا تاکہ یورپی علوم کو ترجمے کی مدد سے ہندستان میں پھیلایا جاسکے۔

کمپنی چونکہ تعلیمی اور تبلیغی معاملات سے خود کو دور رکھتی تھی، اس لیے مذکورہ بالا تعلیمی سرگرمیاں محدود اور کسی قدر سست روی کا شکار رہیں لیکن 1813 میں تجدید قانون کے تقریباً دس سال بعد 17 جولائی 1823 کو گورنر جنرل ولیم ایمہرسٹ (William Pitt Amherst: 1773-1857) نے ایک قرارداد کے ذریعے ایک مرکزی ادارہ General Committee of Public Instruction قائم کر کے اس کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔ ہندستان کے مختلف مقامات پر اس کمیٹی کی متعدد شاخیں قائم کی گئیں۔ یکم جنوری 1824 کو کلکتہ میں سنسکرت کالج کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی میں انگریزی وضع کا ایک مشرقی کالج کھولنے کی تجویز پیش کی گئی۔ مسٹر جے ایچ ٹیلر (J. H. Taylor) کو، جو اس وقت دلّی کمیٹی کا سکریٹری تھا، دہلی کا تعلیمی جائزہ لینے اور قیام کالج کے لیے کسی معقول اور مناسب جگہ کا انتخاب کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنی تحقیقات جنوری 1824 میں حکومت کو سونپ دی۔ اپنی اس رپورٹ میں مسٹر ٹیلر نے دہلی کے 'مدرسہ غازی الدین'[9] کی بوسیدہ عمارت اور اس میں ہونے والی تعلیمی صورت حال کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔

حکومت نے مسٹر ٹیلر کی تحقیقات/ روداد اپنی سفارشات کے ساتھ ولایت بھیجی۔ وہاں سے 'مدرسہ غازی الدین' کو کالج میں تبدیل کرنے کا حکم نامہ آ گیا جس کی رو سے 1825 میں اسے کالج میں تبدیل کر کے مسٹر جے ایچ ٹیلر کو اس کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا تھا۔ کالج میں پہلے تو عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن بہت جلد سنسکرت کا ایک شعبہ قائم کر دیا گیا تھا اور 1828 میں انگریزی اور مغربی علوم وفنون کی تعلیم کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ کالج کے قیام کا بنیادی مقصد تو ہندستانیوں کو براہ راست انگریزی میں مغربی علوم وفنون کی تعلیم سے بہرہ مند کرنا تھا، لیکن ابھی یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کالج میں زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد انتہائی قلیل تھی جبکہ جدید مغربی علوم وفنون کو اردو زبان کے ذریعے پڑھنے والے طلبا کی تعداد بہت زیادہ تھی جس کے پیش نظر بہت سی مغربی کتابوں کا دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اسکول بک سوسائٹی (School Book Society) کے زیر اہتمام بہت سی مفید کتابیں دیسی زبان میں تیار کی گئیں۔ نصاب کی کتابیں چونکہ اردو میں نہیں ملتی تھیں، اس لیے ان کی تصنیف وتالیف اور ترجمے پر خاصی رقم صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ ایسی صورت میں بقول مالک رام:

''حکومت کے متعدد اعلیٰ افسروں کی نظر میں یہ سب باتیں گویا کالج کے بنیادی مقصد (انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کی ترویج) کے منافی تھیں۔ مشرقی علوم کے یہ مخالف اس صورت حال پر پیچ وتاب کھاتے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ سب کچھ ختم کر دیا جائے۔''[10]

اس مسئلے کو لے کر کمپنی کا سرکاری حلقہ اور خود General Committee of Public Instruction کا مرکز (کلکتہ) دو گروہوں 'مشرقی' اور 'مغربی' میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ مشرقی گروہ جس کی رہنمائی مسٹر پرنسپ (Henry Thoby Prinsep: 1793-1878) کر رہے تھے، کا کہنا تھا کہ ہندستانیوں کو انگریزی زبان سے چونکہ نفرت ہے، اس لیے مغربی علوم وفنون کی تعلیم کے لیے ان پر انگریزی زبان کو لازمی قرار دینا، ہمارے اپنے 'مقصد' سے ہمیں دور کر سکتا ہے۔ یہاں 'مقصد' سے مراد ظاہر ہے ہندستان کو محکوم بنانا تھا۔

اپریل 1834 میں ولیم بنٹنک (William Henry Cavendish Bentinck:1774- 1839) کمپنی کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اسی سال میکالے (Thomas Babington Macaulay:1800-1859) گورنر جنرل کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے ہندستان وارد ہوا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے فارسی کی جگہ انگریزی کو دفتری زبان بنانے کی سفارش کی۔ اس حوالے سے اس نے فروری 1835 میں ایک تجویز بعنوان Minute/ Memorandum on Indian Education پیش کی جس میں اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ:

''کسی بھی اچھے یورپی کتب خانے کی ایک الماری کے ایک خانے کی کتابیں ہندستان اور جزیرۃ العرب کے سارے علم وادب پر بھاری ہیں۔''

''بیمار آدمی کو دوا اس کی صحت کے لیے دی جاتی ہے، نہ کہ اس کے ذائقے اور لذت کی تسکین کے لیے۔ اگر انگریزی ان کے لیے مفید ہے تو ہمیں یہ انھیں پڑھانا چاہیے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے عادی ہو جائیں گے اور اسے پسند کرنے لگیں گے۔''

''عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت فوراً بند کر دی جائے۔ کلکتے کا مدرسۂ عالیہ اور سنسکرت کالج بند کر دیے جائیں۔''

''ہمیں ہندستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا ہے جس کے چہرے کا رنگ اور رگوں میں خون تو بیشک ہندستانی رہے گا لیکن وہ اپنے مذاق اور عقیدے اور اخلاق وذہنیت کے لحاظ سے انگریز ہوگا۔''[11]

میکالے کی اس 'یادداشت' نے مغربی گروہ کے حوصلے بلند کردیے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مشرقی گروہ کی تمام تر مخالفتوں کے باوجود ولیم بنٹنگ نے میکالے کی سفارشات کے پیش نظر English Education Act 1835 کو منظوری دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی کو عدالت اور دفتر کی زبان بنادیا گیا۔ ریاضیات (Mathematics)، سائنس (Science)، فلسفہ (Philosophy)، تاریخ (History) اور اخلاقیات (Moral Values) وغیرہ کی تعلیم اب انگریزی میں دی جانے لگی تھی۔ دیسی زبانوں کے درجے ختم کیے جانے لگے تھے۔اس سے بچی ہوئی رقم انگریزی کے طلبا پر خرچ ہونے لگی تھی۔نتیجتاً وظیفے بند ہوگئے تھے جس سے نادار طلبا کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے لگا تھا اور عوام میں بے اطمینانی وشکوک وشبہات پیدا ہونے لگے تھے۔

1836 میں آک لینڈ (George Eden Auckland: 1784-1849) گورنر جنرل مقرر ہوکر ہندستان آیا۔اس نے 1835 کے قانون پر نظر ثانی کر کے 1839 میں ایک نئی قرارداد کو منظوری دی جس میں اگرچہ مشرقی زبانوں میں مغربی علوم کی تعلیم کا راستہ صاف کیا لیکن اس کے ساتھ ہی آک لینڈ نے یہ شق بھی لگادی کہ:

''یورپی علوم کا سنسکرت اور عربی میں پڑھا جانا بے کار ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جو طالب علم یورپی ادب اور فلسفہ اور سائنس پڑھنا چاہیں، انھیں یہ مضامین انگریزی ہی میں پڑھائیں۔ مزید کوشش اس کی ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم رعایا کے صرف اعلیٰ طبقوں ہی کو دی جائے کیونکہ اس طبقہ کے پاس اسے حاصل کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور وقت بھی۔''[12]

آک لینڈ کے ذریعے منظور شدہ اس قرارداد کے پیش نظر مغربی علوم وفنون کی کتابوں کو مشرقی زبانوں میں منتقل کرنے کا کام کسی حد تک ٹھپ پڑ گیا تھا جس سے طلبا کی تعلیم پر برا اثر پڑنے لگا تھا۔ کالج کا عارضی پرنسپل مسٹر جے ایچ ٹیلر بے حد مصروف رہا کرتا تھا اور کالج کے کاموں کے لیے زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔ البتہ 1841 میں فرانسیسی نژاد فلکس بوتروس (Félix Boutros: 1806-1864) دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہوا، جو دیسی زبان میں تعلیم دینے کا حامی تھا،تو اس کے ذریعے اس کام کو ضرور رفتار ملنے لگی تھی۔ یہی وہ شخص ہے جس نے 1843 میں 'انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنۂ ملکی' (Society for the Promotion of knowledge in India through the medium of Vernacular Languages) قائم کی جس کا بنیادی مقصد تدریسی مقاصد کے لیے جدید سائنسی علوم کی کتابوں کو دیسی زبان میں منتقل کروانا تھا۔ اس کے تحت اردو زبان میں پہلی بار باضابطہ سائنسی کتابوں، اعلی درجے کی انگریزی، سنسکرت، عربی اور فارسی کتابوں کو نہ صرف یہ کہ اردو میں منتقل کیا گیا بلکہ ان کی طباعت بھی ہونے لگی تھی۔

یہ وہ زمانہ ہے جس میں گھریلو صنعت زوال کا شکار ہوچکی تھی اور ہندستانی عوام کے لیے روزگار کا واحد ذریعہ کمپنی کی ملازمت ہوا کرتی تھی۔ 'انگریزی تعلیم' کی اہمیت کے باوجود اُن ہندستانیوں کو، جو انگریزی سے نابلد تھے، ملازمت مل جایا کرتی تھی، لیکن 1844 میں ہینری ہارڈنگ (Henry Hardinge, 1st Viscount Hardinge: 1785-1856) نے ہندستان کے گورنر جنرل کے طور پر یہ اعلان کرکے کہ 'انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو ہی ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت مل سکتی ہے،' 'انگریزی تعلیم' کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

دلّی کالج میں پیشہ ورانہ اور مغربی علوم وفنون کی تعلیم اردو میں تو دی جارہی تھی لیکن مذکورہ بالا تعلیمی اصلاحات کے سبب عوام کا رجحان اب انگریزی کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جس میں ہندستان کا معاشرہ ایک خاص نوع کی کشمکش سے دوچار ہوگیا تھا۔ عوام کو روزگار کی ضرورت تھی اور انگریزی سے دور بھی رہنا چاہتے تھے، کیونکہ اس کی تعلیم سے انھیں عیسائی ہوجانے کا خطرہ ستاتا تھا۔ نتیجتاً ہندستانیوں اور برطانوی عہدیداروں کے درمیان شکوک وشبہات کی ایک عجیب وغریب فضا قائم ہوگئی تھی جسے اس زمانے کے بعض برطانوی عہدیداران نے دور بھی کرنے کی کوشش کی۔ انہی میں ایک نام جرمن نژاد ڈاکٹر اسپرنگر (Aloys Sprenger: 1813-1893) کا ہے جس نے 1845 میں فلکس بوتروس کی سبکدوشی کے بعد کالج کی کمان سنبھالی۔

اسپرنگر عربی زبان وادب کا عالم تھا۔ کم سنی ہی میں اسے مشرقی اور اسلامی علوم سے خاص انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ مشرق اور مغرب کے مابین موجود بغض وعناد اور دوری کو وہ کم کرنا چاہتا تھا۔ دلّی کالج کا پرنسپل بننے کے بعد اس کی یہ خواہش یقیناً پوری ہوئی۔ شہر کے علما اور فضلا سے اس نے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ اسی سال اس نے 'فوائد الناظرین' جیسا رسالہ جاری کیا جس کے مدیر ماسٹر رام چندر (Ramchundra: 1821-1880) تھے۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے مسٹر بوتروس کے جاری کردہ ترجمہ وتالیف کے کام کو مزید وسعت دی۔ اسی کے زیر اہتمام اقلیدس (Euclid,)، اصول قانون (Principles of Law)، اصول حکومت (Principles of Government)، اصول قوانین مال گزاری (Principles and rules of wealth management)، الجبرا (Algebra)، عملی علم ہندسہ (Practical Geometry)، تاریخ اسلام (History of Islam)، تاریخ یونان (History of Greece)، تاریخ روما (History of Rome)، کیمسٹری (Chemistry)، اٹلس (Geography)، انتخاب شعرائے اردو، ترجمۂ گلستاں، لیلاوتی، رامائن، مہابھارت، دیوان سودا، دیوان درد، نیچرل فلاسفی (Natural Philosophy)، سیاسی معیشت (Political Economy) اور فلسفہ (Philosophy) جیسی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ سرسید نے اس زمانے میں اپنی کتاب 'آثار الصنادید' ڈاکٹر اسپرنگر کی ہی فرمائش اور تحریک پر مرتب کی تھی۔

1847 کے اخیر میں ڈاکٹر اسپرنگر کو اودھ کے شاہی کتب خانوں میں موجود فارسی، عربی اور اردو کی قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست تیار کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ ایسی صورت میں مسٹر جے ایچ ٹیلر نے عارضی پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ اگرچہ 1850 میں ڈاکٹر اسپرنگر دلّی واپس آگیا تھا لیکن چند ہی مہینوں بعد کمپنی نے اسے مدرسۂ عالیہ کا پرنسپل مقرر کرکے کلکتہ بلالیا تھا اور اس کی جگہ جان/ جیمس کارگل (Jhon/James Cargill) کو دلّی کالج کا پرنسپل مقرر کردیا تھا۔

جان/جیمس کارگل کو پرنسپل مقرر ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ کالج کے بعض طلبا نے، جو اَب مدرس ہوچکے تھے یا شہر میں کوئی اور کام کررہے تھے، ہندو مذہب ترک کرکے عیسائیت قبول کرلی تھی۔ عوام تو انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کی تعلیم کو شروع ہی سے شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اس عمل نے ان کے شکوک وشبہات کو حقیقت میں بدل دیا تھا۔ نتیجتاً طلبہ کی تعداد گھٹنے لگی تھی۔ یہ سلسلہ تقریباً تین برس تک قائم رہا۔ 1854 میں حالات معمول پر آئے۔ یہی وہ سال ہے جس میں جان/ جیمس کارگل نے کالج سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ ایسی صورت میں مسٹر جے ایچ ٹیلر کو عارضی پرنسپل بنادیا گیا تھا۔

کمپنی کے سابقہ چارٹر پر ازسرنو غور کرکے The

Charter Act of 1853 نافذ کیا جا چکا تھا اور ایک وسیع تعلیمی پالیسی کی بھی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس زمانے میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کا ماننا تھا کہ ہندستان میں تعلیم کو فروغ دینا، کمپنی کے لیے سودمند ہے۔ اس کے ایک سال بعد یعنی 1854 میں چارلس ووڈ (Charles Wood, 1st Viscount:1800-1885) کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کا صدر منتخب ہوا اور 19 جولائی 1854 کو اس نے ہندستان میں تعلیم سے متعلق ایک اعلانیہ جسے Wood's Dispatch کے نام سے جانا جاتا ہے، اس وقت کے گورنر جنرل ڈلہوزی (James Andrew Broun Ramsay, 1st Marquess of Dalhousie: 1812- 1860) کو روانہ کیا۔ اس میں چارلس ووڈ نے ہندستان کے اندر انگریزی زبان کے استعمال میں ایک بڑی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ اس نے سفارش کی کہ پرائمری اسکول مقامی زبانیں اپنائیں، ہائی اسکول اینگلو ورنیکولر زبان کو اپنائیں اور کالجوں میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ سچی بات یہ ہے کہ چارلس ووڈ کی سفارشات جسے ہندستان میں انگریزی تعلیم کا "Magna Carta" قرار دیا جاتا ہے، نے ہندستان میں انگریزی زبان کے رواج کو مزید مستحکم کیا۔ اس کا بھی مقصد ہندستانیوں کا ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جسے کمپنی کی انتظامیہ کے لیے افرادی قوت کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔[13]

چارلس ووڈ کی مذکورہ بالا سفارشات پر عمل درآمد ہو ہی رہا تھا کہ 1857 کی بغاوت ہو گئی۔ گیارہ مئی اٹھارہ سو ستاون کو جب باغیوں نے دلّی کو گھیر لیا تو دلی کالج بھی ان کی زد میں آیا۔ باغیوں نے دلی کالج کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ بعض مورخین کے مطابق اسی بغاوت میں 12 مئی 1857 کو دلی کالج کے عارضی پرنسپل مسٹر جے ایچ ٹیلر کو باغیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔[14]

1857 میں دلی کالج بند ہوا تو تقریباً سات سال بعد 1864 میں اسے از سر نو کھولا گیا۔ شروع کے چار مہینے تک اس کا انتظام ایک پروفیسر مسٹر ہیٹن (Hatton) نے دیکھا۔ بعد ازاں مسٹر ایڈمنڈ ولمٹ (Edmand Wilmot: 1809- 1869) انگلستان سے آیا اور پرنسپل کی حیثیت سے اس کے کام کاج کو از سر نو سنبھالا۔ کسی غیر متوقع ضرورت کے سبب وہ 1868 میں کالج سے سبکدوش ہو گیا تو اس کی جگہ سی. کے. کک (C. K. Cook) کو دلّی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا تھا۔

دلّی کالج میں تعلیم کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن اب اس میں وہ کشش یا رمق باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ کیونکہ اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے تھا اور یہ یونیورسٹی ابھی امتحان لینے کی مجاز نہیں تھی۔ اس لیے لامحالہ طلبا کو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق امتحانات دینے پڑتے تھے۔ ایسی صورت میں یہاں کا سارا کاروبار انگریزی میں ہونے لگا تھا۔

دلّی کالج میں تعلیم کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن اب اس میں وہ کشش یا رمق باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ کیونکہ اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے تھا اور یہ یونیورسٹی ابھی امتحان لینے کی مجاز نہیں تھی۔ اس لیے لامحالہ طلبا کو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق امتحانات دینے پڑتے تھے۔ ایسی صورت میں یہاں کا سارا کاروبار انگریزی میں ہونے لگا تھا۔

انقلاب اٹھارہ سو ستاون کے بعد لاہور ایک ایسا مرکز بن کر ضرور ابھر رہا تھا جہاں برطانوی حکومت کے زیر اہتمام میجر فلر (Major Abraham Richard Fuller: 1828-1867) نے گورنمنٹ بک ڈپو اور کالج قائم کر کے انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کروانا شروع کر دیا تھا۔ 1864 میں قائم شدہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے پرنسپل کے طور پر پروفیسر لائٹنر (Gottlieb Wilhelm Leitner: 1840-1899) مشرقی اور مغربی علوم کو بذریعۂ اردو فروغ دے رہے تھے۔ لائٹنر چاہتے تھے کہ ان کا کالج ہر طرح کے معیار پر کھرا اترے، چنانچہ ان کی نگاہ دلی کالج پر ٹکی اور انھوں نے کچھ ایسا کیا کہ 1877 میں حکومت پنجاب نے دلی کالج کو بند کرنے اور وہاں کے تمام طلبا و اساتذہ کو لاہور کالج میں ضم ہونے کا حکم نامہ جاری کر دیا تھا۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات یوں تو 1773 کے بعد سے ہی محدود کیے جانے لگے تھے، لیکن 1857 کی بغاوت کے نتیجے میں اس نے اپنے باقی ماندہ انتظامی اختیارات بھی کھو دیے تھے۔ اب چونکہ ہندستان پر برطانیہ کا براہ راست کنٹرول ہو گیا تھا۔ اس لیے ہندستانیوں کے تمام تر معاملات و مسائل کا از سر نو جائزہ لیا جانے لگا تھا۔ تعلیمی صورت حال کے بھی از سر نو جائزے کی بات کہی جانے لگی تھی، کیونکہ 1854 میں پیش کردہ چارلس ووڈ کی سفارشات پر توقع کے مطابق عمل نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس کے نفوذ اور دیگر اصلاحات کے لیے General Council of Education in India کا قیام عمل میں آیا۔ 1880 میں لارڈ رپن (George Frederick Samuel Robinson, 1st Marquess of Ripon:1827-1909) کی تقرری ہندستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل کے طور پر ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے 'جنرل کونسل آف ایجوکیشن ان انڈیا' کی درخواست پر ہندستان کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے 3 اپریل 1882 کو Indian Education Commission کی تشکیل کی۔ اس نے اس کمیشن کی سربراہی سر ولیم ہنٹر (Sir William Wilson Hunter:1840-1900) کو سونپی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ہنٹر کمیشن (Hunter Commission) کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ کمیشن نے اگرچہ پرائمری اور ثانوی جماعتوں میں دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر برقرار رکھا، لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو اپنانے کی بات کہی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کمیشن کا مقصد بھی ہندستان میں ایسے تعلیمی نظام کو فروغ دینا تھا جس سے ہندستانیوں کی ایسی جماعت وجود میں آ جائے جو سرکاری ملازمت کے خواہاں ہوں اور ملازمت اختیار کرتے ہی برطانوی نوآبادیات کا حصہ بن کر اس کے خلاف احتجاج و مزاحمت کی قوت کو کھو دیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے اخیر میں جس نوع کے تعلیمی نظام کو قائم کیا جانے لگا تھا، اس نے انیسویں صدی میں ایک مضبوط اور مستحکم ادارے

کی شکل اختیار کر لی تھی۔اس حوالے سے'فورٹ ولیم کالج' اور'دلی کالج' کے علاوہ انیسویں صدی کے اخیر تک نافذ کی گئی تمام تر تعلیمی اصلاحات و سفارشات کا ذکر کیا جاسکتا ہے،جس کے تحت اگرچہ دیسی/اردو زبان میں تعلیم دینے کی بات کہی گئی،لیکن انگریزی کو ہی ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے ان تعلیمی اداروں اور دیگر اصلاحات و سفارشات کا بنیادی مقصد سنسکرت، عربی، فارسی اور کسی قدر علاقائی/ دیسی/ اردو ہندی کے تئیں ہندستانیوں کے دل میں بیزاری پیدا کرنا اور ہندستانیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو رنگ و نسل سے تو ہندستانی لیکن فکر اور کلچر کے اعتبار سے انگریز ہوتے۔اس کے اثرات نہ صرف یہ کہ اس زمانے کے ہندستانی عوام[15] پر مرتب ہوئے بلکہ آج بھی اس کے بعض اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔یہاں کے عوام کا مغربی علوم و افکار اور انگریزی زبان کا شیدائی ہونا اور اسی میں انھیں اپنے ملک وقوم کی ترقی کا نظر آنا،اسی کا نتیجہ ہے۔

حوالے اور حواشی:

1 سنۂ 1600 میں'برطانوی ایسٹ انڈیا' کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ اسی سال اسے ہندستان سے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔چنانچہ اگست 1608 میں کیپٹن ولیم ہاکنز (Captain William Hawkins:1516-1613) نے اپنے جہاز ہیکٹر (Hector) کو سورت (گجرات) کی بندرگاہ پر لنگر انداز کر کے ہندستان میں کمپنی کی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔جلد ہی ہاکنز کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ یہاں تجارت کے لیے مغل بادشاہ کی اجازت لینی ضروری ہے،اس لیے وہ مغل دارالحکومت آگرہ پہنچا،لیکن تجارت کے لیے نورالدین محمد سلیم عرف جہانگیر(1569-1627) کی رضا مندی حاصل کرنے میں ولیم ہاکنز ناکام رہا۔

2 یہ قانون چونکہ ولیم پٹ کے زمانے میں پاس ہوا تھا،اس لیے اسے Pitt's India Act کے طور پر جانا جاتا ہے۔اس قانون کا مقصد 1773 کے'ریگولیٹنگ ایکٹ' کی خامیوں کو دور کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کو برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت کرنا تھا،اس لیے اسے East India Company Act (EIC Act 1784) بھی کہا جاتا ہے۔

3 Charles Grant, Observations on the State of Society Among the Asiatic Subjects to Great Britain, Particularly with Respect to Morals, and on the Means of Improving it, London: The British Library, 1797.

4 مالک رام،قدیم دلی کالج،دہلی: مکتبہ جامعہ، 2011،ص ص20-21۔

5 ملکہ الزبتھ اول(Queen Elizabeth I: 1533-1603) نے 31دسمبر1600 کو ایک'چارٹر' جاری کر کے'ایسٹ انڈیا کمپنی' کو ہندستان میں تجارت کرنے کے حقوق دیے تھے۔چارٹر کی ہر بیس سال بعد تجدید ہوتی تھی۔ان چارٹروں کے ذریعے حکومتِ برطانیہ کمپنی کے اختیارات اور حیثیت کا تعین کرتی تھی۔اس مقصد کے لیے پاس کیے جانے والے ایکٹوں کو'چارٹر ایکٹ' کہا جاتا ہے۔آخری چارٹر ایکٹ 1853 میں پاس ہوا تھا۔

6 بحوالہ مالک رام،قدیم دلی کالج،ص19

7 ڈاکٹر جان گل کرسٹ 1759 میں ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں پیدا ہوا۔1782 میں بمبئی پہنچا اور 1784 میں وہ بنگال آرمی کے بمبئی دستے میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔اس نے یہاں رائج اردو زبان (اس زمانے میں اسے ہندی،ہندوی اور ریختہ کہا جاتا تھا) سیکھی کیونکہ اس کے بغیر وہ یہاں اپنے پیشے کو بخوبی سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔اس زمانے میں بہت سے انگریز حکام فارسی یا اردو زبان برطانیہ سے سیکھ کر آتے تھے یا کسی ہندستانی منشی کی خدمات حاصل کر کے سیکھ لیا کرتے تھے۔ اس وقت تک سرکاری زبان فارسی تھی۔گل کرسٹ نے محسوس کیا کہ فارسی کا رواج اٹھ رہا ہے اور اس کی جگہ اردو مقبول ہو رہی ہے۔چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہ زبان خود سیکھے گا اور اپنے ہم وطن انگریزوں کو بھی سکھائے گا۔ چنانچہ یہاں اس نے ہندی لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اور 1785 میں اس نے اس کے لیے تنخواہ اور الاؤنس کے ساتھ ساتھ ایک سال کی چھٹی بھی مانگی جو منظور کر لی گئی تھی۔اس کے بعد گل کرسٹ نے لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، جونپور، بنارس اور غازی پور جیسے مقامات کا سفر کیا۔دن رات کی محنت شاقہ سے 1786 میں اس نے انگریزی ہندستانی لغت کا پہلا حصہ مکمل کر لیا۔بورڈ سے درخواست کی کہ اسے بنارس کی زمینداری میں رہنے اور وہاں نیل کی کاشت کرنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت مل گئی اور مسٹر چارٹر کے ساتھ نیل کی کاشت بھی کی لیکن بہت جلد مقامی زمینداروں سے مقدمہ بازی میں پھنس گیا تو چارٹر نے یوروپ اور گل کرسٹ نے کلکتہ جانے کا ارادہ کر لیا۔مئی 1798 میں گل کرسٹ کلکتہ چلا گیا تھا۔

8 جنرل لیک(Gerard Lake:1744-1808) جولائی 1801 میں کلکتہ آیا۔اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوج کی بہتری کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ تمام تر ہتھیاروں، پیادہ افواج، گھڑسوار فوج اور توپ خانوں کو اس نے زیادہ قابل انتظام بنایا۔نتیجتاً 1802 میں اسے مکمل طور پر جنرل بنا دیا گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی اس نے متعدد فتوحات حاصل کیں۔مثلاً 1803 میں دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ شروع ہونے پر جنرل لیک نے دولت سندھیا کے خلاف جنگ کی اور دو ماہ کے اندر ہی'کول' جسے اب علی گڑھ کہا جاتا ہے، میں مرہٹوں کو شکست دی۔یکم ستمبر 1803 کو علی گڑھ کی جنگ کے بعد اس نے 11 ستمبر کو دہلی، 10 اکتوبر کو آگرہ اور یکم نومبر کو لسواری کی جنگ (Battle of Laswari) میں فتح حاصل کر لی تھی۔

9 غازی الدین خاں کا اصل نام میر شہاب الدین صدیقی اور لقب فرزند ارجمند نواب غازی الدین خان صدیقی بے آفندی بہادر، فیروز جنگ اول(1649-1710) تھا جو قلیچ خان خواجہ عابد خان صدیقی بے آفندی کے بیٹے تھے۔ 1686 میں وہ گولکنڈہ قلعہ کے محاصرہ میں ایک کمانڈر اور فوج کے سربراہ تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب(1618-1707) نے ذاتی طور پر گولکنڈہ کی سلطنت کے آخری حکمران سلطان ابوالحسن قطب شاہ کو قیدی بنایا تو غازی الدین خاں، مغل شہنشاہ بہادر شاہ اول (Mirza Muhammad Mu'azzam: 1643-1712) کے دورِ حکومت میں صوبۂ گجرات کے صوبے دار (گورنر) بنائے گئے تھے۔1690 کی دہائی میں میر شہاب الدین عرف غازی الدین خان نے دہلی کے باہر اجمیری دروازہ پر اپنے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرایا۔اس زمانے کے دستور کے مطابق مقبرے کے ساتھ ایک عالیشان مسجد بنائی گئی جس میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا۔1710 میں غازی الدین خاں کا احمد آباد (گجرات) میں انتقال ہوا تو ان کی لاش وہاں سے دہلی لائی گئی اور یہاں دفن ہوئی۔بعض مورخین کا خیال ہے کہ فنڈ کی کمی کے باعث 1790 میں مدرسے کو بند کر دیا گیا تھا۔ تقریباً دو سال بعد 1792 میں اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔یہی وہ مدرسہ ہے جسے بانیِ عمارت کے نام پر'مدرسہ غازی الدین خان' کے نام سے جانا جاتا ہے۔...یہی مدرسہ آگے چل کر'دلی کالج' میں تبدیل ہوا۔(مالک رام،قدیم دلی کالج،ص18۔)

10 مالک رام،قدیم دلی کالج،ص30۔

11 Thomas Babington Macaulay, Minutes on Education in India, Selections from educational Records: 1781-1839 (Part-1), Edited by H. Sharp, Calcutta: Superintendent Government Printing, 1920, pp.107-117.

12 بحوالہ مالک رام،قدیم دلی کالج،ص39۔

13 The Despatch of 1854 on General Education in India, London: 7, Adam Street, Strand, 1854.

14 عبدالحق،مرحوم دہلی کالج،دہلی:انجمن ترقی اردو ہند،1989،ص71

15 انیسویں صدی میں برطانوی عہدیدران نے اپنے نوآبادیاتی منصوبوں کے تحت ہندستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانا شروع کیا۔ان کے ذہن و دل میں انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کی اہمیت کچھ اس طور پر نقش کی جانے لگی تھی کہ اس کے بغیر ان کی ترقی ممکن ہی نہیں۔اس کے اثرات بڑی تیزی سے مرتب ہونے لگے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے بعض دانشوران انگریزی اور انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے تھے۔اس حوالے سے راجہ رام موہن رائے اور سرسید جیسی عبقری شخصیات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

■

Dr. Mohammad Umar Raza
Department of Urdu, AMU
Aligarh- 202001
Mob: 8077353841
E-mail: urumarjnu@gmail.com

الیاس عزیز

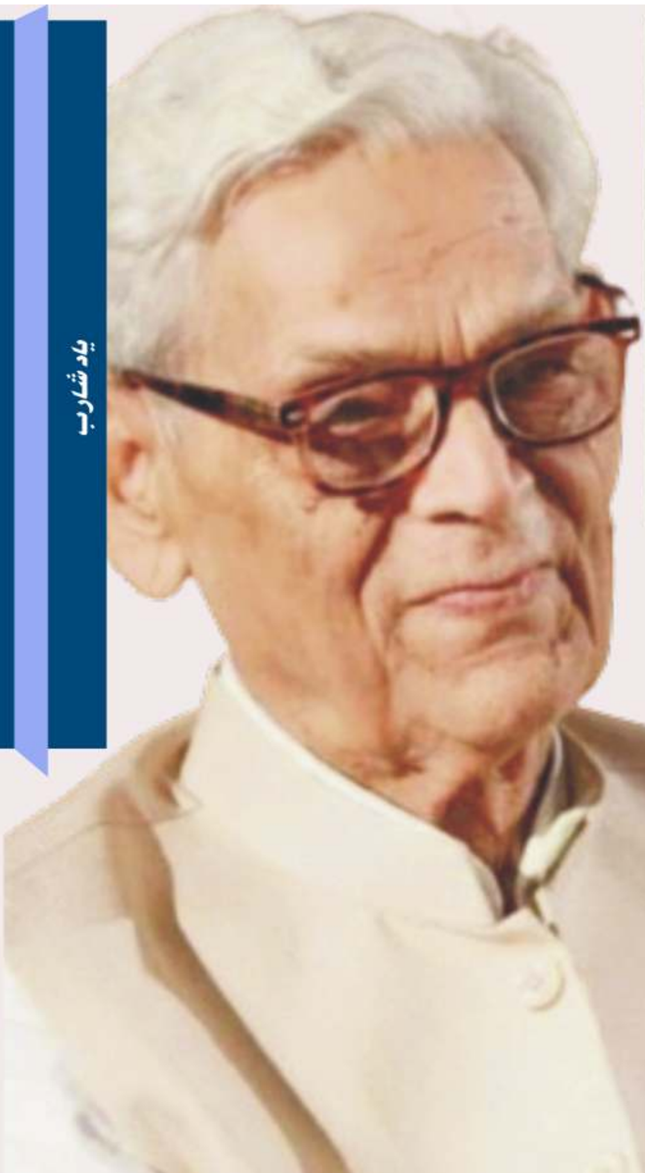

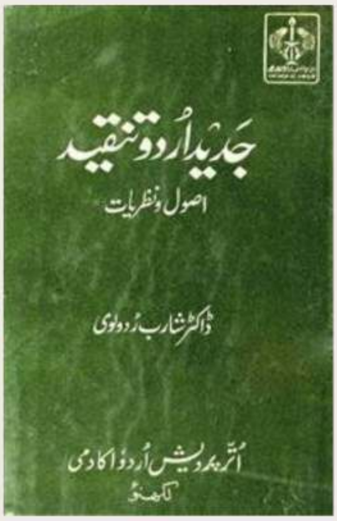

جدید اردو تنقید اصول و نظریات' شارب ردولوی کی نظریاتی تنقید کا نہیں بلکہ عملی تنقید کا بھی بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں تنقیدی دبستانوں کے ذکر کے سلسلے میں جہاں اردو کے مختلف نقادوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی تنقیدی اہمیت کے بارے میں بھی شارب ردولوی نے مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

پروفیسر شارب ردولوی
بحیثیت عملی تنقید نگار

شارب ردولوی اردو کے معتبر اور ممتاز نقاد تھے انھوں نے اپنی تصانیف میں نظریاتی اور عملی تنقید کے بڑے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں ان کی تصانیف 'جدید اردو تنقید اصول ونظریات'، 'تنقیدی مطالعہ'، 'تنقیدی مباحث' اور مختلف تنقیدی مضامین میں شعرا و ادبا کے فن اور اصناف ادب پر ان کی عملی تنقیدیں ملتی ہیں۔ تنقید میں ان کا نظریہ وسیع تر ادبی وتہذیبی بنیادوں پر مبنی ہے۔

شارب ردولوی نے عملی تنقید کے میدان میں 1956، 1957 میں قدم رکھا اس وقت کے ان کے مضامین بہت اہم نہ ہونے کے باوجود ان کے یہاں تنقیدی توازن کی نشاندہی کرتے ہیں ان کی کتابوں میں پہلی کتاب 'مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر' ہے جو انھوں نے 1957 میں لکھی جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ یہ کتاب 1959 میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب شارب ردولوی کی عملی تنقید کے سلسلے میں اس لیے اہم ہے کہ اس میں مراثی انیس کے مطالعے کے لیے بالکل نیا پہلو تلاش کیا گیا ہے۔ میر انیس پر اس وقت تک بہت کام ہو چکا تھا۔ امداد امام اثر، شبلی نعمانی، مسعود حسن رضوی ادیب جیسے مرثیہ کے ماہرین کی کتابیں شائع ہو چکی تھیں، لیکن یہ اتفاق ہے کہ اس وقت تک کسی نے مرثیہ کے ڈرامائی عناصر کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ شارب ردولوی نے مرثیہ کے مطالعے میں ایک نئے رخ کا اضافہ کیا۔ انھوں نے خاص طور پر میر انیس کے مراثی میں مکالمہ، کردار نگاری، کشمکش اور تصادم کی نشاندہی کی ہے جو ڈرامے کے عناصر ہیں اس طرح اپنی پہلی ہی کتاب کے ذریعے انھوں نے علما کی نگاہ اور ادبی دنیا میں اپنی ایک جگہ بنالی۔

نقاد کی ایک خصوصیت غیر جانبداری بتائی جاتی ہے یعنی نقاد کو فن پارے کی تحسین و تنقیص میں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، اسی لیے شارب ردولوی کی تحریروں میں کسی طرح کی جانبداری نظر نہیں آتی۔ وہ جب کسی فنکار یا فن پارہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو نہ حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں اور نہ حد سے زیادہ برائی، بلکہ ان کا انداز معتدل و متوازن ہوتا ہے۔ فراق کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا انداز ملاحظہ ہو:

''فراق کو مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور آل احمد سرور کی طرح اس عہد کا ایک بڑا نقاد قرار دینا مشکل ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تنقیدی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی ممکن نہیں ہے۔''

شارب ردولوی جس طرح فراق کی شاعرانہ اہمیت کو تسلیم کرتے تھے اسی طرح وہ مولانا سلیمان ندوی کو ایک وسیع ذہن کا حامل مفکر مانتے تھے اور تاثراتی تنقید میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے تھے لیکن بحیثیت مجموعی انھیں ایک کامیاب نقاد ماننے سے انکار کرتے تھے انھوں نے بہت صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ:

''سید سلیمان ندوی کا شمار بنیادی طور پر اردو کے ناقدین میں کرنا خود ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی لیکن ان کے تنقیدی مضامین و مقدمات اردو میں تاثراتی تنقید کی ایک اچھی مثال ہے۔''

مندرجہ بالا رائے سے شارب ردولوی کی اعتدال پسندی واضح ہے تنقید میں جہاں اختلاف کی گنجائش ہوتی وہاں وہ غیر جانبداری سے بے لاگ تنقید کرتے تھے اور جہاں اتفاق کرنے کا معاملہ ہو وہ پوری دیانت داری اور دلائل کے ذریعے فن پارے کی تحسین کرتے تھے فنکار اور فن کی قدروں کے تعین کے سلسلے میں وہ جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ تخلیق کے دونوں رخوں یعنی خامیوں اور خوبیوں کو معتدل نقطۂ نظر کے ساتھ اجاگر کر دیتے تھے۔

شارب ردولوی کے عملی تنقید کے جائزے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سماجیاتی تنقید پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ سماجیاتی تنقید ادبی تخلیق اور تخلیق کار سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات کی روشنی میں ان کی اہمیت کا پتہ لگاتی ہے۔ سماجیاتی نقاد کا ایک مقصد ان محرکات اور حقائق تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے جن سے متاثر ہو کر فنکار نے اپنے خیالات کا اظہار اور حالات کی ترجمانی کی ہے۔ سماجیاتی تنقید جیسے جیسے مقبولیت حاصل کرتی گئی اس میں نئے نئے خیالات نظریات جگہ پانے لگے اور اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا سماجیاتی نقاد جہاں ادیب کے ماحول اس کے خاندانی حالات اس کے عہد کے سماجی، سیاسی، تاریخی و تہذیبی حالات کو پیش نظر رکھتا ہے وہیں ادبی تخلیقات میں فنی و جمالیاتی اقدار اور فن پارے کے نفسیاتی محرکات کا پتہ لگانا بھی ناگزیر خیال کرتا ہے اس طرح سماجی تنقید میں ادب پارے کا مجموعی حیثیتوں سے مطالعہ کیا جانے لگا اور اس میں اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھا گیا اور اس معروضی انداز سے کیا جانے والا مطالعہ سائنٹفک تنقید کی بنیاد قرار پایا۔

اردو میں سماجی نظریات کی مقبولیت میں احتشام حسین کی تحریروں کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ شارب ردولوی کی شخصیت اور تحریروں پر احتشام حسین کا نہ صرف گہرا اثر نظر آتا ہے بلکہ انھوں نے احتشام حسین کے نظریات کو وسعت دینے کی ممکنہ حد تک سعی کی ہے۔ شارب ردولوی کے تنقیدی مطالعے کی بنیاد تاریخی، تہذیبی اور سماجی قدروں پر ہے وہ کسی فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت اسے اس کے مجموعی پس منظر میں دیکھتے ہیں اسی لیے ان کے تجزیے سائنسی و معروضی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اپنے مطالعے میں وہ کہیں بھی تنگ نظری کا شکار نہیں نظر آتے۔ ان کی تنقید میں وسعت ہمہ گیری اور متوازن نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اردو ادب کے باکمال شعرا و ادبا پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اور عملی تنقید کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی شعرا میر، غالب، اقبال، انیس، ولی، سودا کے علاوہ جدید شعرا میں جگر، حسرت، فیض، سردار جعفری، نیاز حیدر اور کیفی اعظمی کے علاوہ بہت سے شعرا اور ادبا اور ناقدین ادب اور اصناف ادب پر بھی ان کی تنقیدی تحریریں ملتی ہیں جن سے ان کے نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔

'جدید اردو تنقید اصول و نظریات' شارب ردولوی کی نظریاتی تنقید کا نہیں بلکہ عملی تنقید کا بھی بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں تنقیدی دبستانوں کے ذکر کے سلسلے میں جہاں اردو کے مختلف نقادوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی تنقیدی اہمیت کے بارے میں بھی شارب ردولوی نے مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو حالی سے لے کر جدید ترین تنقید نگاروں تک کے کارنامے زیر بحث آتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ مثالیں صرف اس لیے پیش ہیں کہ اردو کی عملی تنقید میں شارب ردولوی کے Contribution کا اندازہ ہو سکے انھوں نے مختلف تنقیدی دبستانوں کے تحت ناقدین کا ذکر کیا ہے۔ اول اردو میں اب تک اردو ناقدین کو دبستانوں کے تحت پرکھنے اور جانچنے کی سعی نہیں کی گئی تھی۔ شارب ردولوی نے پہلی بار یہ قدم اٹھایا اور اس تقسیم سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ یہ مشکل کام تھا کہ کس ناقد کو کس دبستان میں رکھا جائے، لیکن انھوں نے اس کام کو بہتر طریقے پر انجام دینے کی کوشش کی۔ مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''مجنوں کی ابتدائی تنقیدوں میں تاثراتی رجحان ملتا ہے لیکن بنیادی طور پر انھیں تاثراتی نقاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کسی بھی تجزیے کے وقت وہ فنکار کے حالات زندگی اور سماجی پس منظر کو نظر انداز نہیں کرتے۔''

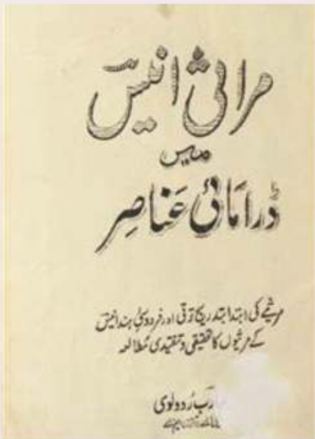

اسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقید نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے ان کے یہاں شدت پسندی کی نشاندہی کی ہے۔ وہ اس طرح کی تنقید کو صحت مند تنقید ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق تنقید میں وسیع نظریے کا ہونا لازمی و ناگزیر ہے وہ لکھتے ہیں:

''غالب پر لکھی جانے والی کتابوں میں ان کے مقدمہ 'محاسن کلام غالب' کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کی کتاب کی ابتدا ہی انتہائی رومانیت کی ایک بہترین مثال ہے۔ ان کا معیار تمام تر ذوقی اور وجدانی ہے۔ ان کے یہاں سائنٹفک تنقید یا نقطۂ نگاہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا گہرا تاثر اور رومانیت ہے۔ وہ ایسی اصطلاحات اور پرشکوہ الفاظ اور رنگین جملوں کا استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اصل

موضوع کو بھول کر انھیں جملوں اور اصطلاحوں میں کھو جاتا ہے، حالانکہ اگر ہم غور کریں تو اس طرح کی تنقید صحیح معنوں میں تنقید نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ایک طرح کا جذباتی ردعمل ہے جہاں نقاد اپنے تخیل سے ایک نئی کائنات بنالیتا ہے۔‘‘

شارب ردولوی نے خورشید الاسلام کو خاص تاثراتی نقاد نہیں مانا بلکہ شارب نے فنکار کے عہد اس کی شخصیت اور فن کا مطالعہ کیا اور ان عوامل کی نشاندہی کی جو سماجی تنقید کی خصوصیات ہیں وہ لکھتے ہیں:

’’خورشید الاسلام اردو تنقید میں بڑا پرفریب اسلوب لے کر آئے، پرفریب اس لیے کہ اس کو پڑھ کر ایک ساتھ کئی چیزوں کا احساس ہوتا ہے کبھی ان کے مضامین پر صرف انشائیہ کا شبہ ہوتا ہے کبھی تاثر کا پرتو گہرا ہو جاتا ہے کبھی تشریحی انداز نمایاں ہو جاتا ہے اور کبھی مادی، تاریخی، اور سماجی حقیقتوں کے پیش نظر ایک منفرد اور خوبصورت انداز میں کسی شہ پارے کے اقدار کے تعین کی کوشش معلوم ہوتی ہے ان کا اسلوب اردو تنقید میں منفرد ہے۔‘‘

حسن عسکری کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تنقید میں تاثراتی ونفسیاتی رجحانات میں انتہا پسندانہ نظریات کی نشاندہی کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

’’حسن عسکری کی تنقیدوں میں دو رجحانات نمایاں طور پر ملتے ہیں ایک تاثراتی اور دوسرا نفسیاتی اس لیے ان کو دونوں رجحانات کی نمائندگی کرنے والے ناقدوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کے یہاں دونوں رجحانات میں انتہا پسندی ہے وہ تنقید سے زیادہ رائے زنی کرتے ہیں وہ جس کے قائل نہیں ہیں یا جن باتوں کو مانتے نہیں ہیں، اس کا ذکر کرتے وقت ان کے لہجے میں تحقیر کا انداز نمایاں ہو جاتا ہے جو کہ صحت مند تنقید کی علامت نہیں ہے۔‘‘

شارب ردولوی نے جہاں حسن عسکری پر تنقید کرتے وقت ان کی انتہا پسندی اور شدت کو ناپسند کیا، وہیں وہ ڈاکٹر مسیح الزماں کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے یہاں تاریخی تنقید کے ساتھ ان کی گہری بصیرت کی ستائش بھی کی ہے اور ان کی تنقید کو صحت مند نظریۂ تنقید سے تعبیر کیا ہے:

’’اردو تنقید میں ڈاکٹر مسیح الزماں کو کافی اہمیت ہے وہ سب سے پہلے ہمارے سامنے تنقید کے ایک مورخ کی شکل میں آئے ہیں ان کے دوسرے ادبی وتنقیدی کارناموں میں بھی تاریخ کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ان کی کتابیں بے جان تاریخ یا ناموں اور سنوں کی فہرست نہیں بلکہ ایک صحت مند تنقیدی نظریے کے تحت ترتیب دی ہوئی تصانیف ہیں، وہ دوسرے ترقی پسند ناقدین کی طرح ادب کے سماجی پہلو پر زور دیتے ہیں اور زبان وادب کو زمانے اور ماحول کا پروردہ سمجھتے ہیں اور اس کے مطالعہ یا کسی ادبی فیصلے کے لیے ان محرکات کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔‘‘

جن ناقدین نے فن پارے کی تحسین صرف ایک پہلو یا ایک رخ سے کی ایسے مطالعے کو شارب ردولوی صحیح نہیں مانتے۔ انھوں نے ادیب وشعرا کی تخلیقات کا مطالعہ مجموعی حیثیت سے کیا ہے ان کے مطابق فن پارے کا یک رخا مطالعہ فنی قدروں کے تعین میں دشواری کا سبب بن سکتا ہے۔

حسن عسکری کی تنقیدوں میں دو رجحانات نمایاں طور پر ملتے ہیں ایک تاثراتی اور دوسرا نفسیاتی اس لیے ان کو دونوں رجحانات کی نمائندگی کرنے والے ناقدوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ، لیکن ان کے یہاں دونوں رجحانات میں انتہا پسندی ہے وہ تنقید سے زیادہ رائے زنی کرتے ہیں وہ جس کے قائل نہیں ہیں یا جن باتوں کو مانتے نہیں ہیں، اس کا ذکر کرتے وقت ان کے لہجے میں تحقیر کا انداز نمایاں ہو جاتا ہے جو کہ صحت مند تنقید کی علامت نہیں ہے۔

سلیم احمد کی تنقید میں نفسیاتی رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ شارب ردولوی نے سلیم احمد کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تنقید میں نفسیاتی عناصر کی نشاندہی کی اور ان کی تنقید کو رائے زنی، جملے بازی اور چونکا دینے والی تنقید قرار دیا ان کے مطابق سلیم احمد کی تنقید مجموعی حیثیت سے فنکار یا فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتی صرف فنکار کی ذہنی الجھنوں پر روشنی ڈالتی ہے وہ لکھتے ہیں:

’’وہ (سلیم احمد) صرف فرائیڈ اور تحلیل نفسی کی قدروں کو مانتے ہیں انھوں نے اردو شاعری میں صرف نچلے دھڑ کی تلاش کی ہے ان کی اس انتہا پسندی نے ان کی تنقید کو رائے زنی بنا دیا ہے... تحلیل نفسی یا ’زیر دامن‘ تنقید میرا جی اور ن م راشد کے یہاں نچلے دھڑ کی اہمیت اور ان کے جنسی مریض ہونے پر تو روشنی ڈال سکتی ہے لیکن ان کے کلام کی مجموعی حیثیت یا قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکتی اس قسم کے مضامین خود اس کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ قدروں کے تعین کے لیے نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ ان کا مقصد رائے زنی، جملہ بازی کرنا اور چونکانا ہے۔‘‘

شارب ردولوی نے جدید ناقدین کی تنقید نگاری پر بھی قلم اٹھایا ہے انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری سے بحث کرتے ہوئے اسلوبیات اور ساختیات پر ان کے کام کو سراہا ہے گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

... گوپی چند نارنگ نے میر انیس اور اقبال دونوں کے کلام کے تجزیے میں ان کی اثر انگیزی اور مقبولیت کو کھلے ’قوافی‘ قصیدے کی شوکت و بلند آہنگی غزلیہ لے صفیری و مسلسل اور طویل مصوتوں کے ربط و امتزاج اور اہمیت کے مقابلے میں فعلیت اور مصوتوں کی کثرت سے تعبیر کیا ہے لیکن انھوں نے اس بات سے بحث نہیں کی ہے کہ ایسا کیوں ہے شاید اس لیے کہ اسلوبیات یا ساختیات صرف موجود متن سے بحث کرتی ہے۔ اس کے اسباب و علل سے نہیں اس میں شک نہیں کہ گوپی چند نارنگ نے اس رجحان (اسلوبیات) کو مقبول بنانے میں جس استدلال اور طریقے سے کام لیا ہے اس نے اسلوبیات اور ساختیات کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔‘‘

عملی تنقید کی ایک خصوصیت تشریح و توضیح بھی ہے۔ نقاد کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اپنے نظریات کی نہ صرف تشریح کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ اس کی وضاحت کرتا جاتا ہے تاکہ قاری کو نقاد کے نظریات سمجھنے میں دشواری نہ ہو شارب ردولوی بھی نقاد کی اس خصوصیت کو ضروری قرار دیتے ہیں کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کی خامی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

کلیم الدین احمد کی عملی تنقید میں بھی یہی خامی ہے کہ ہم کسی ایسے نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ نقاد کے بنیادی اصول تنقید کو سمجھ سکیں یا یہ جان سکیں کہ وہ دراصل کہنا کیا چاہتا ہے عملی تنقید کے مطالعہ سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی غزل میں کیا خرابیاں ہیں اور شعر میں کس بات کو کس طرح سے پیش کیا گیا ہے لیکن نقاد ان باتوں کا تجزیہ کر کے خود کس نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے یا قاری کو کس نتیجے پر پہنچانا چاہتا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا۔‘‘

شارب ردولوی نے نظریاتی تنقید میں ادبی مطالعے کے جن اصولوں پر زور دیا ہے انھیں اصولوں کو انھوں نے اپنی عملی تنقید میں برتا ہے اس طرح ان کے مطالعے سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اصول کس حد تک کسی فنی تخلیق کی قدروں کے تعین میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

■

Dr. Ilyas Azeez
H. No.: 213, Akbari Gate
Lucknow- 226003 (UP)

شارب ردولوی کی علمی وعوامی خدمات

موسی رضا

سید مسیّب عباس (شارب ردولوی) کا تعلق قاضیان سلطان پور کے خاندان سے تھا جو ہجرت کر کے ردولی آ گیا تھا۔ ان کے والد حسن عباس اور دادا غلام حسنین کا شمار بڑے حکیموں میں ہوتا تھا۔ خاندانی جاہ وحشمت اور ماں کی شفقت سے محرومی نے شارب ردولوی کی شخصیت میں متانت ونفاست کے ساتھ ساتھ خودداری اور خوداعتمادی بھی پیدا کر دی تھی۔ اسی خوداعتمادی نے انھیں آزادی کے ساتھ فیصلے لینے کی طاقت بخشی۔ چاہے وہ ان کی تعلیم کا مسئلہ رہا ہو یا پھر شادی کا۔ ان تمام امور میں شارب ردولوی کے والد نے ان کی پوری حمایت کی۔

پروفیسر شارب ردولوی نے حصول تعلیم کی غرض سے ہاتھرس، سلطانپور، الہ آباد اور کانپور کا سفر کیا اور آخر کار لکھنؤ کی فضا انھیں راس آ گئی اور وہ سلیم پور ہاؤس میں رہ کر اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرنے لگے۔ یہاں کی فضا نے ان کے ادبی ذوق کو مہمیز کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد اور ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین کی سرپرستی نے انھیں قرطاس وقلم کی دنیا میں جولانیوں کا ہنر سکھایا۔ شارب ردولوی گیارہ سال کی عمر میں شاعری کی راہوں سے ادب کی دنیا میں داخل ہوئے اور نظمیں، غزلیں، قصیدے وغیرہ میں اپنے خیالات کو باندھنے لگے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے شاعری ضرور کی مگر اس کو شائع نہیں کرایا چند ایک کلام شاذ ونادر شائع ہو گئے مثلاً ایک سالانہ مقاصدہ میں پڑھا جانے والا کلام 'مدحیات' کے نام سے ہر سال شائع ہوتا تھا جس میں شارب ردولوی کے چند قصائد موجود ہیں۔ جب میں ان سے وابستہ ہوا اور ان کی خدمت میں روزانہ حاضر ہونے لگا تو ایک دن مجھے ایک ڈائری دیتے ہوئے کہا یہ میرا کلام ہے اس کو کمپیوٹر میں محفوظ کر لیں۔ اس ڈائری میں سب سے قدیم نظم 12، اکتوبر 1946 کی درج تھی۔ چند نظموں کے علاوہ قصائد و غزلیں وغیرہ بھی خوش خط تحریر میں نظروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ پروفیسر شارب ردولوی کو شاعری پسند بھی تھی اور وہ شعر کی تفہیم وتعبیر میں بھی ماہر تھے مگر جلد ہی شاعری کے گیسو سنوارنے کے بجائے انھوں نے تنقید کی گتھیوں کو سلجھانا زیادہ مناسب سمجھا اور پروفیسر احتشام حسین کی ہدایت ونگرانی نے ان کی طبیعت میں تنقیدی رجحان وصلاحیت کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔

شارب ردولوی نے اپنی خودنوشت میں احتشام حسین کا جو خاکہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت کا اثر ان کی زندگی پر بڑا گہرا تھا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے ذکر کیا ہے کہ کسی سبب شہر کے تمام ہوٹلوں نے اسٹرائک کر دی تھی اور جس نوری ہوٹل میں وہ کھانا کھاتے تھے وہ بھی بند تھا۔ شارب ردولوی اسی دن پروفیسر احتشام حسین سے ملاقات کرنے گھر گئے۔ معلوم کرنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ نوری ہوٹل آئے تھے مگر ہوٹل اسٹرائک کے سبب بند تھا اس لیے ادھر چلے آئے۔ احتشام حسین کچھ دیر بات کرنے کے بعد اوپر تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد سینی کے ساتھ واپس آئے جس میں نفیس اشیائے خوردنی سجی ہوئی تھیں۔ شارب ردولوی نے بہت انکار کیا مگر استاد کے حکم کے آگے ان کی چل نہ سکی۔ اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد وہ جذباتی انداز میں لکھتے ہیں:

''...اس دن ان کی محبت اور خیال کرنے کا میرے اوپر بہت اثر ہوا میں ان کے یہاں یہ سوچ کر نہیں گیا تھا کہ کھانا کھاؤں گا بس یوں ہی بے خیالی میں چلا گیا اور ہوٹل بند ہونے کا ذکر بھی کر دیا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ ایسے لوگ مشکل سے ہوتے ہیں۔ احتشام حسین صاحب صرف ایک اچھے ناقد اور مقرر ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہت اچھے استاد اور سب سے بڑی بات کہ ایک بہت اچھے انسان تھے۔

(نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم، شارب ردولوی، ص، 172)

یہی قربت تھی کہ جب شارب ردولوی اپنی پہلی کتاب 'مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر' منظر عام پر لائے تو اس پر ان کے استاد نے مقدمہ لکھا اور صرف مقدمہ ہی نہیں لکھا بلکہ شارب ردولوی کے روشن مستقبل کی نشاندہی بھی کر دی۔ وہ لکھتے ہیں:

''عزیزی شارب ردولوی کی یہ پہلی ادبی کوشش ہے اور مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے شروع ہی میں سنجیدہ اور فکر انگیز موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جب انھیں اپنے خیال وبیان پر قدرت حاصل ہو جائے گی اس وقت مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ وہ نقد ادب کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ایسے تنقیدی موضوعات پر لکھنے کے لیے مطالعہ، ذوق، لگن اور سنجیدگی کی ضرورت ہے اور شارب میں یہ باتیں موجود ہیں... اگر زمانے نے انھیں موقع دیا تو یقیناً وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں گے۔''

(مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر، ص 8، شارب ردولوی نسیم بک ڈپو 1959)

استاد کے قلم کی تحریر سچ ثابت ہوئی اور شارب ردولوی نے اپنی زندگی میں تنقید کی دنیا میں ایک نمایاں شناخت قائم کی۔ ان کی کتاب 'جدید اردو تنقید اصول و نظریات' کو آج بھی تنقید کے بنیادی اصول وضوابط کو سمجھنے کے لیے اہم کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ مقبولیت کے پیش نظر اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ دو کتابوں کے علاوہ اپنی زندگی میں انھوں نے گل صد رنگ، جگر فن وشخصیت، مطالعہ ولی، افکار سودا، تنقیدی مطالعے، اردو مرثیہ، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید، انتخاب غزلیات سودا، معاصر اردو تنقید مسائل ومیلانات، تنقیدی مباحث، مرثیہ اور مرثیہ نگار، اسرار الحق مجاز، تنقیدی عمل، ترقی پسند شعری فکر اور اردو شعرا، دشت جنوں اور نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم جیسی کتابیں تصنیف وترتیب دیں۔ ان تخلیقات کے علاوہ تقریباً 50 سے زائد ایسی

تحریریں کمپیوٹر میں محفوظ ہیں جو انھوں نے مختلف کتابوں کے لیے بطور پیش لفظ یا بشکل مضمون لکھی تھیں۔ اس کے علاوہ فکشن پر ایک کتاب اور خطوط کا مجموعہ زیر ترتیب تھا (جس کی اشاعت جلد ہوگی)۔ رحلت سے قبل بھی وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے اور کئی کتابیں میز پر آراستہ ان کی توجہ کی منتظر تھیں (جن کا انتظار اب کبھی ختم نہیں ہوگا)۔

پروفیسر شارب ردولوی نے بھرپور زندگی گزاری جس میں تجربات کی بہتات تھی۔ ان سے چند منٹ کی گفتگو میں ایسا محسوس ہوتا جیسے تجربوں کی آندھی میں تاریخ کے اوراق الٹ پلٹ رہے ہیں اور اس سے ظاہر ہونے والا ہر واقعہ سبق آموز ہے اور ہر بات محفوظ کر لینے لائق۔ ان واقعات میں زندگی کے شیریں لمحات بھی تھے اور تلخ سانحات بھی۔ مگر نہ تو وہ شیریں لمحات میں گم ہوئے اور نہ ہی تلخ سانحات سے مضطرب۔ میرے خیال سے سب سے بڑا غم شارب سر کے لیے اکلوتی بیٹی شعاع فاطمہ کا انتقال تھا یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اکثر انسان سب بڑے صدمے کو یاد کرنے سے بچتا ہے۔ اس کا اندازہ شارب ردولوی کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے۔

''شعاع مجھے کس قدر عزیز تھی یہ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں ہر وقت اس کا چہرہ دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بھی بچپن سے مجھ سے اس قدر Attach تھی کہ جب گود میں تھی اور ہم دونوں کے درمیان سوتی تھی تو ہمیشہ میری طرف کروٹ لے کر لیٹتی۔ کبھی شمیم اپنی طرف کروٹ کردیتیں تو فوراً میری طرف کروٹ لے لیتی اور شمیم ہنسنے لگتیں اس کا اس طرح اچانک چلا جانا ہم لوگوں کی زندگی کا ایسا سانحہ تھا جس نے ذہنوں کو ماؤف کردیا۔ وہ ہم لوگوں کی زندگی کا محور بن گئی تھی۔

(ایضاً، صفحہ 353)

پروفیسر شارب ردولوی کے ساتھ میں نے 8 سال گزارے مگر ان آٹھ سالوں میں شعاع فاطمہ کا ذکر مشکل سے ہی کبھی انھوں نے کیا ہو۔ یہ ان کا ضبط تھا وہ دن بھر شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج میں بیٹھ کر بھی شعاع کی یادوں کو زبان پر نہیں آنے دیتے۔ یہ کالج انھوں نے اپنی بیٹی کے نام پر ہی شروع کیا تھا۔ چونکہ شعاع فاطمہ اپنی پڑھائی مکمل نہیں کر سکی تھی اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے سرہانے ایم اے کا فارم بھرا ہوا رکھا تھا۔ اس لیے پروفیسر شارب ردولوی اور ان کی اہلیہ پروفیسر شمیم نکہت نے ایک ایسے کالج کے قیام کا بیڑا اٹھایا جہاں ضرورت مند بچیوں کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکے۔ اسی فکر کے ساتھ شعاع فاطمہ چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیر انتظام 1996 میں اپنی رہائش گاہ (علی گنج) پر دو ٹیچرز، ایک آیا اور کیئر ٹیکر کو رکھ کر شعاع فاطمہ پبلک اسکول کھول دیا۔ سنہ 2000 میں جب دونوں حضرات (پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر شمیم نکہت) ریٹائر ہوئے اور لکھنؤ میں مستقل رہنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے اسکول کے لیے فیض اللہ گنج میں ایک زمین خریدی اور اپنے دہلی کے فلیٹ کو 'اونے پونے' فروخت کر کے اسکول کے لیے ایک چھوٹی سی بلڈنگ بنوائی۔ یہ چھوٹی سی بلڈنگ رفتہ رفتہ ایک بڑے کیمپس میں تبدیل ہوگئی اور اس وقت یہ اسکول ترقی کر کے شعاع فاطمہ گرلس انٹر کالج بن گیا ہے جہاں ایک ہزار سے زائد طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں جس میں تقریباً 18 سے 20 فیصد بچے مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

کالج کے علاوہ پروفیسر شارب ردولوی نے فکشن نگاروں کی حوصلہ افزائی اور نوجوان نسل میں افسانہ نویسی کا رجحان پیدا کرنے کی غرض سے شمیم نکہت فکشن ایوارڈ اور افسانہ کمپیٹیشن کی شروعات کی تھی۔ اس کا پہلا جلسہ 2017 میں ہوا تھا اگرچہ اس کی شروعات 2015 میں ہونا طے تھی۔ مگر پروفیسر شمیم نکہت کی علالت اور پھر انتقال کے سبب یہ ایوارڈ اور فنکشن دو سال کے لیے ٹل گیا۔

شمیم نکہت فکشن ایوارڈ و توسیعی خطبہ اور شارب ردولوی تنقید ایوارڈ و توسیعی خطبے کے لیے دونوں حضرات نے دہلی یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلرز کو تجویز بھی بھیجی تھی کہ ان کی طرف سے دو دو لاکھ روپے یونیورسٹی میں جمع کرادئے جائیں گے جس کے انٹرسٹ سے اس کا انتظام کر دیا جائے۔ مگر دہلی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے پانچ لاکھ روپے کا Endowment طلب کر لیا جو ان دونوں ادب دوستوں کے لیے زیادہ رقم تھی۔ لیکن شارب ردولوی نے اس امر کی تکمیل کے لیے دوسرا راستہ نکالا اور ایک رقم اس مقصد کے لیے ٹرسٹ میں جمع کر کے فکشن ایوارڈ کا ایک Corpus بنا دیا جس کی آمدنی سے یہ ایوارڈ فنکشن اور لکچر ہونے لگا اور ان شاء اللہ اسی طرح آگے بھی ہوتا رہے گا۔

معاملہ چاہے افسانہ نگاری مقابلے کا ہو یا پھر فکشن ایوارڈ تقسیم کا دونوں ہی میں شارب سر بہت شفافیت سے کام لیتے رہے۔ ایوارڈ کے لیے ہندوستان کی بڑی یونیورسٹیز اور مایہ ناز ادیبوں پر مشتمل 12 ممبران کی ایک مجلس مشاورت ہوتی ہے ہر ممبر سے دو فکشن نگاروں کے نام طلب کیے جاتے ہیں۔ پھر جیوری ممبران رائے مشورے کے بعد مجوزہ ناموں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس موقع پر ایک شمیم نکہت یادگاری خطبے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلا یادگاری خطبہ مشہور دانشور، فکشن ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے 'فکشن کی سچائیاں' کے موضوع پر دیا تھا۔ دوسرا خطبہ اردو کے مشہور ناقد پروفیسر عتیق اللہ نے 'فکشن کی تنقید اور کئی چاند تھے سر آسماں' کے موضوع پر دیا۔ تیسرے خطبے کے لیے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو اردو افسانہ مبادیات و مراحل کا عنوان دیا گیا اور چوتھا خطبہ "نقل مکانی بیانیہ کی صورت گری اور اردو فکشن' پر پروفیسر صغیر افراہیم نے دیا۔ پانچویں خطبے کے لیے پروفیسر طارق چھتاری سے درخواست کی گئی اور انھوں نے اسے قبول کرتے ہوئے 'جدید اردو افسانے کی فکری بنیاد' پر یہ خطبہ تحریر کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے ہمعصر اردو فکشن پر چھٹا خطبہ پیش کیا اور 2023 میں 'جدید خواتین فکشن نگاروں میں، نسائی حسیت کی نوعیت' پر ساتواں خطبہ ڈاکٹر صبیحہ انور نے پڑھا۔ یہ تمام خطبات کتابچے کی شکل میں شائع ہو کر پروگرام میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خطبے موجودہ فکشن کی بدلتی نوعیت اور ابھرتے رجحان کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی فکشن تنقید کی سمت و رفتار میں بھی معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی ان خطبات کو یکجا کر کے شائع کرانا چاہتے تھے اور اس کا ذکر پانچویں خطبے میں 'ایک بات' کے تحت کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

شمیم نکہت توسیعی خطبات نے اردو افسانے کے مطالعے کے لیے فکشن تنقید کے مختلف ابعاد پر ایک کتاب فراہم کر دی۔ ان شاء للہ جلد ہی ہم چھٹے خطبے کے ساتھ کتابی شکل میں خطبات آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

شارب سر سے اس دن میری آخری بار گفتگو ہوئی پھر جب میں 17، اکتوبر کی رات ان سے ملنے گیا تو وہ کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھے۔ رات بھر میں بے چین رہا اور صبح جب یونیورسٹی پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ہی ان کے انتقال کی خبر ملی۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ میں نے ان کی سرپرستی میں لکھنے پڑھنے کا ڈھنگ ہی نہیں بلکہ زندگی جینے کا سلیقہ سیکھا ہے۔ ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں جو دوسروں کے بھلے کے لیے زندگی گذارتی ہیں۔ علمی و عوامی خدمات کے لیے شارب ردولوی کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

■

Dr. Moosi Raza
Asst Prof. Khwaja Moinuddin
Chishti Language University
Lucknow- 226013 (UP)
Mob.:9807694588

ظفراللہ انصاری

نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی

اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبر آبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے۔ جب غزل گوئی عالم گیر تھی، جب غزل گوئی اور شاعری مترادف الفاظ تھے، ایسے زمانہ میں نظیر نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور آزادی فکر کا بیش قیمت نمونہ پیش کیا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نظیر نے غزلیں نہیں لکھیں لیکن انہوں نے غزل کو حاصل شاعری نہیں سمجھا۔

ولی محمد نظیر اکبر آبادی (پیدائش 1735، وفات 1830) اردو کے مشہور شاعروں میں ہیں۔ ان کی شہرت عوامی شاعر کی حیثیت سے ہوئی۔ انھوں نے عوامی زندگی سے متعلق موضوعات پر اچھی خاصی تعداد میں نظمیں کہی ہیں اور یہی نظمیں انھیں عوامی شاعر بننے میں معاون ہوئیں۔ پروفیسر احتشام حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

ان کے احساسات و تجربات میں ایک دہقان کی بھونڈی سادگی اور بھدی بے ساختگی ہے۔ لیکن پھر بھی نظیر اپنی دنیا کے تنہا مسافر تھے جس نے رابنسن کروسو کی طرح سب کچھ خود ہی کیا اور شاعری کے صحیح مصرف کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ انھوں نے احساسات اور جذبات کے لحاظ سے تقریباً ہر طبقے کے لوگوں کے تجربات اور تاثرات پیش کیے لیکن ان کی ہمدردیاں عوام ہی کے ساتھ تھیں۔

(تنقیدی جائزے، احتشام حسین، ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد، سنہ اشاعت ندارد، ص 70-169)

محولہ اقتباس سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے اگر چہ اپنی شاعری میں دیگر طبقات کے احساسات و جذبات اور خیالات و تاثرات کو بھی جگہ دی ہے لیکن ان کا بنیادی سروکار طبقہ عوام سے تھا اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں اسی کو ترجیحی حیثیت دی اور اس طبقے کو اپنی نظموں کے محور میں رکھا۔ احتشام صاحب نے ان کی شاعری کی جن کمزوریوں کا ذکر کیا ہے وہ اس لیے نہیں تھیں کہ وہ شاعری کے رموز سے ناواقف تھے یا انھیں زبان نہیں آتی تھی بلکہ بقول فرحت اللہ بیگ:

علمی قابلیت یہ تھی کہ آٹھ زبانیں عربی، فارسی، اردو، پنجابی، باشا، مارواڑی، پوربی، ہندی جانتے تھے اور ایسے جانتے تھے کہ ان میں شعر کہتے تھے۔

(دیوان نظیر اکبر آبادی، مرتبہ فرحت اللہ بیگ دہلوی، انجمن ترقی اردو ہند، 1942، ص 7)

شاعری سے متعلق نظیر کے لسانی رویے سے آشنائی کے بعد یہاں اس بات کا بھی اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ نظیر نے عوامی زندگی کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے لیکن ان کا خاندانی پس منظر اس امر کی شہادت پیش کرتا ہے کہ ان کا تعلق بھی اشرافیہ طبقے سے تھا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

نظیر کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے تھے، انھیں میں سے اٹھے اور انھیں کے دکھ درد، ہنسی خوشی، افکار و تاثرات میں شریک رہے۔ ان کا فن تکمیل کے لحاظ سے ناقص ہے، ان کی شاعری تراش خراش کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے، ان کے اسلوب میں بے حد ناہمواری ہے۔ ان کے تفکر میں گہرائی کا نام نہیں،

نظیر کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک نواب سے وابستہ تھے۔نواب کے مشاہیر میں ان کا نام موجود ہے۔ ان کی شادی سلطان خان کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ سلطان خان آگرہ کے قلعہ دار تھے۔نظیر والدین کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ 1735 سن کذا: سنہ پیدائش ہے۔ دہلی میں قتل عام کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔احمد شاہ ابدالی نے بھی دہلی کو متعدد بار تاراج کیا تھا۔نظیر کے خاندان نے اس پس منظر میں ہجرت کا فیصلہ کیا۔نظیر کی عمر 23-22 کی ہوگی۔ وہ نانی اور والدہ کے ساتھ دہلی سے آگرہ منتقل ہوگئے۔نوری دروازہ کے پاس مکان لیا۔سکونت اختیار کی۔ ان کی شادی تہور النسا بیگم سے ہوئی۔ وہ رحمٰن خان کی صاحبزادی تھی۔ رحمٰن خان دہلی میں فوجی سالار تھے۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ نظیر اشرافیہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

(نظیر اکبرآبادی: ایک منفرد شاعر، مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، غالب انسٹیٹیوٹ، نئی دہلی، 2010، ص 122)

یہ بڑی بات ہے کہ اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود انھوں نے عوامی شاعری کی اور اپنی شاعری میں اشرافیہ رنگ پیدا ہونے نہیں دیا اور عوامی مزاج و منہاج سے اپنی نظموں کو مزین کیا۔ آزاد اور حالی سے پہلے نظم نگاری کی داغ بیل نظیر کے ہاتھوں پڑتی ہے اس لیے انھیں نظم نگاری کا پیش رو تسلیم کیا گیا۔

نظیر نے کثیر تعداد میں نظمیں کہیں اور ان کی نظموں نے ایسی شہرت پائی کی ان کی غزل گوئی پردۂ خفا میں چلی گئی اور اس کو ثانوی درجے کی چیز سمجھ لیا گیا۔کلیم الدین احمد نے جہاں ان کی نظموں کی تعریف کی ہے اور انھیں بہ نگاہ تحسین دیکھا ہے وہیں ان کی غزل گوئی کو بھی درخور اعتنا تصور کیا ہے۔ وہ نظیر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبرابادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے۔ جب غزل گوئی عالم گیر تھی، جب غزل گوئی اور شاعری مترادف الفاظ تھے، ایسے زمانہ میں نظیر نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور آزادیِ فکر کا بیش قیمت نمونہ پیش کیا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نظیر نے غزلیں نہیں لکھیں لیکن انھوں نے غزل کو حاصل شاعری نہیں سمجھا۔ میر، سودا اور غالب کی طرح نظیر کو بھی غیر شعوری طور پر غزل اور شعر مفرد کی تنگ دامنی کا احساس ہوا لیکن انھوں نے چند قطعے لکھ کر اپنی تشفی نہ کر لی اور اپنی شاعری کا زیادہ حصہ وقف غزل نہ کرتے رہے۔غزل کے ساتھ ساتھ مثلث، مخمس اور خصوصا مسدس سے بھی کام لیا اور ان صنعتوں میں اپنے خیالات اور شخصی تجربات کا مربوط و مسلسل بیان کیا۔

(اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ، 2016، ص 315)

محولہ بالا اقتباس میں اردو کے سخت گیر نقاد کلیم الدین احمد نے نظیر سے متعلق جو خیالات پیش کیے ہیں اس کے پس پشت ان کا جو نظریہ کارفرما ہے وہ جگ ظاہر ہے وہ غزل کو اس بنا پر خارج کرتے ہیں کہ اس میں ریزہ خیالی ہوا کرتی ہے وہ مربوط خیالات کی متحمل نہیں ہوتی، سوائے مسلسل غزل کے۔ چونکہ نظیر نے اپنے عہد کی عام روش یعنی غزل کی روایت سے آگے بڑھ کر اپنی آزادیِ خیال کا ثبوت بہم پہنچایا اور غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی تشفی بخش تعداد میں کہیں یہی وجہ ہے کہ وہ نظیر سے متعلق یہ ریمارک دیتے ہیں کہ: اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبر آبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح ہے۔'' جہاں تک نظیر کی غزل گوئی کا سوال ہے وہ بھی روایتی نہیں ہے۔کلیم الدین احمد ان کی غزل گوئی کی تعریف کرتے ہوئے کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''میں نے کہا نظیر نے غزلیں بھی لکھیں اور غزل میں بھی انھوں نے نئی راہیں نکالیں۔غزل کی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں ہر شعر ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے۔نظیر نے بہت ساری مسلسل غزلیں لکھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے سے گھبراتے ہیں۔ انھیں مربوط و مسلسل کلام میں لطف خاص ملتا ہے... نظیر نے غزل میں نئی راہیں نکالیں، اس میں نئی وسعتیں پیدا کیں، اس میں نظم کی خوبیاں داخل کیں۔

(اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص 315)

پیش کردہ اقتباس میں کلیم الدین احمد نے نظیر کی غزل گوئی کو اس لیے سراہا ہے کہ ان کی غزلوں میں ربط وتسلسل پایا جاتا ہے اور وہ غزل کو اس لیے نیم وحشی صنف سخن مانتے تھے کہ اس میں ربط وتسلسل نہیں ہوتا۔ ہر مذہب اور متمدن قوم کی طرح غزل کو بھی اپنے آپ میں شائستگی اور ترتیب و تنظیم پیدا کرنی چاہیے۔

نظیر کا تعلق اگرچہ اشرافیہ طبقے سے تھا لیکن وہ طبعا اور فطرتا قلندر صفت انسان تھے اور ان کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ نظیر قلندر صفت انسان تھے اور وہ شہرت و ناموری کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے اور انھوں نے نہ خود اپنا کلام جمع کیا اور نہ کسی سے جمع کروایا۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کا کلام کس طرح محفوظ رہ پایا؟ اس سلسلے میں مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

اب یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ نظیر کا کلام کتنا تھا، کیوں کہ انھوں نے نہ خود اپنا کلام جمع کیا اور نہ جمع کرانے کی کوشش کی۔حال یہ تھا کہ کوئی فقیر آیا صدا لکھوا کر لے گیا۔کوئی بچہ آیا اپنے مطلب کا شعر لکھوا کر لے گیا۔ بھلا ایسے آدمی کا شعر کیا جمع ہوسکتا ہے۔ اس وقت جوان کا کلیات طبع ہوا وہ بلاس رائے کے لڑکوں کی وجہ سے طبع ہوا ہے۔ یہ لڑکے نظیر سے پڑھتے بھی تھے اور استاد کا کلام جمع بھی کرتے جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسا کلیات جمع کر لیا جس میں تقریبا سات ہزار شعر ہیں۔ یہ کلیات مطبع الٰہی، کنبوہ دروازہ، میرٹھ میں طبع ہوا۔ بعد میں فحش اشعار اور قابل اعتراض بندوں کو نکال کر منشی نول کشور نے لکھنؤ میں اس کو چھپوایا۔ 1900 میں پروفیسر شہباز نے بڑی محنت سے ایک دوسرا کلیات مرتب کر کے نول کشور لکھنؤ میں چھپوایا تھا مگر وہ اب ذرا مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ اس کلیات کے علاوہ نظیر کے تین مکمل دیوان تھے دو اردو میں اور تیسرا فارسی میں۔ اردو دیوانوں کی تو اکثر غزلیں باطن نے اپنے تذکرے میں دی ہیں مگر فارسی کے دیوان کا اب پتہ نہیں چلتا پھر بھی پروفیسر شہباز نے فارسی اشعار کے بہت سے نمونے دیے ہیں۔

(دیوان نظیر اکبر آبادی، مرتبہ فرحت اللہ بیگ، ص 8)

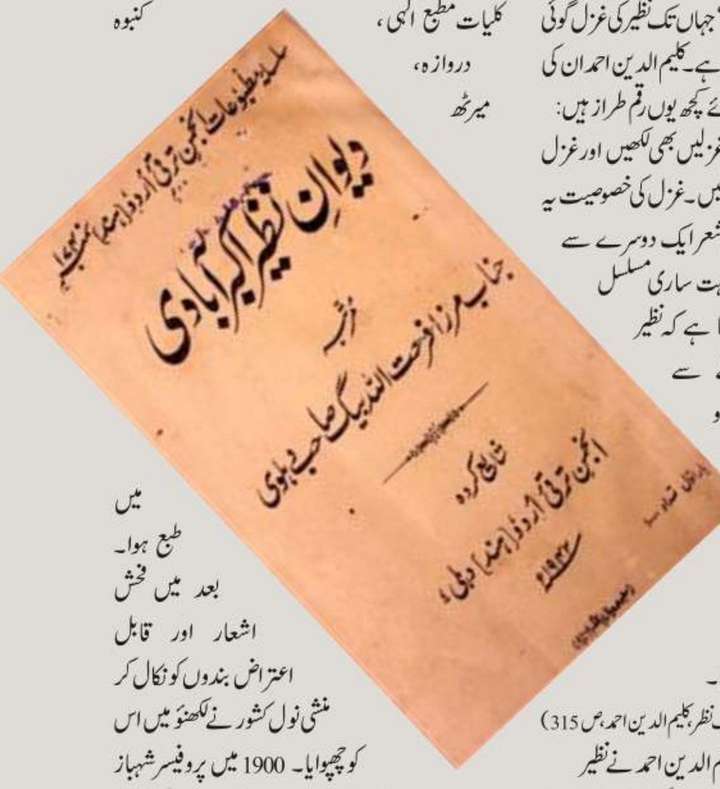

بہر حال میرے زیر نظر ہندوستانی اکادمی، الہ آباد کی شائع کردہ کتاب گلزار نظیر مرتبہ سلیم جعفر (1951) اور اتر پردیش اردو اکادمی کی مطبوعہ کتاب روح نظیر مولفہ مخمور اکبر آبادی ہیں۔ اول الذکر کتاب میں نظیر کی زیادہ غزلیں شامل نہیں ہیں لیکن ثانی الذکر کتاب میں کیفیت وکمیت کے لحاظ سے تشفی بخش غزلیں موجود ہیں۔ مخمور اکبر آبادی کی مرتبہ کتاب میں نظیر کی موضوعی غزلیں بھی شامل ہیں۔ موضوعی غزلوں کی مثال نظیر کے علاوہ قدیم و جدید شعرا کے یہاں نہیں ملتی۔ نظیر نے موضوعی غزل کا ایک انوکھا تجربہ کیا ہے جس سے ان کی ابداعی اور اختراعی قوت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد کو غزل کی جس ریزہ خیالی کی شکایت تھی اس کو رفع اس طرح کی غزلیں کر دیتی ہیں۔ یہاں ان کی ایک موضوعی غزل پیش کی جا رہی ہے جن میں وحدت تاثر کی فضا قائم ہے۔

جوانی

بنا ہے اپنے عالم میں وہ کچھ عالم جوانی کا
کہ عمر خضر سے بہتر ہے ایک ایک دم جوانی کا

نہیں بوڑھوں کی داڑھی میں میاں یہ رنگ وسمے کا
کیا ہے ان کے ایک ایک بال نے ماتم جوانی کا

یہ بوڑھے گو کہ اپنے منہ سے شیخی میں نہیں کہتے
بھرا ہے آہ پر ان سب کے دل میں غم جوانی کا

یہ پیران جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہر دم
کہ کیا کیا ان کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا

کسی کی پیٹھ کبڑی کو بھلا خاطر میں کیا لاوے
اکڑ میں نوجوانی کے جو مارے دم جوانی کا

شراب وگل بدن ساقی مزے عیش وطرب ہر دم
بہار زندگی کہیئے تو ہے موسم جوانی کا

نظیر اب ہم اڑاتے ہیں مزے کیا کیا اہا ہا ہا
بنایا ہے عجب اللہ نے عالم جوانی کا

مخمور اکبر آبادی نے اس طرح کی ان کی پچیس غزلیں اپنی مرتبہ کتاب میں درج کی ہیں۔

نظیر کو سراپا نگاری کا ہنر آتا ہے۔ اس کی مثالیں تو ان کی نظمیہ شاعری میں بہ کثرت ملتی ہیں، لیکن غزل میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہیں۔ نظیر کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں انھوں نے محبوب کا ایک قلمی خاکہ کھینچا ہے۔

یہ حسن ہے آہ یا قیامت کہ اک بھبھوکا بھبک رہا ہے
فلک پہ سورج بھی تھرتھرا کر منہ اس کا حیرت سے تک رہا ہے

کھجوری چوٹی ادا میں موٹی جفا میں لمبی وفا میں چھوٹی
ہے ایسی کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر ایک لٹ میں لٹک رہا ہے

وہ نیچی کافر سیاہ پٹی کہ دل کے زخموں پہ باندھے پٹی
پڑھی ہے جس نے کہ اس کی پٹی وہ پٹی سے سر پٹک رہا ہے

وہ ماتھا ایسا کہ چاند نکھرے پھر اس کے اوپر وہ بال بکھرے
دل اس کے دیکھے سے کیوں نہ بکھرے کہ مثل سورج چمک رہا ہے

وہ چین خود رو کٹیلے ابرو وہ چشم جادو نگاہیں آہو
وہ پلکیں کج خو کہ جن کا ہر مو جگر کے اندر کھٹک رہا ہے

غضب وہ چنچل کی شوخ بینی پھر اس پہ نتھنوں کی نکتہ چینی
پھر اس پہ نتھ کی وہ ہم نشینی پھر اس پہ موتی پھڑک رہا ہے

لب و دہاں بھی وہ نرم و نازک مسی و پاں بھی وہ قہر و آفت
سخن بھی کرنے کی وہ لطافت کہ گویا موتی ٹپک رہا ہے

نظیر نے موضوعی غزل کا ایک انوکھا تجربہ کیا ہے جس سے ان کی ابداعی اور اختراعی قوت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد کو غزل کی جس ریزہ خیالی کی شکایت تھی اس کو رفع اس طرح کی غزلیں کر دیتی ہیں۔

وہ کان خوبی میں چھک رہے ہیں جواہروں میں جھمک رہے ہیں
ادھر کو جھمکے جھمک رہے ہیں ادھر کا بالا چمک رہا ہے

صراحی گردن وہ آبگینہ پھر آگے سینہ بھی جوں نگینہ
بھرا ہے جس میں تمام کینہ کہ جوں نگینہ دمک رہا ہے

نظیر خوبی میں اس پری کی کہوں کہاں تک ثنا بنا کر
صفت سراپا میں جس کے لکھے دل اب اسی سے اٹک رہا ہے

نظیر حسن حقیقی اور حسن مجازی دونوں کے شیدائی ہیں اس لیے ان کے یہاں دونوں کا بیان ملتا ہے۔ نظیر نے ایک حسین کی تصویر کشی کس انداز میں کی ہے ملاحظہ ہو۔

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
گل رخ و گلگوں قبا و گلعذار و گل بدن

مہر طلعت زہرہ پیکر مشتری رو مہ جبیں
سیم بر سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن

تیر قد نشتر نگہ مژگاں سناں ابرو کماں
برق ناز و رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن

زلف و کاکل خال و خط چاروں کے یہ چاروں غلام
مشک تبت مشک چیں مشک خطا مشک ختن

نازنیں ناز آفریں نازک بدن نازک مزاج
غنچہ لب رنگیں ادا شکر دہاں شیریں سخن

بے مروت بے وفا بے درد بے پروا خرام
جنگجو قتال وضع و سرفراز و سر فگن

دوش و بر دنداں و لب چاروں سے یہ چاروں خجل
نسترن برگ سمن در عدن لعل یمن

مبتلا ایسے ہی خوش وصفوں کے ہوتے ہیں نظیر
بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

اس رنگ سے ان کی بہ کثرت غزلیں رنگین بنی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے بعض اشعار میں جنسی طلب کا بھی اظہار ملتا ہے۔ بعض لوگ اسے ابتذال یا سوقیانہ خیالات سے تعبیر کریں گے، لیکن یہ بدیہی حقیقت ہے کہ جنسی خواہشات انسان کی جبلت میں شامل ہے۔

نظیر کے یہاں عشق کے دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بے ثباتی عالم کے مضامین بھی ان کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنیا ہے اک نگار فریبدہ جلوہ گر
الفت میں اس کے کچھ نہیں جز کلفت وضرر

یہ جواہر خانہ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

ثروت و مال و منال حشمت و جاہ و جلال
کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب

المختصر یہ کہ نظیر جہاں نظم کے کامیاب شاعر ہیں وہیں غزل کے بھی، لیکن ان کی غزلوں پر ناقدین نے کم توجہ دی ہے جس کے باعث ادب میں ان کی غزلوں کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کی وہ مستحق تھیں۔ ان کی غزلوں کے مضامین میں تنوع ہے اور ان کی فکر میں وسعت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے صنف غزل میں نئے نئے تجربے کئے جو نظیر سے پہلے نہیں ملتے۔ نظیر نے غزل میں جو راہیں سجھائی تھیں ان کا تتبع بعد کے شعرا نے کیا ہوتا تو غزل کی صورت کچھ اور ہوتی۔

■

Dr. Zafrullah Ansari
Assistant Professor,
Dept of Urdu
Allahabad University
Prayagraj-211002 (UP)

قومی یکجہتی کا نمائندہ شاعر
نظیر اکبرآبادی

جواد حسین

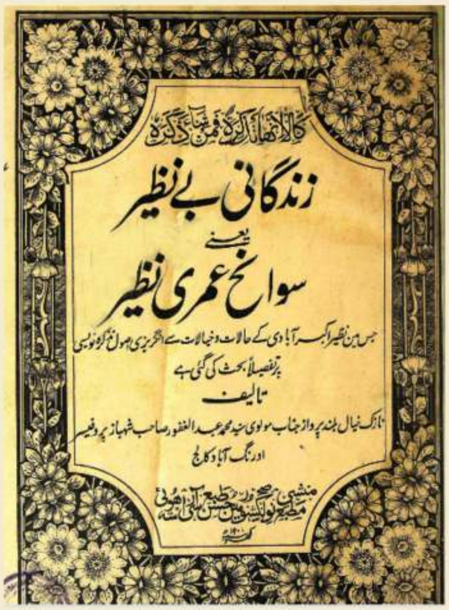
کلا انها تذکرة فمن شاء ذکره
زندگانی بے نظیر
یعنی
سوانح عمری نظیر
جس میں نظیر اکبر آبادی کے حالات وخیالات سے انگریزی اصول تذکرہ نویسی
پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے
تالیف
نازک خیال بلند پرواز جناب مولوی سید محمد عبد الغفور صاحب شہباز پروفیسر
اورنگ آباد کالج

بہت سارے باصلاحیت اور صاحب کمال لوگ کسی لابی یا گروپ کا حصہ نہیں بن پانے کی پاداش میں گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، جب کہ اس کے برعکس بہت سارے افراد ایسے بھی ہیں جو معمولی صلاحیت کے باوجود باکمال لوگوں میں شمار ہی نہیں کیے جاتے ہیں بلکہ ہر محفل اور ہر جگہ صف اول کے مالک بنے بیٹھے ہوتے ہیں، یہیں پر ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ باکمال اور صاحب استعداد لوگوں کو چاہے زندگی میں وہ مقام و مرتبہ نہ مل پائے جس کے وہ حقدار ہوتے ہیں، مگر بعد از مرگ ایسے لوگوں کے فن کا اعتراف دنیا ضرور کرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اردو کے عظیم شاعر نظیر اکبر آبادی کے ساتھ بھی ہوا، انھوں نے معلم کی حیثیت سے زندگی گزاری اور پوری زندگی اردو شاعری کے گیسو سنوارتے رہے، لیکن اپنے زمانے میں چونکہ وہ کسی گروپ کا حصہ بن سکے، نہ ہی کسی امیر یا وزیر کی انھیں پشت پناہی حاصل ہو سکی، اسی لیے انھیں جو مقام و مرتبہ ملنا چاہیے تھا وہ ان کے حصے میں نہیں آسکا۔ رشید خاں نے انتخاب نظیر اکبر آبادی کے 'تعارف' میں لکھا ہے:

''ایک بات اور، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظیر کی سماجی حیثیت بھی، ان کے راستے کا پتھر بن گئی۔ وہ ایک معلم تھے جس کی پشت پر نہ تو کسی معروف خاندان کی درویشی، سیادت یا سپہ گری کا پشتارہ تھا اور نہ کوئی ایسی ذاتی وجاہت حاصل تھی، جس کو اس زمانے میں قابل لحاظ سمجھا جاتا ہو، باتیں کرتے تھے سوفی صدی عام لوگوں کی زبان میں اور کہتے تھے وہ باتیں جن کو گفتگو کا موضوع تو سمجھا جاتا تھا، شاعری کا موضوع نہیں بنایا جاتا تھا، اس عہد کے معروف شاعروں کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی نسبت ضرور شامل تھی جس کو سماجی سطح پر قابل توجہ سمجھا جاتا تھا اور ایسی نسبتوں نے شخصیت کے نقش کو ابھارنے میں بہت مدد دی ہے۔''

نظیر کا زمانہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک کا زمانہ ہے۔ وہ 1740 میں پیدا ہوئے اور نوے سال کے قریب عمر پا کر 1830 میں چل بسے۔ ان کا اصل نام ولی محمد تھا اور وہ محمد شاہ ثانی کے دور میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے، لیکن احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد وہ دہلی سے آگرہ چلے گئے اور یہاں تاج گنج میں انھوں نے سکونت ہی اختیار نہیں کی بلکہ پوری زندگی یہیں بسر کردی، یہاں تک کہ اُن کے اِس وطن ثانی کی نسبت ہی ہمیشہ کے لیے ان کے نام کا جزو لاینفک بن گئی۔ نظیر فارسی کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے، برج بھاشا سے بھی واقف تھے، درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا اور یہی ذریعہ معاش۔ آخر عمر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور یہی ان کی موت کا سبب بن گیا۔ اس بات پر نظیر کے سارے سوانح نگار متفق ہیں کہ انھیں مجلسی زندگی بہت عزیز تھی:

''وہ ایک یار باش آدمی تھے اور ہر طبقے اور مزاج کے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ جوانی میں بڑے رنگین مزاج تھے۔ کھیل کود، پتنگ بازی، پیراکی، ورزش، کبوتر بازی ان کی دلچسپیوں میں شامل تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہواروں میں حصہ لیتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ آزادانہ زندگی کی تصویروں نے ان کے کلام میں غیر معمولی وسعت اور رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ روایتی شاعری کرنے کے علاوہ نظیر نے عوامی شاعری بھی کی۔ یہی ان کی پہچان بن گئی۔ ان کی عوامی نظموں میں ہندو مسلم روایات، تہواروں، مختلف مذہبوں کی برگزیدہ ہستیوں، ہندوستان کے مناظر، پرندوں، جانوروں، موسموں، پھلوں اور کھانوں کا غیر رسمی انداز میں ذکر ہوا ہے...... نظیر کا ذخیرۂ الفاظ بھی حیرت انگیز حد تک وسیع تھا۔'' (جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، ج1)

بلاشبہ نظیر کے یہاں ذخیرہ الفاظ کی یہ وسعت اور عوامی شاعری کی یہ شان و شوکت اسی لیے پیدا ہو سکی ہے کہ وہ قومی یک جہتی کے علمبردار تھے اور ہمارے شعر و ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کی محنت اکارت نہیں گئی اور ان کے اسی مزاج اور رویے نے ان کو دائمی عزت، شہرت اور شناخت بخش دی، یہاں تک کہ آج بھی نظیر اکبر آبادی عوامی شاعر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں او ر یہ حقیقت بھی ہے چونکہ ان کے مضامین کو دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں عوامی زندگی، ماحول و معاشرت کی بحسن و خوبی ترجمانی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نسبت کے سہارے کے بنا ان کی شاعری کی مقبولیت اُس عہد میں بھی کم نہیں تھی اور آج بھی اس کی معنویت و مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

یہ بات پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ عوامی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کے بھی بہت بڑے نمائندہ شاعر تھے۔ یہاں نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے حوالے سے 'قومی یکجہتی' کی وضاحت سے قبل 'قومی یکجہتی' کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قومیت کا مشترکہ باطنی احساس ہی قومی یکجہتی کا اولین زینہ اور ستون ہے۔ آج سے برسوں پہلے اثر لکھنوی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا 'درس اتحاد' اس نظم میں انھوں نے 'قومی یکجہتی' کا مرکب لفظ تو استعمال نہیں کیا ہے پر لفظ 'یکجہتی' کا مفرد لفظ ضرور استعمال کیا ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد یہ پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ قومی یکجہتی کیا ہے؟ اور عدم یکجہتی کی صورت میں شاعر کے قلم سے وجود میں آنے والے الفاظ شاعر کی اندرونی اور باطنی کیفیت کو بایں طور ظاہر کرتے ہیں کہ درد و کرب اور قلق و اضطراب کی پوری دنیا سامنے آجاتی ہے۔ اثر لکھنوی کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

الفت ہوئی رسم پارینہ   ہے اس کی جگہ دل میں کینہ
اگلوں کے چلن ہم بھول گئے   وہ رسم کہن ہم بھول گئے
آپس کی رواداری اٹھی   الفت اٹھی یاری اٹھی
وہ یوگ رہا نہ وہ پریت رہی   بس ایک نفرت کی ریت رہی
یکجہتی جب مفقود ہوئی   اور فکر زیان و سود ہوئی

وہ جذب کی طاقت سلب ہوئی　　توفیق ہدایت سلب ہوئی

مذکورہ اشعار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یکجہتی کے لیے آپسی محبت و بھائی چارگی اور الفت و مودت نہایت ضروری ہے۔ یہ یکجہتی کے قیام کا وہ جوہر نایاب ہے جسے کسی بھی صورت میں آپس سے رخصت نہیں ہونے دینا چاہیے۔ چونکہ اس کے بغیر ہمارا قومی اتحاد و اتفاق منتشر ہو جائے گا اور تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جائے گا اور جب ایک ساتھ مختلف مذاہب اور عقائد کے مل جل کر رہنے والے افراد کے درمیان سے یہ چیزیں رخصت ہو جاتی ہیں تو نفرت، عداوت، دشمنی، بغض، کینہ اور آپسی بے زاری کا سلسلہ دراز ہوجاتا ہے۔ اور یہ کسی بھی ملک اور قوم کے لیے حد درجہ نقصان کا باعث ہوجاتا ہے۔ جہاں تک ہمارے ملک کی بات ہے تو قومی یکجہتی اور آپسی رواداری کی ایسی مثال دنیا کے کسی ملک میں شاید ہی مل سکے۔

ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس ملک میں صدیوں سے مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے بولنے والے لوگ ایک ساتھ رہتے آرہے ہیں، کبھی اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت رہی تو کبھی مسلمانوں کی، لیکن کبھی بھی کسی دور میں مذہب اور زبان کی بنیاد پر دونوں قوموں کا تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہوا۔ اور جب اس ملک کو انگریزوں نے غلام بنایا تو سبھی مذہب کے لوگوں نے مل کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اور قومی یکجہتی کی ایسی مثال قائم کی کہ انگریزوں کو اس ملک سے جانا پڑا۔ اور اس ملک کی دو مشہور زبانیں ہندی اور اردو جو آپس میں سگی بہنیں ہیں ان دونوں نے قومی یکجہتی کے فروغ میں خوب خوب جوہر دکھائے۔ اردو نے تو اسے مضبوط و مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اور آتش نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

اردو کے اور بھی کئی شعرا ہیں جنھوں نے قومی یکجہتی، مشترکہ تہذیب اور باہمی اتحاد و اتفاق پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔

اگر انھوں نے عوامی جذبات و خیالات کا لحاظ کرتے ہوئے موسم برسات، جاڑے کی بہاریں، طفلی، جوانی، بڑھاپا، مفلسی، کوڑی نامہ، پیسہ نامہ، روٹیاں، چپاتی نامہ، آٹا دال، موت، فنا نامہ، فقیروں کی صدا، بنجارا نامہ، توکل، آدمی نامہ، دنیا، دنیا کے عیش وعشرت اور 'دنیا دار المکافات ہے' وغیرہ جیسی نظمیں لکھی ہیں اور رنگا رنگ اور نوع بہ نوع مضامین پر طبع آزمائی کی ہے، تو اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان جیسے کثیر مذہبی اور کثیر لسانی ملک میں بسنے والے مختلف ادیان و مذاہب کے تیوہاروں پر بھی پوری توجہ دی۔ مثلاً سکھ مذہب کے عظیم رہنما گرونانک شاہ کے بارے میں مسدس کی ہیئت میں پوری نظم ان کی کلیات میں موجود ہے۔ اس نظم کا پہلا اور آخری بند ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں، وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں، یوں روشن، جیسے ماہ گرو
مقصود، مراد، امید، سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف وکرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو، واہ گرو
جو ہر دم ان سے دھیان لگا، امید کرم کی دھرتے ہیں
وہ ان پر لطف وعنایت سے ہر آن توجہ کرتے ہیں
اسباب خوشی اور خوبی کے گھر، بیچ انھوں کے بھرتے ہیں
آنند، عنایت کرتے ہیں سب من کی چنتا ہرتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو، واہ گرو

پوری نظم اور خاص طور سے مذکورہ دونوں بند پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سکھ دھرم کے ماننے والوں کی گرونانک کے تئیں جو گہری عقیدت اور محبت وابستہ ہے، اس کی بہترین عکاسی یہاں کی گئی ہے۔

مذہبی شخصیات پر جب شاعر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً یہ خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے کہ اس کا بیان مبادا اُس شخصیت کے ماننے والوں کو اعتراض کا موقع دے دے یا مقطع میں کوئی ایسی بات آپڑے جو خود شاعر کے ہم مذہب افراد کو انگشت نمائی کا موقع دے جائے، لیکن یہ نظیر کا بڑا کمال ہے کہ وہ اس راہ میں سلامت روی سے ہمکنار ہوئے ہیں اور عقیدے اور عقیدت کے فرق پر کسی طرح حرف نہیں آنے دیا ہے اور ایسا دراصل اس لیے ممکن ہوسکا ہے کہ انھوں نے بہرصورت قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے مزاج سے شعوری انداز میں کام لیا ہے۔ قومی یکجہتی کا اصل تقاضا احترام مذاہب ہے اور روایات و مذاہب کا احترام نظیر کی شاعری کے لفظ لفظ نہیں گویا حرف حرف سے ہیرے کی کنی کی مانند دمک رہا ہے۔

ہندوستان کی کثیر مذہبی تہذیب و ثقافت اور تیوہاروں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور آپسی محبت و بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے اگر ایک طرف نظیر نے شب برات، عیدالفطر، حضرت سلیم چشتی، عشق اللہ اور 'رہے نام اللہ کا' وغیرہ جیسے عنوان کے ساتھ متعلقہ مضامین کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے تو دوسری طرف بلدیو جی کا میلا، مہادیو جی کا بیاہ، ہولی، ہولی کی بہاریں، دوالی اور 'راکھی' جیسے عناوین کے ساتھ نظمیں لکھ کر قومی یکجہتی اور آپسی محبت و بھائی چارگی کی ایک بہترین مثال قائم کی ہے۔

'ہولی' برادران وطن کا ایک اہم تیوہار ہے۔ ہولی کے موضوع پر نظیر نے یکے بعد دیگرے تین نظمیں لکھی ہیں۔ پہلی نظم 'ہولی' مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے، جب کہ دوسری نظمیں 'ہولی' اور 'ہولی کی بہاریں' مخمس کی ہیئت میں ہیں۔ ان تینوں نظموں کو پڑھنے کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اس تیوہار کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ان کا اپنا ہی تیوہار ہے۔ ان کی اس تیوہار کی ساری جزئیات سے گہری واقفیت برادران وطن سے میل جول اور محبت کی عمیق نشانی اور علامت کو ظاہر کرتی ہے، ان تینوں نظموں کا ایک ایک بند ملاحظہ کریں۔

معمور ہیں خوباں سے گلی، کوچہ و بازار
اڑتا ہے ابیر اور کہیں پچکاری کی ہے مار
چھایا ہے گلالوں کا ہر اک جا پہ دھواں دھار
پڑتی ہے، جدھر دیکھو اُدھر رنگ کی بوچھار
ہے رنگ چھڑکنے سے ہر اک دنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر
(ہولی)

دوسری 'ہولی' نظم سے ایک بند دیکھیں۔

کچھ طبلے کھٹکے، تال بجے، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ جھڑ بیں بین، ربابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ ڈھمڈھمی اور منھ چنگ بجی
کچھ گھنگھر و کھٹکے جھم جھم جھم، کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے
(ہولی)

تیسری نظم 'ہولی کی بہاریں' کا ایک بند بھی ملاحظہ کیجیے۔

گل زار کھلے ہوں پریوں کے، اور مجلس کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گل کاری ہو
منھ لال، گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو، انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
(ہولی کی بہار)

اس طرح نظیر اکبرآبادی نے دیوالی اور راکھی کے تیوہاروں کا بھی نہایت خوبصورت اور خوشنما منظر پیش کیا ہے، جو یقیناً اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ انھیں اس دیش کی قومی یکجہتی سے بہت گہرا پیار اور لگاؤ تھا اور وہ برادران وطن کے تیوہاروں اور ان کی تہذیب وثقافت کو بہت ہی قریب سے جانتے تھے۔

■

Dr. Jawwad Husain
Asst Prof. Head Dept. of Urdu
L N D College
Motihari- 845401 (Bihar)
Mob.:9931689647

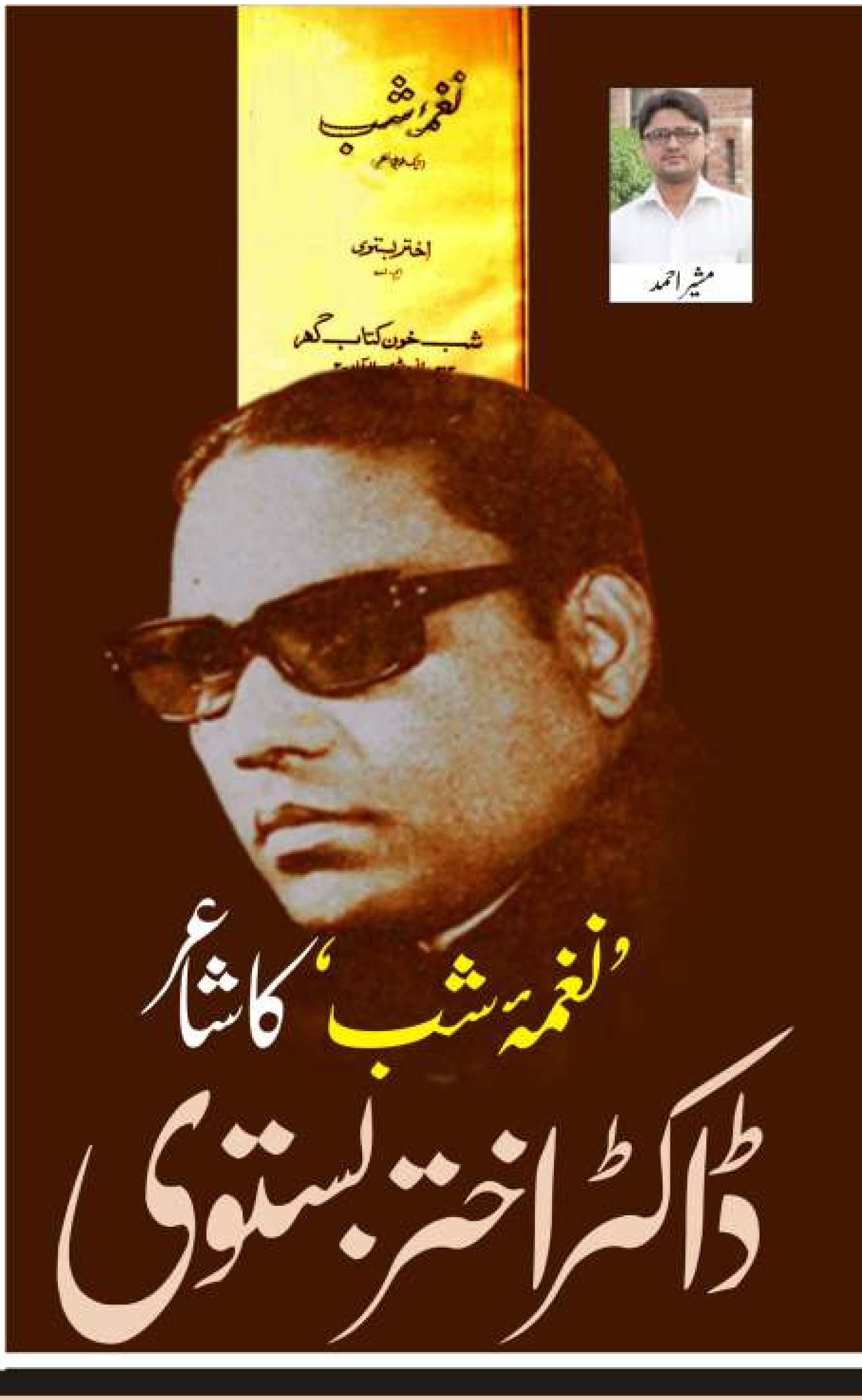

'نغمۂ شب' کا شاعر ڈاکٹر اختر بستوی

مشیر احمد

ڈاکٹر اختر بستوی پورا نام محمد اختر علی صدیقی (1938- 1998) کا شمار اردو و فارسی زبان و ادب کی نامور شخصیات میں کیا جاتا ہے۔ وہ عظیم شاعر ہونے کے علاوہ بلند پایہ نثر نگار بھی ہیں۔ شاعری کے میدان میں انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں بطور خاص طویل نظم نگاری، مختصر نظم نگاری اور غزل گوئی وغیرہ وہ اصناف سخن ہیں، جن میں انھوں نے اپنی فن کاری اور جادوئی انداز بیان کے ذریعے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ ان کی دو طویل نظمیں 'نغمۂ شب' اور 'بحر بیکراں' الگ الگ کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم و دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مختصر نظموں کا ایک مجموعہ 'اپنے سائے کے سوا' اور قطعات پر مشتمل مجموعہ 'پیکر خیال' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی غزلیں بھی بڑی تعداد میں ہیں جو ادبی رسائل و جرائد میں مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ نثر نگاری کی جہاں تک بات ہے تو انھوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کے بیش قیمتی مقالات مختلف رسائل میگزین کی زینت رہے ہیں۔ اختر بستوی نے کئی کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے جن میں 'سخن جو ہر'، 'کردار کے غازی قاضی محمد عدیل عباسی' اور 'انتخاب حالی' اہمیت کی حامل کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں ان کی جو تحریریں تالیفات اور مقدمے اور تنقید نگاری کی شکل میں موجود ہیں، ان سے اختر بستوی کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اختر بستوی کی تخلیقات میں افسانے بھی شامل ہیں اور اس حوالے سے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں تکنیکی طور پر دو اہم تجربے بھی کیے ہیں۔ اول مونولاگ کی تکنیک اور دوسرے کورس کنٹری کی تکنیک۔ افسانوں کے علاوہ نثری دنیا میں ان کی تخلیقات میں طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کی بھی کثرت ہے۔ جو ان کی کتاب 'ٹیڑھے نشان' کی زینت ہیں۔ افسانہ نگار اور مزاح نگار کے علاوہ ان کی ایک حیثیت ترجمہ نگاری کی بھی ہے۔ ترجمہ نگاری میں وہ ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ ان کی ترجمہ نگاری کا بہترین نمونہ شہر سے دور نامی ترجمہ کردہ کتاب میں موجود ہے۔ ان کی یہ کتاب انگریزی کے نامور ڈرامہ نگار شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے As you like it کا ترجمہ ہے۔

مذکورہ بالا تمہیدی گفتگو کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختر بستوی کی شعری تخلیقات/نگارشات کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر اختر بستوی کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض ایسے انوکھے اور نادر موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، جن پر کم لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور اردو میں طویل نظمیں کم کہی گئی ہیں۔ اختر بستوی نے دو طویل نظمیں لکھ کر اس صنف کو روشن و منور کیا ہے۔ اسی طرح قطعات کے مجموعے بھی اردو زبان و ادب میں کم ملتے ہیں۔ ان کے قطعات پر مشتمل ایک مجموعہ 'پیکر خیال' نے قطعات کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔

ان کی نظموں کی جانب جب ہم دیکھتے ہیں تو ان کی دو طویل نظمیں اہل علم کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ اولاً 'نغمۂ شب' اور ثانیاً 'بحر بیکراں'۔ ان دونوں نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ الگ الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ 'نغمۂ شب'، اختر بستوی کی ایک طویل نظم کا مجموعہ ہے جو شب خون کتاب گھر، رانی منڈی الہ آباد سے پہلی بار 1969 میں شائع ہوا ہے۔ یہ نظم دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دلچسپ بھی ہے۔ اس نظم میں رات ایک شخص کے روپ میں نظر آتی ہے اور اسے کردار کا جامہ پہنا کر اختر بستوی نے اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے کرب اور روزگار کے مسائل کا خوب صورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص جو حالات کا مارا ہوا ہے، ستم رسیدہ ہے، مظلوم ہے، وہ اپنی زندگی کی روداد سنا رہا ہے۔ صفحہ نمبر 9 سے صفحہ 64 تک

پچھلی اس طویل نظم میں روانی اور برجستگی کے علاوہ موسیقیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔نظم کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

اس خفتہ آبادی میں اک دیوانہ شاعر اب تک
جاگ رہا تھا اپنے ادھورے سپنوں کا سنسار لیے
نظروں میں الجھنیں ہزاروں، ماتھے پر شکنوں کا جال
ذہن میں نامعلوم مسائل کے صدہا افکار لیے
دن بھر دنیاداروں کی مانند نہ وہ مشغول رہا
کام کیا بس اتنا ہی بجھ جائے جس سے پیٹ کی آگ
تھکن مشینی دور کی اس پر اسی لیے حاوی نہ ہوئی
بڑھا نہ اس کی جانب پھن پھیلا کر بے حس نیند کا ناگ
بیداری کی نعمت اس کے پاس ابھی تک تھی محفوظ
غفلت کس کو کہتے ہیں یہ بات نہ تھی اس کو معلوم
ہوش وحواس بھی تھے قابو میں، آنکھیں بھی تھیں کھلی ہوئی
قلب بھی اس کا، ہوا نہ تھا احساس کی دولت سے محروم
ایک پرانے پُل کے نیچے کھڑا تھا وہ گم صم، چپ چاپ
دیکھ رہا تھا دور خلا کی تاریکی میں جانے کیا
چشم تمنا شاید کہتی تھی 'دیکھو فطرت کے روپ'
نظر مگر حیراں تھی اندھیرے میں آخر پہچانے کیا

نظم کا یہ حصہ پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر دنیا کے طبقاتی نظام اور دولت کے حصول میں رواں دواں دنیا میں ایک ایسے منظر کی تصویر کشی کر رہا ہے، جہاں کوئی محبوس شخص فکر دوراں کے جال میں پھنس کر دنیا کی چمک دمک، مشینی وصنعتی زندگی کی محرومیوں کا شکار ہو کر بھی اپنے فکری اعصاب پر قابو رکھتا ہے اور رات کی تاریکی میں 'فطرت کے روپ' کو دیکھ کر جس طرح انسان چمکتے ستاروں کو تو دیکھتا ہے، لیکن ستاروں کی چمک کے علاوہ اسے کچھ نظر نہیں آتا اسی طرح جدید دور میں دنیا کی چمک تو نظر آتی ہے، لیکن اس چمک دمک کا انجام کیا ہوگا اس تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر اختر بستوی کی یہ نظم اس قدر اہم ہے کہ اس حوالے سے اردو ادب کے اہم ناقدین نے اس کی عظمت کو سراہا ہے۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین اس نظم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اختر صاحب کی طویل نظم 'نغمۂ شب' اقبال کی نظم 'خضر راہ' کی یاد دلاتی ہے۔طوالت بیان و انداز فکر کے لحاظ سے بھی ایک بڑی حد تک مماثلت ہے۔اقبال نے حضرت خضر کی زبان سے دنیا و اہل دنیا کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور اختر صاحب نے رات کو 'شخص' بنا کر اپنے خیالات کا آئینہ دار کیا ہے۔یہ تقلید یا تخلیق باعث مسرت ہے۔اختر صاحب کی نظم کئی لحاظ سے قابل قدر ہے، حیات وممات کے ضروری پہلوؤں پر موصوف نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔''[1]

پروفیسر احتشام حسین 'نغمۂ شب' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نغمۂ شب اس حیثیت سے ایک اہم نظم ہے کہ شاعر رات جیسی محبوبہ کا پرستار ہونے کے باوجود قنوطی نہیں ہوا ہے۔''[2]

اختر بستوی کی دوسری طویل نظم 'بحر بیکراں' ہے، جو کتابی شکل میں مکتبۂ دین وادب، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے 1974 میں شائع ہوئی ہے۔پروفیسر محمود الٰہی نے اس نظم کو زندگی اور انسانیت کا رزمیہ کہا ہے۔بحر بیکراں کا موضوع بھی کم وبیش وہی ہے جو 'نغمۂ شب' کا ہے۔موجودہ زمانے میں معاشرے کی صورت حال کا اگر جائزہ لیا جائے، تو ہمیں بے روزگاری، نوجوانوں کا استحصال، ان کی زندگی کو مشکل اور پیچیدہ کر دینے کا رویہ اور ان کے حقوق سلب کر لینے کا رجحان عام نظر آتا ہے۔اس پس منظر میں اگر اختر بستوی کی نظم 'بحر بیکراں' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نظم موجودہ دور کی بہترین ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں کہ اک فنکار ناآسودہ و آشفتہ سر
مثلِ دودِ شمعِ کشتہ پھرتا ہوں دیوانہ وار
دل میں بے چینی، خیال وفکر میں شورش لیے
روح کے تاریک گوشوں میں چھپائے اضطرار
مجھ کو سرگرم سفر رکھتی ہے بے تابی مری
رہ نوردی کا مجھے رہتا ہے سودا صبح وشام
جادہ ومنزل کی جانب ذہن جاتا ہی نہیں
میرے مشرب میں نہیں ہے کوئی شے قید مقام
دوڑتی رہتی ہیں نظریں بھی ہمیشہ چارسو
دیکھتی ہے صحن عالم میں ہر اک منظر نگاہ
دشت ودریا کے مناظر، کوہ وصحرا کا سماں
چشم بینا سب سے رکھتی ہے مسلسل رسم وراہ

اختر بستوی کی نظموں میں حالات وواقعات کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ کسی زمانے یا فرد تک محدود نہیں ہے، ان اشعار میں انھوں نے اس کشمکش کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، جو ایک ہنرمند، باصلاحیت انسان اور اعلیٰ عہدوں پر فائز کم فہم اور موقع پرست منافقین کے مابین مسلسل جاری ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اختر بستوی نے اقبال کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور ان سے نظم نگاری کا سلیقہ سیکھا ہے۔حسن ترتیب، حسن تسلسل اقبال کی نظموں کی جان ہیں۔کچھ ایسا ہی انداز 'بحر بیکراں' میں بھی ملتا ہے۔لیکن اختر بستوی نے اقبال کا اثر قبول کیا ہے، ان کی تقلید نہیں کی ہے اور یہ نہ بھولنا چاہیے کہ تقلید اور اثر پذیری میں بڑا فرق ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اختر بستوی اثر پذیری کو انفرادیت میں تحلیل کر لینے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔اردو میں طویل نظموں کی بڑی کمی ہے۔میں اختر بستوی کی اس کوشش کو ایک اہم اور جرأت مندانہ قدم سے تعبیر کرتا ہوں۔''[3]

اختر بستوی کی مختصر نظموں کا ایک مجموعہ 'اپنے سائے کے سوا' بھی کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔یہ شعری مجموعہ آواز پبلی کیشنز، ریتی کا پُل، گورکھپور سے 1989 میں منظر عام پر آیا۔یہ شعری مجموعہ 1010 مختصر نظموں پر مشتمل ہے۔بعض نظموں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

ظلمت انا، سمندر کی پیاس، جلن باہر جلن اندر، سرد و گرم، اندھا کنواں، اکائی کا نروان، کلنڈر کا خوف، بت شکن کا بت، گناہ کا ماتم، سفید پوشی، افعال کا حاصل، احساس برتری، چہروں کی بے چہرگی، کچی سڑک، زہر مرا اور امرت سب کا وغیرہ۔

ڈاکٹر اختر بستوی کی مختصر نظموں میں خیال کی نادرہ کاری اور انوکھا پن نظر آتا ہے، کہیں کوئی تکرار، پیچیدگی یا الجھاؤ ہے اور نہ ہی غیر ضروری الفاظ کی کثرت اور تراکیب کی بھرمار۔ان نظموں کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ کس قدر وسیع اور گہرا ہے۔اختر بستوی انھیں عناصر کی بنیاد پر اپنی تخلیقات میں خیالات کی نئی نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ان کی نظم 'خواہش نمو' پیش خدمت ہے:

وہ سنگ جس سے میں نے تراشا ہے اک صنم
کہتا ہے ''تم نے مجھ کو ادھورا کیا ہے کیوں؟
تخفیف کر کے میرے مکمل وجود میں
خود اپنے فن کے نقش کو پورا کیا ہے کیوں؟''
کیونکر بتاؤں اس کو کہ فن کار فطرتاً
رکھتا ہے اپنے قلب میں اک خواہش نمود
لازم ہے یہ کہ اس کا وسیلہ بھی ہو کوئی
لاتا ہے اس لیے وہ تصرف میں اک وجود

طویل نظموں کے علاوہ اختر بستوی نے مختصر نظموں کے حوالے سے خوب نام پیدا کیا ان کی مختصر نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کیفی اعظمی لکھتے ہیں:

''اختر صاحب کی یہ نظمیں خیال کی اکائیاں ہیں۔آپ کو کسی بھی نظم میں نہ خیال کی تکرار ملے گی نہ لفظوں اور ترکیبوں کی غیر ضروری کثرت۔آپ جس نظم کو غور سے پڑھیں، آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاعر کے ذہن میں سب سے پہلے ایک خیال ابھرا، پھر اس خیال کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کے لیے شاعر نے بحر اور امیجری کا

انتخاب کیا اور جہاں شاعر نے محسوس کیا کہ بات پوری ہوگئی، شاعر نے نظم وہیں ختم کر دی۔''4

'پیکر خیال' کے نام سے اختر بستوی کا ایک شعری مجموعہ 'مجموعۂ قطعات' مکتبہ دین و ادب، لکھنؤ سے 1970 میں شائع ہوا ہے۔ اختر بستوی کا بیش تر کلام، زندگی کی گہما گہمی اور متنوع جہات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہاں زندگی کے مختلف رنگ و روپ مختلف شکل و صورت میں نظر آتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری زندگی اور موت کا بہترین استعارہ ہے۔

اختر بستوی کے قطعات میں جو معنویت اور فکری پختگی ہے وہ انھیں قطعات نگاری میں اہم مقام عطا کرتی ہے۔ بطور نمونہ بعض قطعات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

آدمی زیست کے ویران نہاں خانوں میں
گھومتا پھرتا ہے یوں لے کے سہارا دل کا
اجنبی شہر میں جیسے کوئی راہی شب کو
پوچھتا پھرتا ہو بچوں سے پتہ منزل کا

مل سکا رہروِ ہستی کو نہ اک پل بھی سکوں
موت ہر لمحہ نگاہوں میں کھٹکتی ہی رہی
مشعلِ عقل بہ ہر گام تھی موجود مگر
زندگی وقت کے صحرا میں بھٹکتی ہی رہی

زیست کے واسطے غم زہرِ ہلاہل ہے مگر
غم اگر غم ہو تو ہر زخم کا مرہم بن جائے
غم کا احساس ہو انساں کو تو کھودے وہ حواس
غم کا عرفاں ہو تو سدّھارتھ سے گوتم بن جائے

ان قطعات میں اختر بستوی نے جس فنی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ درج بالا قطعات میں پہلے قطعہ میں انسان کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے جب انسان زندگی کی تگ و دو میں کامیابی کی امید لے کر دردر بھٹکتا ہے، لیکن اسے کہیں کامیابی نظر نہیں آتی، پھر بھی وہ اپنی منزل کی تلاش میں مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اس صورت حال کو اختر بستوی نے 'زیست کے ویران نہاں خانوں' 'اجنبی شہر' اور 'راہی شب' جیسی علامتوں سے تشبیہ دے کر جو بامعنی کیفیت پیدا کی ہے وہ شعر کی عظمت کو آسمان کی بلندی عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

دوسرے قطعہ میں اختر بستوی نے زندگی کی صحرا نوردی اور تمام فہم و ادراک کے باوجود انسان زندگی کی بھول بھلیا میں جس طرح گم ہوجاتا ہے، اس کی تصویر پیش کی ہے۔ اس قطعہ میں الفاظ کے انتخاب میں انھوں نے بہت مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ 'رہرو ہستی' 'مشعل عقل' اور 'زندگی کا صحرا میں بھٹکنا' ایسے استعاراتی الفاظ کا استعمال اس قطعے کی بلندی میں یقیناً اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تیسرا قطعہ بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں زندگی اور غم جیسے دو لازم و ملزوم عناصر کا بیان بہت ہی حکیمانہ انداز میں ہوا ہے۔ زندگی کا غم سے یقیناً مضبوط رشتہ ہے، یہی رشتہ جب مثبت پہلو اختیار کرتا ہے تو زندگی کے لیے غم مرہم ہوجاتا ہے۔ لیکن جب یہی غم اگر انسان کی زندگی میں منفی کردار ادا کرتا ہے، تو زندگی سے زیادہ انسان کو موت عزیز ہوجاتی ہے۔ مذکورہ قطعہ میں شاعر نے غم کے مثبت پہلو کا بیان جس خوبصورتی سے کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

تمہیدی گفتگو میں اس بات کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ اختر بستوی کی غزلیں بڑی تعداد میں ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی غزلوں کا مجموعہ 'غزالاں تم تو واقف ہو...' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مجموعہ اختر بستوی کے انتقال کے آٹھ سال بعد محمد علی صدیقی (شیدا بستوی) نے مرتب کیا ہے۔ اس کی طباعت، غازی آفسیٹ پریس محلّہ پچپڑیا، ضلع بستی سے 2006 میں عمل میں آئی ہے۔

ڈاکٹر اختر بستوی کی غزلوں میں معاملات حسن و عشق کے علاوہ دنیا جہان کے موضوعات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے یہاں فکر و فلسفہ بھی ہے اور تاریخی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی مضامین و موضوعات کی فراوانی بھی ہے۔ اختر بستوی کے کلام پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد امین لکھتے ہیں:

''اختر بستوی کے اس مجموعے میں فلسفیانہ حقائق کی گہرائی، سماجی اور معاشرتی تقاضوں کا احساس، تاریخی واقعات کے ساتھ ماحول کی عکاسی اور جمالیاتی پہلو ہے۔ انتخاب الفاظ میں مہارت، اسلوب میں جدت اور طرز ادا میں ندرت ہے... غزل کے موضوعات زندگی کی طرح وسیع، ہمہ گیر اور متنوع ہیں۔ اس نے صوفیوں کے حلقوں میں وجد و کیف کی بارش کی ہے تو رندوں کی محفلوں میں غزل نے نشاط و طرب کا رنگ جمایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں سائنسی اور آفاقی حقیقتوں کا اعتراف بھی ہے اور یہ سب کچھ غزل بلکہ تغزل کے پیرائے میں ہے۔''5

اختر بستوی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی غزلوں کا مطالعہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ان کا شعری ذوق بڑی آب و تاب کے ساتھ روشن نظر آتا ہے، اس لیے ان کی شاعری کو مزید واضح انداز میں پیش کرنے اور ان کی فنی خوبیوں سے پردہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں ہم اختر بستوی کے بعض اشعار نقل کریں گے جس کی روشنی میں قارئین اندازہ لگا سکیں گے کہ موجودہ زمانے میں ان کے کلام کی افادیت اور اہمیت کس قدر ہم آہنگ ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اختر مجھے بھائے گا کبھی شہر نہ دن کا
وحشت مری ڈھونڈھے ہے سدا رات کا جنگل
کیوں میں نے سجا رکھا ہے آئینوں کا بازار
اس سمت نہ آئے گا کبھی کوئی خریدار
ہوں میں اپنی ذات کے گھیرے میں پابند مقام
آسکوں اس سے اگر باہر تو عالم گیر ہوں
نالۂ اقبال سمجھے ہیں مجھے اہل ادب
میں مگر اختر جو سچ پوچھو تو آہ میر ہوں
خوف حالات کو اس کا سمجھوں سبب یا اسے مصلحت کا نتیجہ کہوں!
کون جانے ہوئی کیوں یہ صورت عیاں لوگ دیکھا کیے شہر جلتا رہا
پا سکے گا چین دل کا، وہ زمانے میں کہاں
ہو نہ جس کے واسطے جائے سکوں گھر رات میں

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اختر بستوی کا شمار ہمارے عہد کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی معنویت ہر زمانے میں قائم رہے گی۔ شعری کارناموں کے علاوہ اختر بستوی نے دیگر میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، انھیں بھی منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ اہل علم ان کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ لگا سکیں اور حسب ضرورت استفادہ کر سکیں۔

حواشی

1. نغمۂ شب (ایک طویل نظم)، اختر بستوی، شب خون کتاب گھر، الہ آباد، 1969، ص 5
2. پیکر خیال (مجموعۂ قطعات)، اختر بستوی، مکتبۂ دین و ادب، لکھنؤ 1970، ص 89
3. بحر بیکراں (ایک طویل نظم)، اختر بستوی، مکتبۂ دین و ادب، لکھنؤ، 1974، ص 7
4. اپنے سائے کے سوا، اختر بستوی، آواز پبلی کیشنز، ریتی کا پل، گورکھپور، 1989، ص 6
5. غزالاں تم تو واقف ہو... (غزلوں کا مجموعہ)، اختر بستوی مرتبہ محمد علی صدیقی غازی آفسیٹ پریس محلّہ پچپڑیا، بستی 2006، ص 11,12

■

Dr. Musheer Ahmad
Assistant Professor, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9560786298

محمد سعید الدین فرخ

مولوی محمد شرف الدین

مولوی شرف الدین عثمانیہ یونیورسٹی کے ان ہونہار سپوتوں میں سے تھے جنھوں نے حیدر آباد کی معاشی ترقی میں سر گرم حصہ لیا۔ وہ نہ صرف کل ہند صنعتی نمائش حیدر آباد کے بانیوں میں سے ہیں بلکہ مسلسل نو سال تک مجلس نمائش کے معتمد بھی منتخب ہوتے رہے۔ ان کی محنت لگن، انتھک کوششوں اور بے لوث خدمات کی بدولت صنعتی نمائش وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

مولوی شرف الدین محمد عبد القادر کا تعلق ایسے عربی النسل خاندان سے ہے جو عرب سے آکر ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوئے۔ جنوبی ہند میں اس خاندان کی وجاہت مشہور ہے۔ اس خاندان کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ کم از کم پندرہ پشت سے مسلسل علمی خدمت میں مصروف رہا ہے۔

مولوی شرف الدین محمد عبد القادر کی پیدائش 18 جمادی الثانی 1330 یوم دوشنبہ 1912، 3 ساعت شب کو حضرت پڑنانا مولوی حسین عطاء اللہ صاحب (فصلی) مرحوم ومغفور کے عالیشان بنگلے حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد حاجی قادر مرتضیٰ حسین صاحب محکمہ مال میں تحصیلدار تھے۔ ان کے تین صاحب زادے تھے۔ بڑے برہان الدین حسین مرحوم (نائب ناظم زراعت)، دوسرے مولوی شرف الدین اور تیسرے ڈاکٹر محمد یوسف الدین مرحوم (سابق صدر شعبہ مذہب وثقافت عثمانیہ یونیورسٹی)۔ محمد شرف الدین کے والد حاجی قاضی مرتضیٰ حسین کی رفیقہ حیات امتہ الغنی نور النساء مولوی عبد القادر صاحب رجسٹرار بلدہ کی صاحبزادی تھیں۔ ترپ بازار میں ان کا قیام تھا۔

مولوی محمد شرف الدین کی ابتدائی تعلیم اشرف المدارس میں ہوئی پھر دار العلوم سے انھوں نے 1937 میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ 9 مارچ 1939 میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے معاشیات میں بی۔اے کیا۔ مولوی محمد شرف الدین صاحب کی شادی اپنے بڑے ماموں مولوی قطب الدین محمد عبد الرؤف صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے 1350ھ میں ہوئی۔

حیدر آباد دکن میں کوئی صنعتی نمائش کا نام لیتا ہے تو مولوی شرف الدین آنکھوں میں پھر جاتے ہیں وہ اس کے بانیوں میں سے بھی تھے اور مسلسل نو برس تک اس کے اعزازی معتمد بھی رہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں 1948 میں حیدر آباد کی طرف سے انھیں 'تمغہ خسرو دکن' دیا گیا۔ اس ایک تمغے سے ان کی خدمات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ مولوی شرف الدین محمد انجمن طیلسانین کے ابتدائی اراکین میں سے تھے۔

مولوی محمد شرف الدین صاحب ایک زمانے میں باغ عامہ اور انجمن طیلسانین کے دفتر میں ہی نظر آتے تھے۔

نمائش کی جگہ جب باغ عامہ سے نامپلی روڈ پر منتقل ہوئی پھر وہ وہاں دیکھے جانے لگے۔ یہ ایسے لوگوں میں سے تھے جن کی زندگیوں میں تفریح کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کام ہی سب کچھ ہوتا ہے اور کام ہی ان کی تفریح بن جاتا ہے۔

اس وقت جامعہ عثمانیہ اڈکمیٹ، کیمپس میں چلی گئی تھی اور وہاں عارضی عمارتوں میں تمام شعبے دفاتر اور اقامت خانے بھی منتقل کردیے گئے تھے۔ 1937 میں مولوی شرف الدین بی اے میں آئے تو اسی سال معاشیات کے نصاب کو بڑھا کر اسے ایک مستقل شعبہ بنادیا گیا ورنہ اس سے پہلے اس کی تعلیم ایک جزوی مضمون کی حیثیت سے ہوتی تھی اسے مستقل شعبہ بنانے میں پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔

شرف الدین صاحب شعبہ معاشیات کی پہلی کھیپ کے گریجویٹ ہیں۔ بی اے کر کے محکمہ صنعت وحرفت میں ملازم ہوگئے۔ ان کی زندگی محنت سے عبارت تھی آخر اس انتھک محنت نے رنگ دکھایا۔

مولوی شرف الدین محمد عبدالقادر جو علمی دنیا میں محمد شرف الدین کے نام سے مشہور ہیں حیدرآباد کے ایک ایسے علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کے افراد صدیوں سے دکن کے مختلف اقطاع عالم میں علم وفضل کے علمبردار رہے ہیں اور خصوصاً حیدرآباد کی تعلیمی اصلاحی، سماجی اور معاشی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی گرمجوشی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔

مولوی شرف الدین عثمانیہ یونیورسٹی کے ان ہونہار سپوتوں میں سے تھے جنھوں نے حیدرآباد کی معاشی ترقی میں سرگرم حصہ لیا۔ وہ نہ صرف کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد کے بانیوں میں سے ہیں بلکہ مسلسل نو سال تک مجلس نمائش کے معتمد بھی منتخب ہوتے رہے۔ان کی محنت لگن، انتھک کوششوں اور بے لوث خدمات کی بدولت صنعتی نمائش وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

شرف الدین صاحب (مرحوم) کو ملک کی صنعت و حرفت خصوصاً دیہی اور گھریلو صنعتوں سے گہری دلچسپی تھی۔ اس غرض سے انھوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف شہروں کا بلکہ بیرون ہند مختلف مما لک کا دورہ کر کے صنعت وحرفت اور تجارت کے متعلق گہری معلومات حاصل کی تھیں۔ انھوں نے متعدد تحقیقاتی مضامین لکھے اور کئی کتابیں شائع کیں۔ ہندوستانی معیشت پر ان کی گراں قدر کتاب 'ہندوستانی معاشیات کے مبادی' بڑی مقبول ہوئی اور 'اسلامی دنیا کے معاشی حالات' بھی ان کا ایک علمی کارنامہ ہے۔انتقال سے پیشتر وہ 'دنیائے صنعت وتجارت' کی تکمیل میں مصروف تھے۔وہ مجلّہ طیلسانین' ماہ نامہ روح ترقی اور ماہ نامہ شہاب کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے۔مجلّہ عثمانیہ، ماہ نامہ آجکل سب رس، حسن کار وغیرہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ان رسالوں کے علاوہ وہ ملک کے ممتاز اخباروں جیسے روزنامہ صحیفہ، مشیر دکن، رہبر دکن، میزان، خلیق اور سلطنت وغیرہ میں بھی لکھتے رہتے تھے۔عرصہ تک نمائش بلٹن کے مدیر بھی رہے۔اپنی کتابوں، مقالوں اور 'نمائش بلٹن' کے ذریعے انھوں نے ملکی مصنوعات کی ترقی اور ان کی تشہیر میں گراں قدر حصہ لیا۔ جس کی بدولت کریم نگر کے چاندی کے سامان، بیدر کے بیدری کا سامان، اورنگ آباد کے ہمرو، محبوب نگر کے بلانکٹ (کمبل) ورنگل کی ریشمی کھادی اور قالین، نرمل کے کھلونوں اور سنگاریڈی کی ریشم کی ساڑیوں کی شہرت یورپ امریکہ سے گذر کر سارے اقوام عالم میں ہونے لگی تھی اور آزاد ہند کی تجارت خارجہ میں ان مصنوعات کا بھی بڑا حصہ ہے۔مختصر یہ کہ مرحوم کی بدولت قدیم ہندوستانی صنعتیں جو مٹ رہی تھیں نئی زندگیاں پالی اور جدید صنعتیں رائج ہوئیں۔

محمد شرف الدین دل کی بیماری نے کام تمام کیا عین نوجوانی میں ابھی بس 42 برس کی عمر تھی کہ 12 جمادی الثانی 1373ھ 15 فروری 1954 کو انتقال ہوا۔حیدرآباد کے مشہور قبرستان درگاہ یوسفینؒ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ جبکہ وہ محکمہ صنعت وحرفت میں اسسٹنٹ کمرشیل اینڈ انڈسٹریل انٹیلیجنس آفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ اُس وقت ان کے فرزند محمد افضل الدین اقبال گیارہ سال کے تھے اور ان کی چھوٹی دختر چھ ماہ کی تھیں۔دراصل ان کے چار فرزند دو دختر تھے۔اب ان کی اولاد میں پروفیسر افضل الدین اقبال اور محمد امجد الدین کے علاوہ چھوٹی دختر مریم مہر ہلال کا انتقال ہو چکا ہے۔محمد وقار الدین' محمد اظہر الدین اور ایک دختر باحیات ہے۔ پروفیسر محمد افضل الدین نے اپنے والد محمد شرف الدین عبدالقادر کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

''افسوس ہے کہ بے وقت موت نے ہم سے ایک مہربان باپ بہترین ادیب اور محقق کو چھین لیا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔

وہ کام کر دکھائے جو کرنے کے دن نہ تھے
او مرنے والے یہ ترے مرنے کے دن نہ تھے
آج آنکھوں میں کیوں خون کے آنسو آئے
کیوں سانس کے ساتھ غم کا فسانہ آیا
آہ! آج اٹھ گیا باپ کا سایہ میرے سر سے
کتنا بے وقت مصیبت کا زمانہ آیا

ذیل میں مولوی شرف الدین صاحب کی مستقل کتابوں کا ایک اجمالی تعارف پیش ہے۔

ہندوستانی معاشیات کے مبادی: یہ کتاب اولاً مجلّہ طیلسانین میں قسط وار شائع ہوئی پھر کتابی صورت میں اس کے دو ایڈیشن طبع ہوئے۔ یہ کتاب نصاب میں شامل تھی۔سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کے معاشی حالات کا بھی تذکرہ ہے کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات سے لبریز ہے اس کا پیش لفظ پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب کا تحریر کردہ ہے وہ رقمطراز ہیں 'ہندوستانی معاشیات کے مبادی میرے عزیز شاگرد شرف الدین صاحب بی اے عثمانیہ' کی تالیف ہے۔ شرف الدین صاحب علاوہ اپنی سرکاری ملازمت کے گذشتہ سات سال سے مجلس نمائش معاشی کمیٹی حیدرآباد کے اعزازی معتمدی کا کام سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ باوجود ان مصروفیتوں کے اس علمی خدمت کے لیے بھی وقت نکال سکے۔اردو زبان میں عملی معاشیات پر یہ عام فہم کتاب اس بات کی مستحق ہے کہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے یقین ہے کہ وہ اردو داں طبقے کے لیے عموماً اور معاشیات کے طلبہ کے لیے خصوصاً بہت مفید ثابت ہوگی۔مرحوم شرف الدین کے دوسرے استاد پروفیسر میر محمود علی نے لکھا ہے''یہ کتاب نہ صرف اردو داں پبلک کے لیے مفید ہے بلکہ امتحانی نظر سے طلبا اس سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔'' اس تالیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حیدرآباد کا جا بجا حوالہ دیتے ہوئے معاشیات ہند کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب 1940 میں شائع ہوئی اور رسالہ جامعہ، رسالہ سب رس، رسالہ ایوان اردو، رسالہ معارف، تجارتی دنیا، میزان صحیفہ، حریت وغیرہ میں بھی اس کتاب کے متعلق بہترین تبصرے 1940 میں شائع ہوئے۔

موضع پھول مری کی معاشی تحقیق: یہ کتاب مصنف نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر میکنزی پرائز کے لیے لکھی تھی۔اس میں تعلقہ اورنگ آباد کے ایک خوش حال موضع پھول مری کی معاشی تحقیق بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب اولاً ماہ نامہ شہاب حیدرآباد میں قسط وار پہلی 1946 شائع ہوئی۔دوسرا ایڈیشن 2021 میں شائع ہوا۔

عثمانین کے تراجم وتالیفات: جامعہ عثمانیہ کی بدولت اس کے سند یافتہ طلبہ علمی، ادبی، تاریخی اور سائنسی کتابیں مرتب کرنے لگے تھے ان کی نشاندہی کے لیے مولوی شرف الدین صاحب نے 'عثمانین کے تراجم وتالیفات' کے نام سے ایک اچھی مختصر کتاب شائع کی۔ اس میں 269 عثمانین 563 تالیف وتراجم کے نام دیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ خود ان کا اور دیگر بلند پایہ اصحاب جیسے پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور بیرسٹر میر اکبر علی خان کے نوٹ بھی شائع کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر رضی الدین صدیقی رقم طراز ہیں:

''زیر نظر مجموعہ تحریروں تالیفوں اور تصنیفوں کا ہے جو عثمانین کے قلم سے نکلی ہیں اس کی تدوین مولوی شرف الدین صاحب نے کی ہے جو عثمانین کے طیلسانی ہیں اور ملک کے مخلص کارکنوں یعنی مولوی صفی الدین مرحوم اور مولوی محمد مرتضٰی (بانی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس) کے خاندان سے ہیں۔شرف الدین صاحب نے گذشتہ پانچ چھ سال سے مجلس نمائش کے معتمدی اعزازی کے طور پر جس ایثار اور جانفشانی کے ساتھ انجام دی ہے، وہ آپ کے خاندان کی روایات کے ہر طرح مطابق ہے۔ان کی

ہمت کی داد دینی چاہیے کہ سرکاری ملازمت اور مجلس نمائش کی انتہائی مصروفیت کے باوجود انھوں نے اکثر و بیشتر عثمانین کی کتابوں، مقالات، مضامین اور نظموں وغیرہ کی ایک فہرست تیار کر ڈالی اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ جس شخص کو بہت زیادہ کام رہتے ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ وقت ایک آدھ کام کے لیے نکال لیتا ہے اور اس کام کو بھی کر ڈالتا ہے لیکن جنھیں فرصت رہتی ہے ان بیچاروں کو کبھی کام کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ بہرحال تمام عثمانین شرف الدین صاحب کے مرہون منت ہیں کہ انھوں نے اس فہرست کو مرتب کیا جس سے وقت ضرورت کام لیا جاسکتا ہے۔''

تحفۂ نمائش: نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کے موقع پر حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی رونق افروزی اراکین مجلس نمائش کی سرفرازی کی موجب رہی۔ اس کتاب میں مولوی محمد شرف الدین نے ہر سال کے وقائع تشریفات شاہانہ کو بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ مجلس نمائش نے بڑے اہتمام سے اس مصور تحفۂ نمائش کو 1304ف شائع کیا تھا۔

دنیائے نمائش: اس کتاب میں نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کے سات سال کا تفصیلی تذکرہ اور آٹھویں نمائش کے ہر اسٹال کی تفصیل درج ہے۔ کتاب نہایت مفید ہے۔ صناعوں کے اور ہر اسٹال کی رہنمائی اس کتاب سے ہوجاتی ہے۔ یہ کتاب بھی 1304ف میں شائع ہوئی۔

مملکت آصفیہ کی صنعتی ڈائرکٹری: اس ڈائرکٹری میں مملکت آصفیہ کے متعدد صناعوں کے متعلق ضروری تفصیلات دی گئی ہیں۔ صنعتی ڈائرکٹری کی ترتیب وتدوین کے لیے نواب مہدی نواز جنگ معتمد صنعت وحرفت سرکار عالی کا اصرار تھا چنانچہ انھوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ نمائش کا 'تماشہ' سال میں صرف ایک مرتبہ منعقد ہوتا ہے لیکن یہ ڈائرکٹری ایک 'سدا بہار' نمائش کے مماثل ہے۔ مجلس نمائش کی جانب سے شرف الدین صاحب کی مرتبہ صنعتی ڈائرکٹری 1352 ف اور 1355ف میں شائع کی گئی تھی۔ جو بڑی مقبول ہوئی۔

اسلامی دنیا کے معاشی حالات: شرف الدین صاحب نے اسلامک پبلی کیشنز سوسائٹی حیدرآباد کے ایما پر 'اسلامی دنیا کے معاشی حالات' کی تالیف فرمائی تھی اس میں جملہ اسلامی ملکوں کی نسبت مختصراً لیکن مکمل طور پر بالکل تازہ معاشی حالات کا جائزہ لیا گیا تھا۔

قرآنی صنعتیں: شرف الدین صاحب نے قرآن مجید کی ذکر کردہ صنعتوں پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا تھا جو ان کے انتقال کے بعد 1995 میں شائع ہوا تھا اور دوسری بار 2008 میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ زیر نظر اشاعت ہے۔

مضامین محبوب: 'مضامین محبوب' مولوی شرف الدین محمد عبدالقادر محبوب کے مضامین کا مجموعہ ہے، نے گویا ایک خوبصورت گلدستے میں جمع کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وقت سمٹ گیا ہے۔ یہ مضامین گو ماضی میں لکھے گئے ہیں لیکن الفاظ کی لفاظیت، ترتیب، بیان پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آج ہی لکھے گئے ہیں۔ مضمون نگار بہت سارے ہوتے ہیں لیکن اتنی جانفشانی اور محبت، تحقیق اور حقیقت پسندی سے مضمون لکھتے ہوئے میں پہلی بار مولوی شرف الدین محمد عبدالقادر کی کاوش کو پڑھ رہا ہوں کوئی مضمون سطحی یا اندازوں کی بنیاد پر نہیں ہے۔ ہر مضمون پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبوب صاحب اس مضمون کو ایک پروجیکٹ کے طور پر چیلنج لیا اور پھر اس پروجیکٹ کو بحسن خوبی انجام کو پہنچایا ان مضامین کے مطالعے سے مضمون نگار کی گہری سوچ اپنے کام سے لگن اور احساس جواب دہی عیاں ہوتی ہے۔ اس کتاب کا ہر ہر مضمون اپنی جگہ ایک شاہکار ہے۔ جب اپنی خود کی زندگی کی کہانی دیکھیے تو اپنی کسی خامی کو چھپانے کی کوتاہی نہیں کرتے بلکہ انتہائی بے باکی سے لفظ بہ لفظ اپنی چار سال کی عمر کے بعد ہی یادداشت شروع ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ ساری چیزیں لکھ دیے۔ جب اپنے خاندان کی عمرانی زندگی کی خصوصیات بیان کیے تو کئی مرتبہ راز آشکارا کیے جو بہت سارے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

> **شرف الدین صاحب نے گذشتہ پانچ چھ سال سے مجلس نمائش کی معتمدی اعزازی کے طور پر جس ایثار اور جانفشانی کے ساتھ انجام دی ہے، وہ آپ کے خاندان کی روایات کے مطابق ہے۔ ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ سرکاری ملازمت اور مجلس نمائش کی انتہائی مصروفیت کے باوجود انھوں نے اکثر و بیشتر عثمانین کی کتابوں، مقالات، مضامین اور نظموں وغیرہ کی ایک فہرست تیار کر ڈالی اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔**

اکیس سال کی کم عمر میں جب شمالی ہند اور کشمیر وغیرہ سیاحت پر گئے تو اس کو جس انداز سے بیان و پیش کیا کہ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس سفر میں محبوب صاحب کا ہمسفر تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا اس میں احاطہ کیا گیا۔ ارتقائے انسان پر معاشی اور نفسیاتی اثرات کو ایسی خوبی سے پیش کیا کہ یہ مضمون ایک دستاویز کی شکل بن گیا۔ ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم کا جو نقشہ کھینچا وہ اتنا مدلل ہے کہ شاید اتنی واقفیت ہندو دھرم کے بھی بہت سارے لوگوں کو نہیں ہوگی۔ 1935 میں جب لنکا گئے تو اس سفر اور وہاں کے حالات لفظ بہ لفظ بیان کیے۔ کشتی، پانی وہاں کے لوگوں کا رہن سہن آنکھوں دیکھا بیان قلمبند کر دیا اور پڑھنے والا یہ تاثر لے کر اٹھتا ہے کہ وہ خود لنکا کی سیر کر کے واپس آیا ہے۔ سرپور پیپر ملز پر مضمون لکھا تو اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسی مل کا کوئی ملازم اپنی ساری زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کر رہا ہو۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، مولوی محمد فاروق، محمد سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ کی جب سوانح حیات نواب علی نواز جنگ بہادر، نواب عمادالملک بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر اور آخر میں مملکت آصفیہ میں امداد باہمی کی بلاسودی انجمنوں کے ساتھ پیش کیے تو ان کو امر کر دیا۔ یہ کتاب 2021 میں شائع ہوئی۔

حیدرآبادی صنعتی نمائش کی تاریخ: حیدرآبادی صنعتی نمائش (مملکت آصفیہ میں نمائش کی ابتدا اور ان کی ترقی) کتاب میں سلطنت آصفیہ کی جانب سے نمائش کی ابتدا، نمائش کے لیے کیے گئے اقدامات، کمیٹی کے ممبران کی تفصیلات، صنعتی نمائش، حیدرآبادی گھریلو صنعتوں وغیرہ پر مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ دکن کے مشہور و معروف محققین و ادیبوں محمد شرف الدین (سابق معتمد صنعتی نمائش)، مولوی نصیر الدین ہاشمی، حافظ محمد مظہر، حفیظ جمال، ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال اور دیگر کے نمائش کی تاریخ پر اہم مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں نمائش کے متعلق حکمنامہ کے خطوط اور نمائش کے متعلق اہم تصاویر شامل ہیں۔ محمد شرف الدین نے کتاب میں اپنے مختلف مضامین کے ذریعے نمائش کی تاریخ، اس کے مقصد قیام اور دیگر تفصیلات پر جامع روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب 2023 میں شائع ہوئی۔

■

Mohammad Sayeeduddin Farrukh
11-3-855, New Mallepally,
Hyderabad -500 001 (T.S.)
Mobile: 7893573855
E-mail Id: mohdfarrukh77@gmail.com

اثر انصاری کے فکر وفن کا گراف

رفیق احمد

بھول جائے گا زمانہ ہم کو یہ ممکن نہیں
ہم نہیں ہوں گے ہماری شاعری رہ جائے گی
(منور انجم)

علمی وادبی اور شعر وشاعری کی دنیا میں شہر ہنروراں مئوناتھ بھنجن کو متعارف کرنے والوں کی فہرست میں محترم فضا ابن فیضی کے بعد ایک اہم گراں قدر اور قابل ذکر نام اثر انصاری صاحب کا ہے جن کی علمی وادبی اور شعری وتنقیدی خدمات ناقابل فراموش ہیں، آپ ایک ایسے کثیر الجہات فنکار تھے جن کی علمی وفنی بصیرت، ناقدانہ شعور اور شعری ونثری خدمات کا اعتراف ہمارے عہد کے تدریسی نقادوں نے اب تک فراخ دلی سے نہیں کیا ہے۔ جن کی غزل گوئی کے بارے میں نامور شاعر رضا نقوی واہی کا خیال ہے کہ:

''اگر پروفیسر کلیم الدین احمد نے اثر انصاری کی غزلوں کا مطالعہ اپنی زندگی میں کرلیا ہوتا تو انہیں غزل کو 'نیم وحشی صنف سخن' کہنے میں تامل ہوتا۔''

اردو شعر وادب خصوصاً غزل کے حوالے سے محترم اثر انصاری کی ہشت پہلو شخصیت محتاج تعارف نہیں آپ نے اردو شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے حمدیہ ونعتیہ شاعری، نظم نگاری اور غزل گوئی میں آپ کو قدرت کاملہ حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر انیس ادیب:

''یہ ایک عام خیال ہے کہ اثر صاحب کی زندگی بڑی سادہ لیکن ان کی شاعری بڑی رنگین ہے، اثر انصاری کی زندگی اور ان کے قول وفعل میں کوئی تصنع اور تضاد نہیں ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔'' مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دوسروں کو میری شخصیت کا اندازہ نہ تھا
میرے چہرے پر تکلف کا کبھی غازہ نہ تھا

میرا ظاہر میرا باطن ایک ہے
ڈھنگ جینے کے مجھے آئے نہیں

تجھ سے نہ مل سکا مگر اتنا ضرور ہے
دیکھا ہے میں نے تجھ کو غزل کے لباس میں

ابوبکر اثر انصاری کی علمی وادبی شخصیت دیار فضا اور اہل مئو کے لیے ایک قیمتی نگینہ تھی جس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو علمی وادبی اور تصنیفی کاموں سے جڑے ہوئے ہوں یا ان سے استفادہ کیا ہو آپ نے بلامبالغہ شہر ہنروراں مئوناتھ بھنجن کے نو آموز قلم کاروں کی علمی وادبی اور شعری رہنمائی میں جو گراں قدر اور قابل تعریف رول ادا کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں، تازہ واردان ادب اور نو آموز شعرا کی اصلاح دل کھول کر کرتے تھے اس لحاظ سے آپ کا شمار شعر وشاعری کے قافلے میں استاذ شعرا میں ہوتا ہے، علمی وادبی اور سیاسی وسماجی حلقوں میں آپ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اثر صاحب کی حیات وشاعری اور ان کے فکر وفن پر اب تک چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں نامور ادیب اور صحافی محترم ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''اثر انصاری فکر وفن کے آئینے میں'' کو اولیت کا درجہ حاصل ہے مگر افسوس کہ اس میں سنہ اشاعت جولائی 1988 درج ہے جو بہر حال غلط ہے یہ کتاب 1998 میں شائع ہوئی تھی، دوسری کتاب 'اثر انصاری حیات اور

خدمات' کے نام سے 2007 میں شائع ہوئی جو ڈاکٹر صاحب کی Ph.D کا تحقیقی مقالہ ہے، تیسری کتاب 'اثر انصاری پر چند تحریریں' کے نام سے 2011 میں شائع ہوئی جس کے مرتب ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ہیں۔ چوتھی کتاب 'اثر انصاری شخصیت اور شاعری' کے نام سے 2015 میں شائع ہوئی یہ کتاب ہمارے مخلص شاگرد ڈاکٹر محمد زبیر کی ایم فل کا مقالہ ہے جسے انھوں نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی میں پروفیسر صاحب علی کی نگرانی میں لکھا ہے یہ تحقیقی مقالہ کافی عمدہ اور جامع ہے۔

اثر انصاری کے فکر وفن پر اب تک جو تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں ان کے مطالعے کے بعد ہمارے لیے یہ فیصلہ ذرا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ غزل کے بڑے شاعر تھے یا نظم کے مجموعی طور پر اگر غیر جانبداری سے ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فانی اور فراق گورکھپوری کے بعد اردو غزل کے قافلے کے ایسے شاعر تھے جن کی یاسیت اور قنوطیت بھری زندگی اور شاعری کو موج تبسم کبھی شاداب نہ کر سکی۔ اثر انصاری اپنے اولین شعری مجموعہ 'کم وکیف' ص6 کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

''بچپن سے جوانی کے آغاز تک تعلیم وتربیت کے حسین وزرنگار شب وروز آنکھ جھپکتے ختم ہو گئے، فکر وعمل کی دنیا میں قدم رکھا تو غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کو بھی گلے لگانا پڑا، نامساعد حالات کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور مجھے کہنا پڑا۔

ملی وہ زیست کہ جس میں خوشی کا نام نہیں
سکوں کی صبح نہیں عافیت کی شام نہیں

اثر صاحب کی زندگی صحیح معنوں میں نامور شاعر شمیم کرہانی کے اس شعر کی تصویر کشی کرتی ہے۔

غم جاناں، غم دوراں، غم منزل، غم راہ
کتنے غم زیست کے ہمراہ چلا کرتے ہیں

ان کی غزلوں میں غنائیت اور موسیقیت کے ساتھ زبان وبیان کی دلکشی ولطافت پائی جاتی ہے وہ اردو غزل کے ایک ایسے لفظ شناس شاعر ہیں جن کے یہاں زندگی کی ترجمانی بڑے سلیقے اور ہنر کے ساتھ ہوئی ہے مزاج کی سادگی نے ان کو تکلفات سے کوسوں دور رکھا ہے ان کی غزلیں حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ مثلاً یہ اشعار۔

ابھی تو آئے ہو، بیٹھو ذرا، چلے جانا
لگے گی دیر مجھے حال دل سنانے میں
زندگی کے میلے میں مجھ کو ڈھونڈنے والے
رہ گزار ہستی کا گمشدہ نشاں ہوں میں
زمانہ ہو گیا بچھڑے ہوئے مگر اب تک
تمھاری یاد دعائے سحر میں رکھتا ہوں
اپنی غزلوں کو نیا انداز دینے کے لیے
میں روایت کی حسیں قدریں مٹا سکتا نہیں
غزل ثقافت و تہذیب کا حسیں سنگم
روایتوں میں بھی جدت ضرور چاہیے ہے

اثر انصاری کی غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظموں میں لہجے کی متانت اور سنجیدگی میں کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں احتجاجی اور انقلابی لہجے کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی نظموں میں احتجاجی لب و لہجے کا استعمال کیا ہو اور یہ رویہ میرے خیال میں ان کی نظم نگاری کے لیے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکا اور ان کی نظمیں قارئین کے نرم و نازک مزاج پر احتجاجی لہجے کی وجہ سے دیرپا اثرات چھوڑنے سے قاصر رہیں۔ ان کی شخصی نظمیں اس سے الگ ہیں جو بہر حال قابل تعریف ہیں۔ اثر انصاری صاحب مولانا ابوالکلام آزاد سے حد درجہ متاثر تھے ان کے اسلوب اور طرز تحریر کی کچھ جھلک اثر صاحب کی نثری تصانیف میں نظر آتی ہے۔

اثر صاحب کو نثر و نظم دونوں پر قدرت کاملہ حاصل تھی وہ اردو کے قادر الکلام شاعر تھے جن کے پانچ شعری مجموعے: کم وکیف (1974)، افکار پریشاں (1980)، زبان غزل (1987)، آئینہ در آئینہ (1992)، پیراہن گل (1997) منظر عام پر آچکے ہیں۔ بقول اثر انصاری 1996 میں 'نوائے سروش' کے نام سے حمد ونعت کا ایک مجموعہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے ترتیب دیا ہے جو 2001 میں شائع ہوا ہے۔ اثر انصاری کے فکر وفن کے تعلق سے یہاں یہ بات انتہائی قابل ذکر ہے کہ علمی وادبی دنیا میں آپ کا شمار ایک نامور انشا پرداز اور عمدہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے مگر زیادہ تر دانشوران اردو نے آپ کی علمی شخصیت کے ایک ہی پہلو یعنی شعری خدمات پر توجہ مرکوز کی ہے جبکہ آپ کی نثر نگاری پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مئو ناتھ بھنجن کے علمی وادبی منظر نامے کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہاں نثر نگاروں کے مقابلے میں شعرا حضرات کی تعداد ہمیشہ غالب رہی ہے اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو زبان وادب کے نثری قافلے میں اثر صاحب کو اولیت اور فوقیت حاصل ہے وہ نکھرا اور سلجھا ہوا ادبی ذوق رکھتے تھے ان کی نثر نگاری میں مبالغہ آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی جلوہ آرائی ہے ان کے اسلوب میں انشا پردازی اور دلکشی ورعنائی پائی جاتی ہے اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب 'سفرحج کے شب نثری وروز' کو پیش کیا جا سکتا ہے یہ سفرنامہ 1980 میں منظر عام پر آیا تھا۔ دیار فضا کی علمی وادبی اور شعری تاریخ

ابوبکر اثر انصاری کی علمی وادبی شخصیت دیار فضا اور اہل مئو کے لیے ایک قیمتی نگینہ تھی جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو علمی وادبی اور تصنیفی کاموں سے جڑے ہوئے ہوں یا ان سے استفادہ کیا ہو آپ نے بلا مبالغہ شہر ہنروراں مئو ناتھ بھنجن کے نو آموز قلم کاروں کی علمی وادبی اور شعری رہنمائی میں جو گراں قدر اور قابل تعریف رول ادا کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں، تازہ واردان ادب اور نو آموز شعرا کی اصلاح دل کھول کر کرتے تھے اس لحاظ سے آپ کا شمار شعر و شاعری کے قافلے میں استاذ شعرا میں ہوتا ہے، علمی وادبی اور سیاسی وسماجی حلقوں میں آپ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

کو اثر انصاری نے اپنی کتاب 'تذکرہ سخن ورانِ مئو' میں کافی دلکش اسلوب میں لکھا ہے مئو کی ادبی تاریخ کے حوالے سے موصوف کی یہ ایک دستاویزی کتاب ہے جس میں 51 ادبا وشعرا کا تفصیلی تذکرہ ہے یہ کتاب 1981 میں شائع ہوئی۔ تنقید وتحقیق کے میدان میں اثر انصاری کا ایک اہم نثری کارنامہ 'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' کے نام سے 1990 میں شائع ہوا ہے۔ 'اردو شاعری میں ہند وتہذیب کی عکاسی' اثر صاحب کی ایک نمائندہ کتاب ہے جو 2001 میں منظر عام پر آئی۔

مجموعی طور پر اثر انصاری کی علمی وادبی شخصیت اردو نثر نگاری اور شاعری کے میدان میں بڑی اہمیت کی حامل ہے ابوبکر اثر انصاری (ولادت 1923، وفات 7 جنوری 2005) ایک علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے آپ کے والد محمد مصطفیٰ صفا انصاری کا علمی وادبی اور شعری ذوق کافی نکھرا ہوا تھا، دادا مولانا سلطان احمد صاحب اپنے عہد کے نامور عالم دین تھے جو غازی پور کے مشہور ومعروف دینی ادارہ 'مدرسہ چشمۂ رحمت' سے سند یافتہ تھے جنھوں نے مئو ناتھ بھنجن میں عظیم علمی ودینی ادارہ 'مدرسہ دارالعلوم' قائم کیا تھا جو آج علمی دنیا میں جامعہ دارالعلوم کے نام سے تشنگان علم دینیہ کو سیراب کررہا ہے۔ اثر انصاری کے خاندانی پس منظر کے تعلق سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے گھر کا ماحول خالص علمی ودینی تھا والد محترم صفا انصاری کا شمار استاذ شعرا میں ہوتا ہے اثر صاحب کی بنیادی تعلیم والدین کی زیر نگرانی ہوئی قرآن شریف مدرسہ دارالعلوم میں ختم کیا ان کے والد نے انھیں 1932 میں راج پرائمری اسکول میں داخل کیا جو اس وقت کا اہم اسکول تسلیم کیا جاتا تھا 1937 میں آپ نے مڈل اسکول پاس کیا 1943 میں آپ نے جیون رام اسکول مئو سے ہائی اسکول پاس کیا اس کے بعد آپ نے 1944 میں شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ میں انٹر کلاس میں داخلہ لیا مگر افسوس کہ اسی سال آپ کی بہن عابدہ کا انتقال ہوگیا جس کے غم میں اثر انصاری بیمار پڑ گئے اور ان کی رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا 1945 میں ناگفتہ بہ حالات میں کسی طرح اپنے مخلص دوست ماسٹر حبیب اللہ اعظمی (سابق پرنسپل حسین آباد کالج، لکھنؤ) کے مشورے سے گورنمنٹ کالج الہ آباد سے پرائیویٹ طور پر انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اثر انصاری کو بچپن ہی سے علمی وادبی ماحول نصیب ہوا تھا حصول علم کے ساتھ ہی وہ ادبی وسماجی اور سیاسی حلقوں میں دلچسپی لیتے تھے 1972 سے 1977 تک مئو ناتھ بھنجن میں میونسپل بورڈ کے منتخب ممبر رہے۔ 1973 میں مئو کے مشہور علمی ودینی ادارہ مدرسہ دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کے ممبر منتخب ہوئے پھر نائب ناظم بنائے گئے دارالعلوم نسواں اسکول کا پرائمری شعبہ اور جونیئر ہائی اسکول آپ کی نگرانی اور نظامت میں 1984 تک رہا۔ اثر انصاری صاحب ایک اہم علمی وادبی کارنامہ 'دانش کدہ اردو لائبریری' اور بزم ادب مئو بھی قائم کیا ہے اس کو قائم کرنے میں آپ کا اہم رول رہا ہے تقریباً دو دہائی تک آپ اس کے صدر بھی رہے۔

مئو کے علمی وادبی منظر نامے پر آپ کی علمی شخصیت سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا ہے جس کی ایک طویل فہرست ہے۔ آپ نے مئو کے نامور غزل گو عبدالرحمٰن اچڑم کے مشورے سے اثر تخلص اختیار کیا اور علمی وادبی دنیا میں اثر انصاری کے نام سے شہرتِ دوام حاصل کی، ضمناً عرض کرتا چلوں کہ ایک اچھے استاذ کی شناخت عموماً اس کے لائق، ہونہار اور باصلاحیت شاگردوں ہی سے ہوا کرتی ہے اس سلسلے میں اثر صاحب بہت ہی خوش نصیب ہیں ان کے نامور اور نمائندہ تلامذہ میں پروفیسر منور انجم، ڈاکٹر وکیل اشہر، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر شفیق اعظمی، ڈاکٹر مختار احمد دل حسینی، اظہر انصاری، بسمل انصاری اور احسان اعظمی وغیرہ کے اسماء گرامی انتہائی اہم اور قابل ذکر ہیں۔

شہر ہنروراں مئو کے علمی وادبی اور شعری قافلے کی رہنمائی میں اثر انصاری نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس سے چشم پوشی اور انکار ممکن نہیں ان کے خلوص اور ہمدردی بھرے جذبے کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی اپنی تمام علمی وادبی اور اخلاقی خوبیوں کے باوجود اثر صاحب بشر تھے خیر البشر نہیں جس کا اعتراف انہوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

بچا سکا نہ میں دامن گناہ سے یارب
حساب مانگ نہ مجھ سے مری جوانی کا

دیارِ فضا مئو ناتھ بھنجن کے نامور ادیب وشاعر ابوبکر اثر انصاری نے اصناف شاعری میں غزلیات و منظومات کے علاوہ حمدیہ ونعتیہ شاعری میں بھی اوج کمال حاصل کیا ہے وہ ایک بلند پایہ حمد نگار اور نعت گو گزرے ہیں جن کی حمد ونعت کا مختصر ترین انتخاب 'نوائے سروش' کے نام سے 2001 میں شائع ہو چکا ہے۔ مذکورہ کتاب کے دیباچے میں صفحہ 9 پر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے اثر صاحب کی حمد ونعت گوئی پر ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''اثر انصاری نے جو بھی حمد ونعت کہی ہیں ان میں مذہبی عقائد کے اظہار کے ساتھ ساتھ شعری وفنی معیار کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اس اعتبار سے اثر انصاری کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کی ایک امتیازی اہمیت ہے ان کی حمد ونعت میں عقیدت کی زیریں لہریں اور جذباتی کیفیات شعری و فنی حسن سے ہم آہنگ ہو کر عقیدت و شاعری کی اعلیٰ قدروں کا مجموعہ بن گئی ہیں اور یہی ان کی حمدیہ ونعتیہ شاعری کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔''

اثر صاحب نے اردو کی حمدیہ ونعتیہ شاعری کو جو معیار ووقار عطا کیا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

حمد و ثنائے پاک خدا کی بیاں کروں
پھر اس کے بعد نعت رسول خدا لکھوں
کیسے کٹے یہ معصیت آلود زندگی
اے کاش زیر سایہ رحمت رہا کروں
اس کی قدرت کے کرشمے ہیں یہ دشت وکوہسار
اس کی وحدت کے ثنا خواں ہیں طیور و آبشار
آسمان کو چاند تاروں سے مزین کر دیا
اور زمیں کو خاک و باد و آب و آتش دے دیا
ہے آرزو کے دیارِ رسول میں جاکر
میں سیکھ جاؤں محبت کے ہر قرینے کو
جہاں سے شمعِ رسالت کی روشنی پھیلی
ترس رہا ہے اثر اس فضا میں جینے کو
اب نہ آئے گا ترے بعد پیمبر کوئی
ختم ہے تجھ پہ رسالت، یہ ہے عظمت تیری

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اثر صاحب نے اصنافِ شاعری میں غزل، نظم، قطعہ اور حمد ونعت کو جو فکر کی بلندی اور پاکیزگی عطا کی ہے اس کا اعتراف ناقدینِ شعر وادب نے بڑی کشادہ ذہنی سے کیا ہے۔ موصوف نے اپنی غزلوں اور نظموں میں لہجے کی صداقت ومتانت کو ہمیشہ ملحوظ نظر رکھا ہے انہوں نے نادر تشبیہات واستعارات اور لفظیات کے استعمال سے اردو شاعری کے دامن کو جو وسعت اور بلندی اور معیار وتوازن عطا کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

میں اپنی گفتگو پروفیسر الطاف احمد اعظمی صاحب کے اس مختصر اقتباس پر ختم کرتا ہوں موصوف لکھتے ہیں:

''اثر انصاری کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہیں کوئی تصنع وتکلف اور ابہام نہیں ہے، اور نہ کسی قسم کی پردہ داری ہے۔ زندگی بھی ان کی آئینہ کی طرح اور شاعری بھی مثل آئینہ ہے جو کچھ ان کی آنکھوں نے دیکھا اور جو کچھ ان کے دل نے محسوس کیا اس کو انہوں نے پورے فنی التزام کے ساتھ بے کم وکاست بیان کردیا۔''

■

Dr. Rafeeque Ahmad
Dept. of Urdu, D C S K
Post Graduate College
Maunath Bhanjan- 275101 (UP)

انجم عثمانی | حیات اور فن

سید وجاہت مظہر

معروف افسانہ نگار اور ٹیلی ویژن پروڈیوسر انجم عثمانی کی ولادت 8 اکتوبر 1952 میں دیو بند کے ایسے دینی خانوادے میں ہوئی جس کا شمار دارالعلوم کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے وہیں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے جامعہ اردو، علی گڑھ سے ادیب کامل کا کورس کیا۔ اس کے بعد وہ دہلی آگئے جہاں انھوں نے ذاکر حسین کالج سے بی اے (آنرس) کیا اور پھر دلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ جب جے این یو کے شعبۂ اردو میں ماس میڈیا میں ایک نیا ڈپلوما کورس شروع کیا گیا تو انجم عثمانی نے اس کورس کے اولین بیچ کے طالب علم کے طور پر 'ایڈوانس ڈپلوما ان ماس میڈیا ان اردو' کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ عامہ پر یہ ایک جدید ترین کورس تھا اور اسی کی بنا پر انھیں یو پی ایس سی کے ذریعے پروگرام ایگزیکیوٹیو کی پوسٹ پر تقرری ملی۔

دلی دور درشن کے اردو میگزین پروگرام 'بزم' کے پروڈیوسر کے طور پر انجم عثمانی نے ملک گیر سطح پر اپنی شناخت قائم کی۔ بطور اردو پروگرام آفیسر، ان کی تقرری آکاش وانی و دوردرشن کے لیے ہوئی تھی، جہاں وہ اپنی سبکدوشی تک دہلی دوردشن ہی سے وابستہ رہے۔ دیگر اہم منصبی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ اپنی بنیادی کارکردگی یعنی اردو کے پروگراموں کی تشکیل کی ذمے داری سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کئی افسانے تخلیق کیے۔ ان کے افسانوی مجموعے بعنوان 'شب آشنا' (1978)، سفر در سفر (1984)، ٹھہرے ہوئے لوگ (1995) اور کہیں کچھ کھو گیا (2011) میں منظر عام پر آئے۔ انجم عثمانی بحیثیت افسانہ نگار نہ صرف اپنے ہیئتی تجربوں اور موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے کامیاب فنکار تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ حقیقت نگاری کے فن اور تکنیک سے بھی وہ کما حقہٗ واقف رہے ہیں۔ تقریباً نصف صدی سے موصوف افسانہ نگاری کے میدان میں سرگرم عمل رہے اور اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے درمیان انھوں نے ایک مخصوص پہچان بنائی۔ اس صنف میں وہ اختصار گوئی سے کام لیتے رہے۔ لہٰذا، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختصر افسانہ نگاری کے معیار کو بلندی عطا کرنے میں انجم عثمانی نے قابل ستائش کردار نبھایا ہے۔

شب آشنا: اپنے پہلے افسانوی مجموعے 'شب آشنا' میں وہ اپنی شخصیت اور فن کا تعارف بذات خود کراتے ہیں۔ دیباچے کے طور پر کتاب کے آغاز میں انھوں نے اپنا ایک مضمون بعنوان 'میں اور میرے افسانے' شامل کیا ہے، جس میں وہ فخر کے ساتھ دیو بند کے ایسے ذی علم خانوادے میں اپنی ولادت کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن، مفتی فضیل الرحمٰن، مفتیِ اعظم ہلال عثمانی، مولانا عامر عثمانی، مسعود جاوید، کفیل الرحمٰن نشاط، شمیم عثمانی اور شمس الحق عثمانی جیسے یکتا و یگانۂ روزگار اشخاص شامل تھے۔ انجم عثمانی لکھتے ہیں:

"علمی دنیا کے اس معروف اور بافیض شجرۂ نسب کے سائے تلے میں انگلی پکڑ کر چلنے کے قابل ہوا تو خاندانی روایت کے مطابق دارالعلوم دیو بند میں داخل کر دیا گیا۔ دارالعلوم سے فارسی و عربی کی سندِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کسب علم کیا اور پھر دہلی کالج (ذاکر حسین کالج) میں زیرِ تعلیم رہا اور اب مرکزی وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند کے ترقی اردو بیورو سے وابستہ ہوں۔"

(شب آشنا، انجم عثمانی، محبوب پریس دیو بند، یوپی، 1977)

انجم عثمانی کے اس افسانوی مجموعے میں شامل زیادہ

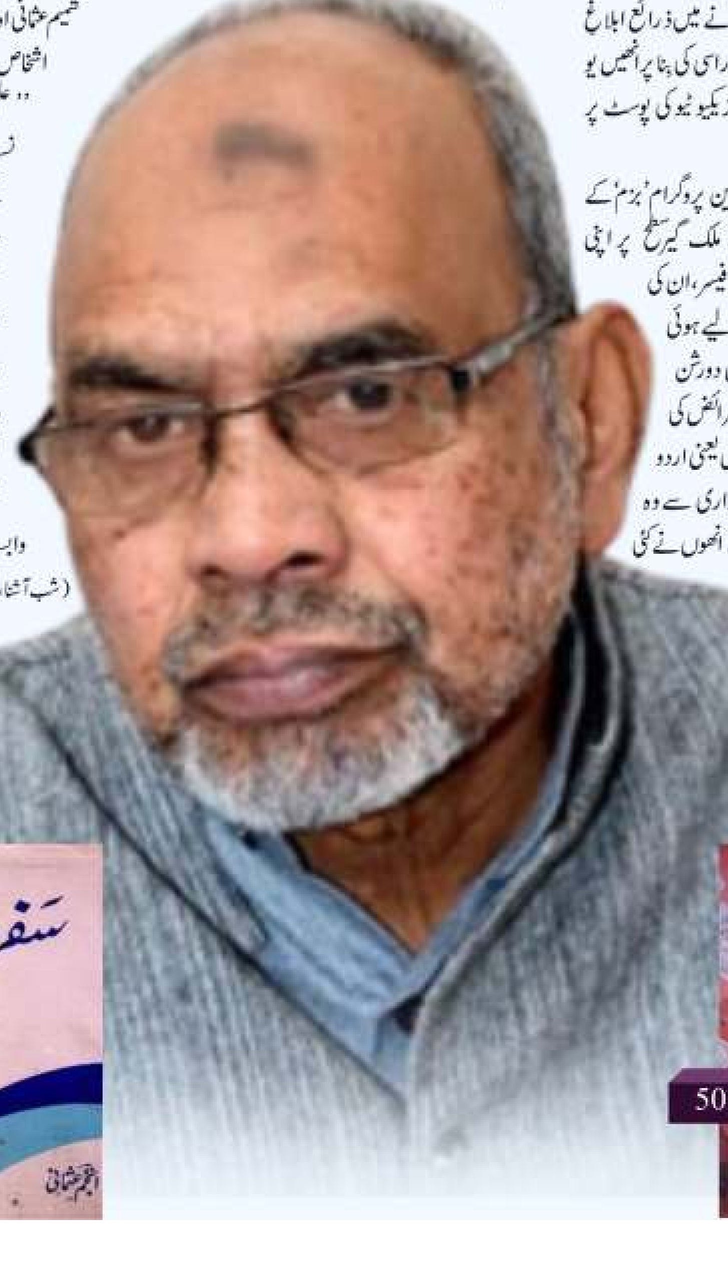

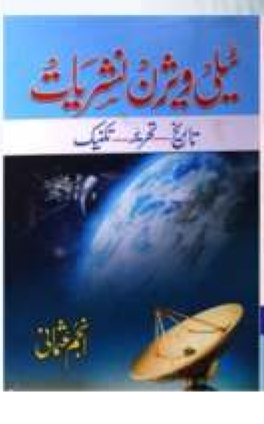

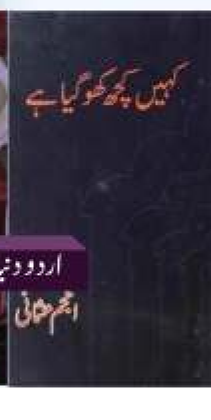

تر افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے یا آل انڈیا ریڈیو پر براڈ کاسٹ ہوئے ہیں۔ وہ ادبی نظریات سے وابستگی کی بنیاد پر ادب کی تقسیم کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے افسانوں کا سچا نقاد ان قارئین کو مانتے تھے، جنھوں نے انھیں افسانے لکھتے رہنے پر آمادہ رکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اس میں اپنی زندگی کے تقریباً ہر دور کے افسانے شامل کیے ہیں۔ اس دور کے بھی جب 'آگ کا دریا' کے بیس صفحے پڑھ کر بے اعتنائی سے کتابوں کے پیچھے اسے رکھ دیا تھا اور اس دور کے بھی جب بہت سی بے پڑھی چیزیں پڑھی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔

ادبی نظریے کے اعتبار سے میں ادب کو وابستگی اور ناوابستگی وغیرہ کے خانوں میں تقسیم کرنے کا قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں وہ انسان بھی شامل ہیں جن کو نقاد موضوعاتی کہتے رہے ہیں اور وہ بھی جن پر تخلیق کی کھائیاں عبور نہ کر سکنے والے نقاد ماتھے پر بل ڈال لیتے ہیں۔ ایسے نقاد کے ماتھے کی شکنوں سے میں نے کبھی اثر نہیں لیا۔ میرے لیے میرے افسانوں کا سچا نقاد وہ قاری ہے جس نے مجھے لکھتے رہنے پر آمادہ رکھا۔''

(شب آشنا، انجم عثمانی، محبوب پریس دیوبند، یوپی، 1977، ص 8)

'شب آشنا' میں انجم عثمانی نے جو کہانیاں شامل کی ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں: سرابوں کے سفیر، شریر کے انگ، سب سے بڑا سچ، ایک لمحہ درمیاں ہے، آپی، اپنی ہی آگ میں، سانجھ کے پنکھ، جو بات تجھ میں ہے۔ ناسور، جیت، گناہ کی واپسی، حل، مکتی، آخری نوٹ، لمحوں کی سوغات، آدمی، پانچویں سمت، زرد سایہ اور شب آشنا۔

سفر در سفر: 'سفر در سفر' میں انجم عثمانی کے انیس افسانے شامل ہیں۔ اس کتاب کے تعارف نامے میں ڈاکٹر شمس الحق عثمانی لکھتے ہیں:

''یہ افسانے ایک ایسے ذہن کا خاکہ ہیں جو اپنے اطراف و جوانب کے حال- احوال- اور ماضی سے بیک وقت وابستہ ہے اور اطراف و جوانب کے حال و احوال اور ماضی سے ایک ایسی تشنگی اور ایسی الجھن محسوس کرتا ہے جو کسی مختلف یا گمشدہ نقطہ سفر کی جستجو یا شناخت پر آمادہ کرتی ہے۔''

(سفر در سفر، انجم عثمانی، کتب خانہ محمودیہ دیوبند، یوپی، 1984، ص 9)

انجم عثمانی کے افسانوی مجموعے 'سفر در سفر' کے آغاز میں پروفیسر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

''انجم عثمانی اردو کے نئے کہانی کاروں میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ لفظ کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور زبان کا بے جا اسراف نہیں کرتے۔ بہت مختصر لکھتے ہیں اور کہانی میں ارتکاز پر نظر رکھتے ہیں۔

ایک کہانی وہ ہوتی ہے جو نظروں کے سامنے چلتی ہے، ایک کہانی وہ ہوتی ہے جو باطن میں چلتی ہے انجم عثمانی کی کہانیاں سوچ کی تار سے بندھی ہوتی ہیں اور زندگی کی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ سہل نگاری کے اس دور میں مسائل کو لے کر چلنا معمولی کام نہیں ہے۔ امید ہے پڑھنے والوں کو بھی یہ کہانیاں سوچنے پر مجبور کریں گی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ 9 ستمبر 1984''

(سفر در سفر، انجم عثمانی، کُتب خانہ محمودیہ دیوبند، یوپی، 1984، ص 2)

انجم عثمانی کے افسانوی مجموعے 'سفر در سفر' میں ان کے یہ افسانے شامل ہیں: منظر ابھی نہیں بدلا، ایک ہاتھ کا آدمی، نسل در نسل، گھنٹے والے بابا، مقتل، پانی، پانی ریت، ٹھہرے ہوئے لوگ، کھوکھلی راہوں کا مسافر، بارش وہ اور میں، انقلاب گزیدہ، طے شدہ سمت کے مسافر، محافظ، پہچان کے زخم، بند کتاب، تخلیق، پانچویں سمت، آدمی، پناہ گاہ اور ایک لمحہ درمیاں ہے۔ یہاں انجم عثمانی نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ گاوؤں اور قصبوں کی فضا، متوسط طبقے کی روزی روٹی اور تعلیم کے لیے دیہی علاقوں سے شہری بستیوں کی جانب ہجرت، مسلمانوں کے سماجی و نفسیاتی مسائل، دیہی اور شہری اقدار و تمدن کی تفریق، امیری و غریبی کے مابین بڑھتی خلیج اور انحطاط پذیر معاشرتی صداقتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ٹھہرے ہوئے لوگ: 'ٹھہرے ہوئے لوگ' ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو 1998 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں انھوں نے اپنے اکیس افسانے شامل کیے ہیں، جن کے عنوانات یہ ہیں۔ شہرِ گریہ کا مکیں، پیر بھائی، برزخ، چھوٹی اینٹ کا مکان، ایک ہاتھ کا آدمی، ٹھہرے ہوئے لوگ، کھوکھلی راہوں کا مسافر، منظر ابھی نہیں بدلا، جو بات تجھ میں ہے، بارش، وہ اور میں، پہچان کے زخم، زنجیر بدل جاتی ہے، آپی، جیت، گھنٹے والے بابا، پناہ گاہ، ایک لمحہ درمیاں ہے، فریب گزیدہ، گمشدہ تسبیح، کبوتروں بھرا آسمان، ورثہ۔

انجم عثمانی کی کہانی 'شہر گریہ کا مکیں' فسادات کا ایسا منظر نامہ پیش کرتی ہے جس کا دائرہ شہروں سے نکل کر قصبوں اور دیہاتوں تک پھیل چکا ہے۔ یہ کہانی گنگا جمنی تہذیب کی پاش پاش ہوتی روایات کا المیہ پیش کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے 'ٹھہرے ہوئے لوگ' میں بتایا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دیہاتوں اور قصبوں کے جن افراد کو شہر جانا پڑتا ہے وہ عموماً واپس لوٹ کر اپنے گاؤں قصبے نہیں آپاتے ہیں۔ اس طرح ان کا گاؤں یا قصبہ ان کی تعلیم و ترقی سے فیض نہیں اٹھا پاتا ہے۔ وہ نئی نسل سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی آبائی روایات سے قطع تعلق نہ کریں گے بلکہ اپنی قصباتی روایات سے وابستہ چیزوں کے تحفظ کے لیے بھی فکرمند رہیں گے۔ اس افسانے میں انھوں نے دیہی اور شہری زندگی کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

انجم عثمانی کے افسانے 'گھنٹے والے بابا' میں بھی دیہی ماحول پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں گھنٹے کی آواز عید، موت اور حادثے کی خبر دینے کا وسیلہ ہوتی ہے۔ گھنٹہ بجا کر لوگوں کو اکٹھا کر کے اطلاع بہم پہنچانے کا یہ دلچسپ دیہی نظام تھا۔ عید کے موقعے پر پورے گاؤں کی ہلچل اور زندگی کی گہما گہمی اسی گھنٹے کے اردگرد نظر آنے لگتی تھی۔ چاند رات کی خوشی گھنٹہ بجانے سے دوبالا ہوجاتی تھی۔ قصبے میں ان تہواروں پر بچوں کا جوش و خروش اور خواتین کی سرگرمیاں اسی گھنٹے کی آواز کے ساتھ منسلک ہو گئی تھیں۔ 'گھنٹے والے بابا' سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش خدمت ہے:

'' بچپن میں ہماری طرح شاید آبادی کے ہر معصوم دل میں یہ خواہش ہچکولے لگا لیتی کہ وہ بھی گھنٹہ بجائے مگر بابا تو زینہ بند رکھتے، پھر کیسے اوپر جا کر اپنی خواہش کی تکمیل کی جاسکتی تھی۔ بابا ہمیشہ گھنٹے تک پہنچنے کا واحد زینے کا دروازہ بند رکھتے، سوائے اس رات کے جب عمارت کی چھتوں سے لوگ رات کو آسمان پر چاند ایسے تلاش کرتے جیسے کھوئی ہوئی اولاد کو یا انجانے صحرا میں بھٹکا ہوا پیاسا پانی کو۔ اس رات بابا زینہ اندر سے بند نہ کرتے اور آبادی کے نہ جانے کتنے لوگ جن میں بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی، گھنٹے کے اردگرد جمع ہوجاتے اور باری باری سے موسلی ہاتھ میں لے کر گھنٹہ پیٹتے، چنانچہ بہت دیر تک گھنٹہ رک رک کر بجتا رہتا اور ولولہ انگیز موسیقی کا لطف دیتا۔ اس رات گجر کی آواز سے بستی کا چپہ چپہ گونجنے لگتا۔ بازاروں اور گلیوں محلوں میں لوگوں کی چہل پہل بڑھ جاتی۔ بچے اپنے نئے کپڑوں اور شیرینی کے لیے مچلنے لگتے۔ عورتیں زور زور سے باتیں کرتی ہوئی گھروں کے کام جلدی جلدی نپٹانے لگتیں۔ دالانوں اور باورچی خانوں میں چوڑیوں کی کھنک گونجنے لگتی۔ چاند آسمان سے اُتر کر ہونٹوں پر مسکن بنالیتا۔ کچی چھتوں کے نیچے رہنے والے معصوم اپنے آنسو پونچھ ڈالتے اور مسکراہٹوں کے اس جھرمٹ میں جگہ بنانے لگتے جس سے وہ سارے سال محروم رہتے یا رکھے جاتے۔ ہم بھی اس مجمع میں شامل ہوتے اور گھنٹہ بجا کر محسوس کرتے کہ آج کا چاند ہماری ہی وجہ سے نکلا ہے۔''

(افسانہ 'گھنٹے والے بابا' اقتباس ماخوذ از افسانوی مجموعہ 'ٹھہرے ہوئے لوگ'، انجم عثمانی، تخلیق کار پبلشرز، دریا گنج، نئی دہلی، 1998، صفحات 136-137)

اگرچہ انجم عثمانی نے کچھ علامتی افسانے بھی تحریر کیے ہیں لیکن ایسے افسانوں میں بھی ترسیل کا مسئلہ نہیں رہا ہے۔ وہ اپنے زیادہ تر افسانوں میں ایک مخصوص آمادہ بہ زوال تہذیب کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون بعنوان 'مدرسے اور مولسری کے پیڑ سے لگی کہانی' میں اس افسانوی مجموعے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، جو اس کتاب میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان کہانیوں کی بغور قرأت سے اندازہ ہوگا کہ ان کی کہانی بتدریج فنی تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی ہے۔ انجم عثمانی کے پاس زبان تو ہے ہی کہانی بُننے کے عمل میں انھوں نے جو دسترس حاصل کی ہے، اس کی بدولت ان کی کہانیاں اپنی معنویت اور معاشرتی فضا کی وجہ سے توجہ کا استحقاق رکھتی ہیں، ہنوز وہ توجہ ان پر کی نہیں گئی، سطور ذیل کا مقصد یہی ہے کہ مختصراً ہی سہی، دیکھا جائے کہ انجم عثمانی کی فنی شناخت کیا ہے، ان کے مسائل اور محرکات کیا ہیں، انھوں نے کیا دنیا خلق کی ہے اور ان کے کرداروں کے درد کی داستان کیا ہے؟

اکثر فنکاروں کے فن میں ان کے کینوس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو وسیع پیمانے پر لیتے ہیں۔ زمین، آسمان، انسان، زمانے، ہر شے صدیوں پر پھیلی اور وقت کے بہاؤ میں شامل ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو باریک بینی سے کام لیتے ہیں گویا چاول کے دانے پر قل ہو اللہ لکھتے ہیں یا منی ایچر بناتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر چیز چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے لیکن واقعاتی اس درجے کہ انگوٹھی کا نگینہ بھی دکھائی دے۔ انجم عثمانی اختصار نویس ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتے ہیں، لیکن واقعیت اور معاشرتی صداقت سے گتھی ہوئی۔ اپنے ہم عمروں میں اختصار اور اجمال اور کفایتِ لفظی ان پر ختم ہے۔ وہ اس دنیا میں سرے سے داخل ہوتے ہی نہیں جسے انھوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کھرے پن اور درد و داغ کی بنا پر کہتے ہیں، جس کے پُلِ صراط کو خود انھوں نے طے کیا ہے۔"

(ٹھہرے ہوئے لوگ، انجم عثمانی، تخلیق کار پبلشرز، دریا گنج، نئی دہلی، 1998 صفحات 11-12)

کہیں کچھ کھو گیا ہے: انجم عثمانی کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ بعنوان 'کہیں کچھ کھو گیا ہے' 2011 میں منظر عام پر آیا۔ یہ 144 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں انجم عثمانی نے اپنی زندگی اور فن پر 22 صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون بعنوان 'کہانی مجھے لکھتی ہے' شامل کیا ہے جو ایک طرح سے ان کے خودنوشت سوانحی مضمون کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کتاب پر انجم عثمانی کی افسانہ نگاری پر جوگیندر پال، سید محمد اشرف اور قاسم خورشید جیسی اردو فکشن کی مایہ ناز ہستیوں کی مختصر آرا شامل ہیں۔ معروف ناول و افسانہ نگار جوگیندر پال لکھتے ہیں: "انجم عثمانی نے اردو فکشن کو نئی فضا، نیا ماحول دیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں میجیکل ریلزم کا عنصر نمایاں ہے۔ کئی کہانیاں پُراسرار مدرسہ لائف کا خوبصورت اشاریہ ہیں۔" (کہیں کچھ کھو گیا ہے)

اس افسانوی مجموعے میں انجم عثمانی کے جو افسانے شامل ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں۔ اغوا، صدقہ، ٹک شلف، جنگل، ڈھلواں چٹان پر لیٹا ہوا آدمی، مشاعرہ جاری ہے، سمینار جاری ہے، جشن جاری ہے، کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے، دومنہ والا سانپ، چھنگا، کہیں کچھ کھو گیا ہے اور زنجیر کا نغمہ (ڈرامہ)۔ اس کتاب کے آخر میں عابد سہیل، شوکت حیات اور مختار شمیم جیسے اہم ادبی اشخاص نے انجم عثمانی کی افسانہ نگاری پر اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔

عابد سہیل لکھتے ہیں:

"صاف اور شستہ زبان، واقعات کا فطری بہاؤ، ڈرامائیت کرنے سے گریز، تکنیک ایسی جو اصل کہانی پر بالا دستی حاصل نہیں کرتی اور چھوٹے چھوٹے جملے انجم عثمانی کے افسانے کی اضافی خوبیوں میں شامل ہیں۔"

پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہی زندگی کی مرقع سازی انجم عثمانی کی افسانہ نگاری کی بنیادی شناخت بنی۔ قصباتی زندگی کی اقدار میں آنے والی تبدیلیاں، زوال پذیر انسانی معاشرہ، قصبوں میں خستہ حال حویلیوں اور ان کے مکینوں کی زبوں حالی، اقلیتوں کے مسائل، گنگا جمنی تہذیب کے بکھرتے شیرازے اور فسادات سے پیدا شدہ صورت حالات، ان کے افسانوں میں حقیقت پسندانہ رنگ و آہنگ کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

انجم عثمانی کے افسانے اور تجزیے: انجم عثمانی کی حیات و فن پر ڈاکٹر عقیل احمد نے 'انجم عثمانی کے افسانے اور تجزیے' عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی جسے فیصل انٹرنیشنل، نئی دہلی نے 2019 میں شائع کیا۔ اپنی اس مرتبہ کتاب میں وہ رقمطراز ہیں:

"اس مجموعے میں انجم عثمانی کی وہ کہانیاں ہیں جن سے ان کے فن کی شناخت قائم ہوئی ہے۔ اختصار نویسی اور ایک خاص تہذیبی فضا کے درد کو بیان کرنے والے افسانہ نگار کے طور پر انھیں پہچانا گیا، اس موضوع کو نہ ان سے پہلے کسی نے اپنایا، نہ بعد میں۔" یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کتاب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجم عثمانی کے افسانے 'ورثہ' کا خصوصی طور پر تجزیہ کیا تھا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے بھی انجم عثمانی کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں گمشدہ تہذیب کے اوراق بحسن و خوبی پیش کرتے رہے ہیں۔ دور حاضر کے معروف افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی، انجم عثمانی کی اختصار نویسی کے قائل رہے ہیں۔ علاوہ ازیں افسانہ 'شہر گریہ کا مکیں' کا تجزیاتی مطالعہ رتن سنگھ، افسانہ 'جنگل' کا تجزیہ ڈاکٹر نگار عظیم، افسانہ 'پیر بھائی' کا تجزیہ شوکت حیات، 'مشاعرہ جاری ہے' کا تجزیہ ثروت خان، 'ایک ہاتھ کا آدمی' کا تجزیہ سلیم شہزاد، افسانہ 'اغوا' کا تجزیہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کیا ہے۔ اس کتاب کے توسط سے بطور افسانہ نگار انجم عثمانی کی شخصیت اور فن پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے خیالات اور افکار کی اہمیت و افادیت واضح کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ان کے ذہنی رجحانات، خیالات و افکار اور تخلیقی جہات کی افہام و تفہیم میں ممد و معاون ہے۔

'شگفتگی کی تلاش میں' یہ انجم عثمانی کی طنز و مزاح پر مبنی تحاریر کا مجموعہ ہے، جو 2015 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے مقدمے کو انھوں نے پیش لفظ کے بجائے 'پس و پیش لفظ' عنوان دیا ہے۔ وہ 'پس و پیش' کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

"پس و پیش بلکہ زیر و زبر میں ہوں کہ کیا عرض کروں۔ عرض کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اکثر مجموعوں سے پہلے مصنف یا مصنف کے بارے میں عرض کرنے کی روایت بھی ہے اور ضرورت بھی۔ بلکہ بعض مجموعے تو تصنیف ہی اس لیے کیے جاتے ہیں کہ ان پر مقدمہ یا پیش لفظ لکھا جا سکے۔ مقدمہ اور پیش لفظ قسم کی چیز میں روایتی طور پر یہ آزادی ہے کہ مقدمہ نگار کا مصنف ہونا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ اردو میں تو بہت سے ادیب مقدمہ بازیوں کے وجہ سے ہی مشہور ہیں۔ ہم ذاتی طور پر ایسے کئی ناقدوں کو جانتے ہیں جنہوں نے مختلف قسم کے مقدمے پہلے سے ہی لکھے ہوئے ہیں اور یہ اس انداز سے لکھے ہوتے ہیں کہ کتاب نثر کی ہو یا نظم کی، تخلیق ہو یا تحقیق ان کے مقدمے ہر تصنیف پر ایسے فِٹ آتے ہیں جیسے اسی تصنیف کے لیے ہی تحریر کیے گئے ہوں۔ ایسے 'کثیر الجہات' مقدمے اس ریڈی میڈ فری سائز لباس کی طرح ہوتے ہیں جو سب کے فِٹ آجاتے ہیں اور اگر کسی کے فِٹ نہ آئے تو اس میں لباس کے سائز سے زیادہ پہننے کی کوشش کرنے والے کے سائز کا قصور ہوتا ہے۔"

(شگفتگی کی تلاش میں طنز و مزاح، انجم عثمانی، شیروانی آرٹ پرنٹرس، بلی ماران، نئی دہلی، 2015، ص 7)

حیدرآباد سے شائع ہونے والے ماہنامے 'شگوفہ'

میں پروفیسر خالد محمود نے انجم عثمانی کا بطور انشائیہ نگار بڑا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے۔ خاکے کی سرخی میں وہ انھیں ''مولوی انجم عثمانی دیوبندی ثم دہلوی عفی عنہ'' لکھتے ہیں۔ اس مضمون میں خالد محمود انجم عثمانی کی شخصیت اور فن کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خاکے کی شکل عطا کرتے ہیں:

''انجم عثمانی کی تحریریں انشائیہ سے زیادہ قریب ہیں۔ان کے یہاں طنز کم اور مزاح جسے لطافت اور ظرافت کہنا چاہیے، زیادہ ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے سارے موضوعات دیکھے بھالے بلکہ آزمودہ ہیں۔ دوسرے انھوں نے طنز ومزاح کے معروف حربوں میں رعایت لفظی، جملے بازی، تکرار، بذلہ سنجی، بریکٹ اور لطیفہ گوئی سے کام لیتے

ذرائع ترسیل کے طور پر اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تاریخ و ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے انجم عثمانی نے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے جملہ عناصر و عوامل کا تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔ دور جدید میں تیزی سے ابھرتے اور ترقی کے مدارج طے کرتے، اس جدید شعبۂ علم کے جن پہلوؤں کو انھوں نے یہاں خصوصی اہمیت کا حامل سمجھا وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ہوئے فرضی اور بے نام کردار بھی تخلیق کیے ہیں اور اکثر تخلیق کیے ہیں۔ مرکبات وضع کرنے میں بھی ذہانت اور ذکاوت کا مظاہرہ کیا ہے مگر چوں کہ بنیادی طور پر وہ انشائیہ نگار ہیں اور ساتھ ہی افسانہ نگار بھی جو ان کی ایک اضافی خوبی ہے اس لیے وہ ذہنی ترنگ کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ افسانہ نگار کا تخیل ان کی مدد کے لیے ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ان دونوں کے اشتراک سے جو انشائیے وجود میں آئے ہیں ان میں ہلکے جاڑے کی دھوپ جیسی لطافت، چاندنی جیسی ٹھنڈک، شوخیوں جیسا طنز، پھلجھڑیوں جیسا مزاح، شائستہ جملے بازی، خوشبودار ظرافت، ساری لطافتیں بے کثافت، (غالب کی اس دھمکی کے باوجود کہ ''لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کرسکتی'') موجود ہیں اور ہر لطافت خلوص ومحبت کے عطر میں بسی ہوئی۔ ان کی تحریروں کو ان کی شخصیت کے آئینے میں دیکھیے دونوں میں سرِمو فرق نظر نہیں آئے گا۔ وہ جس طرح گفتگو کرتے ہیں ویسا ہی بلکہ وہی کا وہی لکھ دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور نفاق وتضاد میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا زمین وآسمان میں ہوسکتا ہے۔ اسی خصلت اور خاصیت نے انھیں اور ان کی تحریروں کو محبوب ومرغوب بنایا ہے۔''

(ماہ نامہ شگوفہ، پروفیسر خالد محمود نمبر، دسمبر 2020، ص 52)

جن بیس مضامین کو انجم عثمانی نے اس کتاب میں شامل کیا ہے، ان کے عنوانات یہ ہیں۔ مزاح نگاری؟ توبہ، شگفتگی کی تلاش میں، لو آج ہم بھی صاحبِ اسلوب ہوگئے، مشاعرہ گاڑی، اے اوارڈ والو...، خالص عوامی مشاعرہ، مشاعروں اور سمیناروں کا موسمِ بہار، 'غزل کی مقبولیت کے اسباب' چالیس منٹ اور ہم، طرحی مشاعرہ، تخلیقی محرکات، اظہار کی تیسری صنف، ایک سامع۔ دو مشاعرے، تماشا نہیں ہے، مجموعہ عرض ہے، موسم گرما تیرا شکریہ، دانشور نمبر ون، مارچ سے پہلے مارچ کے بعد، صدر پھر صدر ہے، تصنیف حاضر ہے، مشاعرہ، سمینار اور کرکٹ۔

ٹیلی ویژن نشریات، تاریخ، تحریر، تکنیک: انجم عثمانی نے ٹیلی ویژن کے فن اور تکنیک پر ایک کتاب بعنوان 'ٹیلی ویژن نشریات، تاریخ، تحریر، تکنیک' لکھی جو الیکٹرونک میڈیا سے متعلق نصابی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب دسمبر 1994 میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے کافی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس کتاب کا سب سے اہم مضمون 'ٹیلی ویژن اور اردو: ایک مطالعہ' ہے۔ علاوہ ازیں عوامی ترسیل کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہاں ہندوستان میں ٹیلی ویژن کے فروغ پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے۔ کتاب کے اگلے حصے کا عنوان انھوں نے 'تحریر' رکھا ہے۔ اس عنوان کے تحت ٹی وی اسکرپٹ کے لیے بنیادی باتیں، دستاویزی فلم، ٹی وی ڈرامہ، ٹیلی فلم، شارٹ فلم، ٹی وی اشتہارات، خبریں، اناؤنسمنٹ، خصوصی پروگرام اور کچھ پروگراموں کے بارے میں تعارفی مضامین رقم کیے ہیں۔ اگلے باب میں انھوں نے اس میڈیم کی تکنیک پر تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ٹیلی ویژن اصطلاحات کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔

پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا: تعارف، تاریخ اور اصول: انجم عثمانی کی نئی کتاب 'پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا: تعارف، تاریخ اور اصول' 2022 میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس میں مصنف نے ذرائع ترسیل عامہ کے تقریباً تمام اہم نکات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ذرائع ترسیل کے طور پر اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی تاریخ وارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے انجم عثمانی نے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے جملہ عناصر وعوامل کا تعارف وتجزیہ پیش کیا ہے۔ دور جدید میں تیزی سے ابھرتے اور ترقی کے مدارج طے کرتے، اس جدید شعبۂ علم کے جن پہلوؤں کو انھوں نے یہاں خصوصی اہمیت کا حامل سمجھا وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

پرنٹ میڈیا: پریس (صحافت)، پریس کی اقسام، صحافت کیا ہے، پریس کونسل، خبر کی اقسام، ابتدائیہ کیا ہے، کچھ اصول، خبر نگاری۔

تعارف، خبروں کی سرخیاں اور اقسام، نامہ نگاری کے بنیادی اصول، خبریں حاصل کرنے کے ذرائع، نیوز ایجنسیاں، زبان و ادب کی ترقی اور اردو صحافت، کالم نگاری، ادارت اور مدیر، الکٹرونک میڈیا، برقی ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ریڈیو ڈرامے، ریڈیو نیوز، سینما فیچر فلم، فلموں کی اقسام، تکنیک، مواد، ڈاکیومینٹری اشتہار، فلم، ٹی وی اسکرپٹ کے لیے بنیادی باتیں، اسکرپٹ نگاری، فیچر نگاری اور ٹیلی فلم، ٹیلی ویژن، تعریف تکنیک، ابتدا ٹی وی نیشنل پروگرام، دوردرشن، براہِ راست نشریات سٹلائٹ، مدار، مدار کی اقسام، سیارچہ، ٹیلی ویژن نشریات، براہ راست نشریات کی تاریخ رواں تبصرہ، اسکرپٹ، دستاویزی فلم، ڈاکیو ڈراما، ٹیلی فلم، ٹی وی اشتہار سازی، ٹیلی ویژن پروگرام، تلخیص، خلاصہ، نمونہ، اسکرین پلے، ہئیت، اسکرپٹ، ٹیلی ویژن ڈرامے کی اسکرپٹ، سوپ، اوپیرا، ٹی وی سیریل، تاریخی سیریل، ہندوستان میں ٹیلی ویژن سیریل کا ارتقا، غیر تحریری پروگرام، انٹرویو، مذاکرہ، مباحثہ، ٹی وی نیوز، ٹیلی ویژن کی زبان وغیرہ۔ اردو زبان کے ماس کمیونی کیشن کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل اور نصابی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر تحریر کی گئی یہ کتاب اپنے موضوع کا مکمل طور پر احاطہ کرتی ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انجم عثمانی کی یہ کتاب پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے میدان میں ان کی زندگی بھر کے تجربات، مشاہدات اور مطالعات کا نچوڑ ہے۔ یہ اس شعبہ علم کی تازہ ترین نصابی ساخت اور موضوعاتی تناظر کو جامع انداز اور سلیس زبان میں پیش کرتی ہے اور اس لحاظ سے ماس میڈیا کے طلبا ہی کے لیے نہیں بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ دہلی دوردرشن میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد بھی وہ ادبی وعلمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مختلف سرکاری اداروں میں الیکٹرونک میڈیا سے متعلق کاموں میں منہمک رہے۔ انجم عثمانی 20 اپریل 2021 کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق دیوبند میں ہوئی۔ انھیں اپنے دور کے معروف افسانہ نگار اور ذرائع ابلاغ عامہ کی فعال شخصیت کے طور پر اردو کے ادبی حلقوں میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

■

Dr. Syed Wajahat Mazhar
T116/1, 2nd Floor
Main Market, Okhla Village
New Delhi- 110025

اعظم کریوی

عبدالقیوم

بیسویں صدی کی ابتدا میں افسانے کی داغ بیل پڑی اور اسی دور میں راشد الخیری، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے اس صنف کو استحکام عطا کیا۔ افسانے کے اس تشکیلی دور کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنی خاص جگہ بنائی ان میں پنڈت سدرشن اور علی عباس حسینی کے ساتھ اعظم کریوی کا شمار ہوتا ہے۔ اعظم کریوی کا دور بیسویں صدی کا نصف اول ہے۔

اعظم کریوی شاعر، صحافی، مضمون نگار، افسانہ نگار، تنقید نگار اور طبیب تھے۔ ان کا تعلق ہندوستان کی ریاست اتر پردیش سے تھا۔ ان کی طبیعت، شخصیت اور مزاج میں غیرت مندی، ہمت، جرأت اور بے پروائی اس قدر تھی کہ 1921 میں ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا لیکن ان کو مجموعوں کی شکل میں یکجا کرنے کی نوبت 1942 میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اردو افسانے میں وہ مقام نہیں ملا جس کے مستحق تھے یا پھر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو مقام ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کو ملا وہ ان کو نصیب نہ ہو سکا۔

خاندان

اعظم کریوی کے پڑپوتے خالد اعظم، حامد کمال ناروی صاحب کو ایک مراسلے میں لکھتے ہیں کہ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے ایک پوتے یا بھتیجے شیخ عمادالدین اسماعیل قریشی الہاشمی بایمائے غیبی ملتان سے الہ آباد تشریف لائے اور موضع ممبرولی میں سکونت اختیار کی۔ ان کی اولادوں میں تین صدی قبل کچھ اختلاف ہوا جس کو ختم کرنے کی غرض سے اس کنبے کے کچھ بزرگوں نے ممبرولی کو چھوڑ کر گنگا کے کنارے ایک گمنام چھوٹا سا موضع جس کا نام کورئی ہے منتخب کیا۔ یہاں وہ تقسیم ہند تک آباد رہے۔ تقسیم ہند کے وقت یہ خاندان منتشر و منقسم ہو گیا۔ اس خاندان کے جو لوگ بچ گئے تھے ان کو منتشر ہو کر ضلع الہ آباد، مہنگاؤں، کانپور اور پاکستان کے کچھ علاقوں کا رخ کرنا پڑا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کورئی میں شرفا میں صرف یہی ایک گھر تھا یعنی (اعظم کریوی کا) اب کورئی میں کسی زمین دار کی اقامت نہیں ہے۔ اعظم کریوی نے ایک جگہ لکھا کہ میں ''پدرم سلطان بود کا نعرہ'' لگانا اپنے لیے موزوں نہیں سمجھتا ورنہ اپنے خاندانی بزرگوں کے تذکرے سے کئی صفحات سیاہ کر دیتا۔

پیدائش

اعظم کریوی کی پیدائش 22 جون 1899 میں کرئی، پرگنہ چائل میں ہوئی جو موجودہ ضلع کوشامبی میں ہے۔ اسی مناسبت سے اعظم کریوی جن کا اصلی نام انصار احمد تھا اور اعظم تخلص تھا اپنے نام کے آخر میں 'کریوی' لگاتے تھے۔ کریوی کا تاریخی پس منظر افسانہ 'پریم کی لیلا' میں بھی ملتا ہے۔ چمن لال لکھوترا اپنے مقالے میں اعظم کریوی کے چھوٹے بھائی محمد احمد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اعظم کریوی اپنے والدین کی گیارہویں اولاد ہیں۔ اس سے پہلے ان کی دس اولادیں ہوئیں جو بچپن میں ہی فوت ہوگئیں۔ اعظم کریوی جب پیدا ہوئے تو ان کو ایک انصاری عورت کا دودھ پورے عہد طفلی میں پلایا گیا۔ اسی وجہ سے ان کا نام والد صاحب نے انصار احمد رکھا۔ ان کے والد کا نام 'فیاض احمد' تھا اور والدہ کا نام صدیق النسا تھا۔ اعظم کریوی کا بچپن کھیل کود میں گزرا۔ ان کا گھرانہ خوش حال اور زمیندار تھا۔

تعلیم

اعظم کریوی کی اگرچہ پیدائش گاؤں میں ہوئی لیکن ابتدائی چار پانچ سال کے بعد وہ گاؤں میں نہیں رہے۔ وہ اپنے ماموں احتشام الدین کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں سہارنپور 1905 میں گئے۔ جہاں احتشام صاحب ملازمت کرتے تھے۔ وہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ ان کا بچپن نہایت ہی عیش وعشرت میں گزرا۔ اس کے بعد واپس الہ آباد آ گئے۔ مارچ 1913 میں گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد میں آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ یہیں سے انھوں نے انٹر کیا۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ کا رخ بھی کیا لیکن وہاں سے جلد واپس آ گئے۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکے لیکن بلا کی ذہانت اور حافظہ تھا۔ اتنی مصروفیات کے باوجود مطالعہ جاری رکھا اور جلد ہی کئی زبانوں پر دسترس حاصل کر لی، اپنی ساڑھے تین صفحے کی خودنوشت بشیر ہندی کی مرتب کردہ کتاب میرا پسندیدہ افسانہ میں لکھتے ہیں:

''بچپن کھیل کود میں گزارا جس کی وجہ سے انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکا خیریت یہی ہوئی کہ انگریزی اردو کے ساتھ ہی فارسی، ہندی اور کچھ کچھ بنگلہ، گجراتی اور سنسکرت سے بھی واقف ہو گیا۔''[1]

شادی

اعظم کریوی نے چار شادیاں کی تھیں۔ ان چاروں بیویوں سے اولادیں تھیں۔ اعظم کریوی کی پہلی بیوی کا نام خلیق النسا تھا جو ان کے قریبی رشتے داروں میں سے تھی۔ یہ پہلی شادی انھوں نے لکھوترا کے مطابق سترہ سال کی عمر میں کی تھی۔ اگر یہ سترہ سال کی عمر میں کی تو پھر 1916 میں کی ہوگی۔ ان کے بطن سے ایک بیٹے آفتاب احمد اسلم پیدا ہوئے تھے جو اعظم کریوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور یہی ایک ہندوستان میں رہے باقی سب پاکستان چلے گئے۔ خلیق النسا بیگم صاحبہ کی عمر بہت کم ہوئی تھی۔ جب یہ فوت ہو گئیں تو اس کے بعد اعظم کریوی نے دوسری شادی میرٹھ میں ایک ہندو دکشت عورت سے کی تھی جو بیوہ تھی اور اس کا بعد میں نام تبدیل ہو کر چاند سلطانہ ہوا۔ یہ ایک جج کی بیٹی تھیں۔ ان کی اس شادی سے متعلق ان کا افسانہ کنول ہے۔ ان کی یہ دوسری شادی پہلی عالم گیر جنگ کے دوران یعنی لگ بھگ 18-1917 میں ہوئی اور ان کے بطن سے مہتاب احمد ہوئے جو 1941 میں تقریباً بائیس سال کی عمر میں میرٹھ میں ایک نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے۔ چمن لال لکھوترا کے مطابق دوسری شادی ان کی پچیس سال کی عمر میں ہوئی اگر یہ پچیس سال کی عمر میں ہوئی تو پھر سنہ 1924 میں ہوئی ہوگی۔ لیکن میرا پسندیدہ افسانہ میں اعظم کریوی خود لکھتے ہیں کہ:

''میرے لیے 14 جون 1941 کی منحوس تاریخ تھی کہ میرا لخت جگر مہتاب احمد جس نے بائیس سال میں قدم رکھا تھا اور امسال بی اے کا امتحان دینے والا تھا۔ میرٹھ سے تیرہ میل نہر گنگ میں نہاتے ہوئے اتفاقاً ڈوب کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔''[2]

اعظم کریوی نے سب سے پہلے الہ آباد میں فوج میں جانوروں کے ہسپتال میں عارضی سویلین کلرک کے طور پر یکم ستمبر 1921 میں ملازمت شروع کی۔ جب ان کی عمر بائیس سال تھی۔ یہیں پر 28 مارچ 1922 سے مستقل طور پر کام کرنے لگے اور برصغیر کے مختلف شہروں میں ان کی ملازمت رہی۔ اس ملازمت میں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ فوج سے 1951 کے آس پاس سبکدوش ہوئے۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ 1941 میں مہتاب احمد کی عمر بائیس سال تھی جب کہ لکھوترا کے مطابق پندرہ سولہ سال بن رہی ہے۔ اس طرح ان کی دوسری شادی لگ بھگ 18-1917 میں ہوئی ہوگی۔ اس شادی سے مہتاب احمد کے بعد ان کی یہ سات بیٹیاں خورشید سلطانہ، اختر سلطانہ، قمر سلطانہ، ثریا سلطانہ، نجمہ سلطانہ، شمع سلطانہ اور ناہید اعظم ہوئیں۔ قمر سلطانہ آٹھ ماہ کی عمر میں وفات پا گئیں اس طرح ان کی چھ بیٹیاں رہ گئیں۔

ان کی اس تیسری شادی سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں یعنی افتخار احمد، زینت النسا، تہذیب النسا، نیر اعظم اور فرحت یاسمین پیدا ہوئیں۔ واضح رہے کہ اس بیوی سے پہلے شوہر کی بھی تین اولادیں تھیں یعنی عزیز احمد، حبیب احمد اور شمس النسا۔

اعظم کریوی کی چوتھی شادی بھی بیوہ خاتون سے ہوئی تھی۔ ان کا نام خیر النسا بیگم تھا ان سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں یعنی سلیم اعظم، خالد اعظم، صالحہ اور صبوحی۔

ملازمت

اعظم کریوی نے سب سے پہلے الہ آباد میں فوج میں جانوروں کے ہسپتال میں عارضی سویلین کلرک کے طور پر یکم ستمبر 1921 میں ملازمت شروع کی۔ جب ان کی عمر بائیس سال تھی۔ یہیں پر 28 مارچ 1922 سے مستقل طور پر کام کرنے لگے اور برصغیر کے مختلف شہروں میں ان کی ملازمت رہی۔ اس ملازمت میں وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ فوج سے 1951 کے آس پاس سبکدوش ہوئے۔ اس طرح اعظم کریوی نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ مدت فوج میں گزاری یعنی چھپن سالہ زندگی میں لگ بھگ ہر دوسرا دن فوج میں گزارا اور 1952 میں وہ 'مجاہد اخبار' سے سبکدوش ہوئے۔ یہ ایک فوجی اخبار تھا اور اس اخبار سے اعظم کریوی 1948 سے ہی وابستہ ہو گئے تھے۔

شخصیت

سید ضمیر جعفری اعظم کریوی کی زندگی کے آخری ایام کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''دبلے پتلے، لاغر کمزور آنکھیں، اندر کو کہیں اتنی دور چلی گئی تھیں کہ چہرے پر ناک ہی رہ گئی تھی، مگر اس کے باوجود بلا کے مستعد تھے۔ غضب کے چوکس اور چوبند، کارفرما و کارکشا۔ دیکھنے میں وہ تکان کا مجسمہ دکھائی دیتے مگر تھکنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اس مقام پر تھے جہاں تکان خود تھک کر بیٹھ جاتی۔ ایک پرانی ٹوٹی پھوٹی بائی بائسکل ان کے پاس تھی۔ اس پر سوار زمین کا گز بنے

ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے۔"[3]

چھپن سالہ عمر میں چار شادیاں، اٹھارہ اولادیں، تیس سال ملازمت، گیارہ افسانوی مجموعے، شاعری، دو تنقیدی کتابیں، مضامین اور کئی رسائل کی ادارت یقیناً حیرت انگیز بھی ہے اور ہمہ جہت بھی۔ شخصیت میں حد درجے کی خودداری تھی، ہنس مکھ اور نہایت ہی محنتی اور ذہین تھے۔ اس بات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے انٹر میڈیٹ تک ہی تعلیم حاصل کی لیکن ہندی، اردو، انگریزی، فارسی، بنگلہ اور گجراتی وغیرہ زبانوں سے واقفیت اور پھر ہیومیوپیتھی کے ڈاکٹر بھی ہوئے۔ ملازمت سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ اعظم کریوی نے زندگی کا آدھ حصہ گھر پر گزارا اور آدھ حصہ باہر چوں کہ وہ فوج میں ملازم تھے اس لیے فوج کی جو پابندی ہوتی ہے اس سے ڈاکٹر اعظم کریوی کی زندگی میں حرارت اور وقت کی قدر جیسے پہلو رچ بس گئے

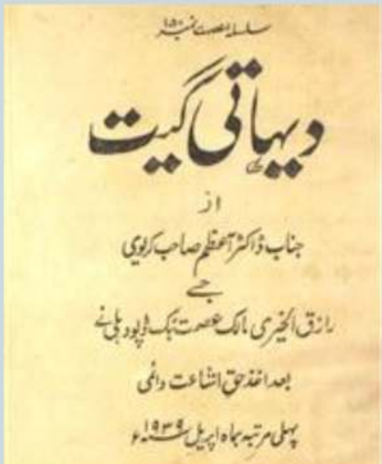

تھے اور بظاہر زندگی پر مشقت اور جفاکش تھی لیکن یہی چیزیں انسان کو محنتی، ذہین اور مضبوط بناتی ہیں۔

گھریلو یا خانہ داری معاملوں میں اعظم کریوی سخت تھے۔ مزاج میں ضد تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوگی کہ چونکہ ان سے پہلے ان کے والدین کی اولادیں فوت ہو جایا کرتیں تھی، بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد یہ بچ پائے تھے، اس لیے گھر لاڈلے اور چہیتے تھے جس سے طبیعت میں خودداری، خود اعتمادی اور جرأت مندی پیدا ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پہلا افسانہ 1921 میں چھپا اور اس کے بعد یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا لیکن ان کو مجموعوں کی شکل میں یکجا کرنے کی نوبت 1942 میں آئی، اس کا جواز خود ان ہی زبانی دیکھیے:

"سیکڑوں افسانے لکھ چکا ہوں مگر اب تک ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ملازمت کی وجہ سے میں خود شائع نہیں کرا سکتا تھا۔ سرمایہ دار پبلشروں نے صرف چند ٹکوں کے عوض میں میرے افسانوں کو خریدنا چاہا۔ اگر میں اس کے لیے راضی ہو جاتا۔ تو اب تک کئی مجموعے میرے افسانوں کے شائع ہو جاتے لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ ضرور پسند کیا کہ گمنام افسانہ نگار کی حیثیت سے اس دنیا سے کوچ کر جاؤں مگر سستے داموں اپنے افسانوں کو کبھی نہ فروخت کروں گا۔ چنانچہ میں اب تک اپنے اسی عہد پر قائم ہوں۔"[4]

اعظم کریوی کی شخصیت کے متعلق ان پہلوؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پختہ کردار کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں خود اعتمادی، اور اختراعی صلاحیت موجود تھی جس سے وہ نہ صرف انسان سے انسان کے تئیں بلکہ تمام موجودات کے تئیں حساس فکر اور مثبت سوچ رکھنے والے شخص نظر آتے ہیں۔ اعظم کریوی کے دل میں نچلی ذات کے لوگوں کے متعلق وہی ہمدردی تھی جو ان کی دوسرے عزیزوں کے ساتھ تھی۔ وہ چھوٹی ذات کے لوگوں کے ساتھ نہ صرف بے تکلف باتیں کرتے تھے بلکہ ان کا دکھ بھی بانٹا کرتے تھے۔ ان کو تمام زندگی میں بیشمار نشیب و فراز، مصائب و مشکلات اور آخری زندگی میں تنگدستی جیسی صورت حال کا سامنا رہا لیکن انھوں نے کبھی بھی نہ کسی سے اس کا اظہار کیا اور نہ ہی کسی کو ملامت اور برا بھلا کہا حتیٰ کہ وہ اپنی بیویوں سے بھی اختلاف ہونے کے باوجود نہایت حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ فوج سے سبک دوش ہونے کے بعد اعظم کریوی غم روزگار میں مبتلا رہے اور ان کو پے در پے کام تو ملتے لیکن نہ ہی اس سے ان کو معقول آمدنی ہوتی تھی اور نہ ہی یہ کام مستقل رہتے تھے۔ وہ گہری سوچ و فکر میں لاغر اور کمزور ہو چکے تھے لیکن حوصلہ بلند تھا۔ مثال کے طور پر جب دکھیا کی کہانیاں لکھیں تو اس وقت اعظم کریوی کو دھمکیاں بھی ملیں لیکن وہ ڈرے نہیں، مسلسل لکھتے رہے اور بالآخر یہی کہانیاں ان کی موت کا سبب بنیں۔ دکھیا کی کہانیاں مظلوم عورتوں کی کہانیاں تھیں جو وہ رسالہ عصمت میں لکھتے تھے اور جن سے ان کو معاوضہ بھی ملتا تھا۔ اعظم کریوی ایسے مضبوط کردار کے مالک تھے کہ انھوں نے ان مظلوم عورتوں کی حالت زار کی عکاسی کرنے کی پاداش میں اپنی جان قربان کر دی۔

وفات

اعظم کریوی نے اگست 1954 سے ماہنامہ عصمت کراچی میں دکھیا کی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ابھی پانچ کہانیاں ہی لکھ پائے تھے کہ ان کی موت کا پیغام آ گیا۔ یہ مظلوم عورتوں کی کہانیاں تھیں۔ شریف، مظلوم اور نادار لوگوں نے ان کو پسند کیا اور خوشی اور شکریے کے خطوط ان کے پاس آنے لگے لیکن چند سنگ دل مردوں کو ان کا یہ کام پسند نہیں آیا اور ان کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔

"ہوشیار ہو جاؤ! تم سے اور اس سے بھی جس نے تم سے کہانی لکھوائی ہے بدلہ لوں گا... اب تم زندہ نہیں رہ سکتے۔"[5]

جواباً اعظم کریوی عرض کرتے ہیں کہ میں ایسے پروانوں کے متعلق صرف اتنا ہی کہنا ضروری سمجھتا ہوں "دشمن اگر قوی است، نگہبان قوی تر است" اگر ظالم مردوں کی ستائی ہوئی بے کس و مظلوم عورتوں کی ہمدردی میں میری جان بھی چلی جائے تو میرے لیے فخر و انبساط کا باعث ہوگا، موت کا ایک دن مقرر ہے۔ وقت سے پہلے کسی کو موت نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اعظم کریوی اندھیرے اور اجالے کا خوف کیے بغیر گھر سے نکل پڑتے تھے۔ ایک دن وہ ڈرگ روڈ کالونی سے اپنی سائیکل پر کراچی کی طرف جون 22-21 کی درمیانی شب 1955 کی تقریباً آدھی رات کے وقت آ رہے تھے کہ نامعلوم افراد نے انھیں قتل کر دیا۔

دوسرے دن ان کی وفات کی خبریں اس وقت کے تمام اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اعظم کریوی کی وفات کی خبریں حامد کمال ناروی نے اس وقت کے مختلف اخبارات سے تراش کر ان کے افسانوی مجموعوں اور اپنے مقالے میں بھی شامل کی ہیں۔ ان کی وفات پر رئیس امروہوی نے اپنے قطعے میں یوں اظہارِ غم کیا تھا۔

ڈاکٹر اعظم کریوی جیسے دانش ور کا قتل
اے عروسِ فنِ افسانہ ترا جو بن گیا
اجنبی قاتل کے ہاتھوں قتل ہو کر اک ادیب
اپنے پر اسرار افسانوں کا 'ہیرو' بن گیا

اعظم کریوی اردو افسانے کے تشکیلی دور کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے گیارہ مجموعے شائع ہوئے۔ ان کی کہانیوں کی کل تعداد ایک سو تینتیس بنتی ہے جن میں تقریباً نصف افسانے گجراتی، ہندی اور بنگالی وغیرہ زبانوں سے ترجمہ، تصرف اور ترمیم ہیں اور باقی افسانے طبع زاد ہیں۔ ان کے حالات زندگی کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ ان کا افسانوی دور 1941 سے لے کر 1955 تک ہے۔

■

Abdul Kyoum
Research Scholar
Dept of Urdu, MANUU
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9622749085

وجود کے ٹکڑے اور نسیم اقتدار علی

عشرت ناہید

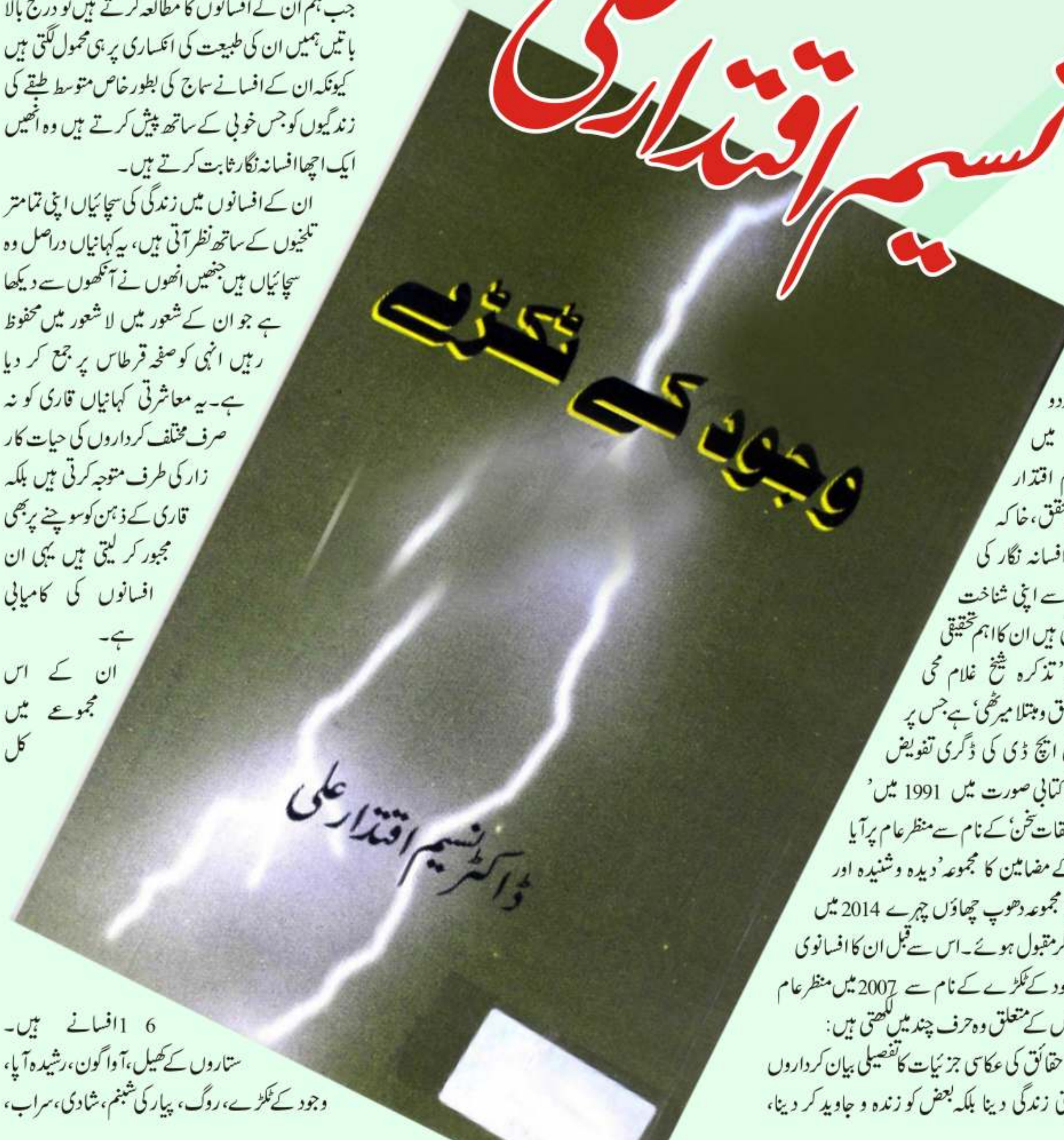

اردو ادب میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی ایک محقق، خاکہ نویس، افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرتی ہیں ان کا اہم تحقیقی کارنامہ 'تذکرہ شیخ غلام محی الدین عشق ومبتلا میرٹھی' ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی جو کتابی صورت میں 1991 میں 'تذکرہ طبقات سخن' کے نام سے منظر عام پر آیا ۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'دیدہ وشنیدہ اور خاکوں کا مجموعہ دھوپ چھاؤں چہرے 2014 میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ اس سے قبل ان کا افسانوی مجموعہ وجود کے ٹکڑے کے نام سے 2007 میں منظر عام پر آیا۔ جس کے متعلق وہ حرف چند میں لکھتی ہیں:

''حقائق کی عکاسی جزئیات کا تفصیلی بیان کرداروں کو دھڑکتی زندگی دینا بلکہ بعض کو زندہ و جاوید کر دینا، ماحول کو ہمنوا بنانا، پس منظر میں رنگ آمیزی کرنا، زبان و بیان کے ذریعہ جادو جگانے اور قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لینا یہ بڑے فنکاروں اور ادیبوں کا کام ہے۔ میں نے تو ایک چھوٹے سے کینوس پر کچھ خاکے بنائے ہیں۔ ان میں مناسب وموزوں رنگ آمیزی مجھ سے نہ ہو سکی جس کا مجھے اعتراف ہے۔''

نسیم اقتدار علی کے نزدیک کہانیاں لکھنا ایک ایسا فن ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کیونکہ زبانی کہانی سنانا آسان ہے اسے تحریری شکل دینے میں بہت سارے لوازمات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ وہ یہ تمام باتیں وہ اپنے مجموعے میں حرف چند میں لکھ تو دیتی ہیں لیکن جب ہم ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو درج بالا باتیں ہمیں ان کی طبیعت کی انکساری پر ہی محمول لگتی ہیں کیونکہ ان کے افسانے سماج کی بطور خاص متوسط طبقے کی زندگیوں کو جس خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ انھیں ایک اچھا افسانہ نگار ثابت کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں زندگی کی سچائیاں اپنی تمامتر تلخیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں، یہ کہانیاں دراصل وہ سچائیاں ہیں جنھیں انھوں نے آنکھوں سے دیکھا ہے جو ان کے شعور میں لاشعور میں محفوظ رہیں انہی کو صفحہ قرطاس پر جمع کر دیا ہے۔ یہ معاشرتی کہانیاں قاری کو نہ صرف مختلف کرداروں کی حیات کار زار کی طرف متوجہ کرتی ہیں بلکہ قاری کے ذہن کو سوچنے پر بھی مجبور کر لیتی ہیں یہی ان افسانوں کی کامیابی ہے۔

ان کے اس مجموعے میں کل 16 افسانے ہیں۔ ستاروں کے کھیل، آواگون، رشیدہ آپا، وجود کے ٹکڑے، روگ، پیار کی شبنم، شادی، سراب،

سفر، چیخ، نظر بند، دیوار، بدلتے رنگ، جڑیں، پٹی گلی۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ستاروں سے کھیل اور 'وجود کے ٹکڑے' تقریباً ایک جیسے موضوع پر ہیں دونوں میں ہی محبت کے مثلث کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے، ستاروں کے کھیل افسانے میں تین کردار ہیں نفیسہ، تکریم اور ارشد جن کا بچپن ایک ہی گھر میں گزرتا ہے لیکن ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ ارشد ایک یتیم بچہ ہے جسے اپنے یتیم ہونے کا اور کسی دوسرے گھر میں رہنے کا احساس بھی ہے۔ جسے افسانہ نگار کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

''ارشد بہت سمجھدار تھا وہ اس گھر میں اپنی حیثیت سمجھتا تھا، کھیل کود میں خوشی سے اپنی ہار مان لیتا بعض دفعہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا وہ جانتا تھا کہ اس کا اور تکریم کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔'' (ص 12)

تینوں ساتھ ساتھ بڑے ہوتے ہیں تینوں کی دوستی کا مثلث ہے، دونوں ہی نفیسہ سے محبت کرتے ہیں لیکن وہ تکریم کی قسمت میں ہے کیونکہ وہ تکریم کے ٹھیکرے کی مانگ تھی، نفیسہ کو نہ پاسکنے کا ذمے دار وہ اپنی غریبی اور یتیمی کو ٹھہراتا ہے، وہ ان کے گھر سے بنا کسی کو کچھ بتائے چلا جاتا ہے۔ لیکن وہ نفیسہ کی اڈوں سے کبھی نہیں نکل پاتا ہے یہاں تک کہ نفیسہ کی شادی تکریم کے ساتھ ہو جاتی ہے لیکن وہ تکریم کی قربت کے لمحوں میں ہمیشہ اپنے محبوب کو متصور کر لیتی یوں وہ اپنے شوہر کو اور اپنی زندگی کو بظاہر اطمینان بخش ظاہر کر دینے میں کامیاب رہتی ہے۔ نفیسہ اپنے محبوب کی محبت کو کبھی بھلا نہیں پاتی ہے، اور ایک دن جب وہ ملتا ہے تو اس کے روپ کو دیکھ کر وہ چونک اٹھتی ہے، ارشد نے اپنا حلیہ پوری طرح بدلا ہوا تھا ''اس نے اپنے چہرے سے نقلی چہرہ اتارا تو نفیسہ کا سر اتنی زور سے چکرایا کہ اگر وہ کرسی کو مضبوطی سے تھام نہ لیتی تو لڑھک کر نیچے گر جاتی، ایک عرصے بعد ارشد کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر وہ کانپ گئی۔'' (ص: 14)

نفیسہ نے جب اس کے حالات جاننا چاہے تو اس کے وجود کی پرتیں بھی کھلتی گئیں کہ وہ نفیسہ سے شادی نہ ہونے پر اتنا بد دل ہوا کہ گھر چھوڑ کر جب نکلا تو غلط راہ پر پڑ گیا، اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو گئی اور اس نے عورت کو ایک کھلونے کی طرح استعمال کرنے لگا، اس کے ذہن میں یہ بات بھی رہی کہ غربت کی وجہ سے بھی وہ اپنی محبت کو پا نہ سکا اس لیے دولت کو وہ ہر طرح سے کمانے میں لگ گیا، اور آخری روپ دیکھ کر نفیسہ کو ارشد سے محبت کرنے کے جرم میں خود سے ہی نفرت سی محسوس ہونے لگی ''اچانک وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا ''ارے بہت دیر ہو گئی۔ مجھے ابھی پلین پکڑنا ہے'' اور اس نے جیب سے رنگین شیشوں والی عینک نکال کر لگائی یہ تیز روشنیاں اس کی چندھی آنکھوں کو اور بھی چندھیائے دے رہی تھیں اور پھر اس چہرے پر خوفناک مونچھوں کا اضافہ کر کے مسکرایا ''اب مجھے اچھی طرح پہچان لو یہ ہے میرا اصلی روپ سریندر سنگھ مشہور زمانہ اسمگلر'' نفیسہ اتنے سال جس محبت کو گلے سے لگائے ہوئے تھی اس کے اس انجام پر دل برداشتہ ہو اٹھتی ہے، اس گھناؤنے روپ کو وہ برداشت نہیں کر پاتی ہے اور اپنے عزیز شوہر تک سے دور ہو جاتی ہے لیکن پھر تکریم کی محبت اسے اپنی دنیا میں کھینچ لاتی ہے۔

افسانہ رشیدہ آپا سماج کی اس دکھتی رگ کی طرف متوجہ کرتا ہے جہاں والدین جوان بیٹیوں کی طرف سے لا پرواہ ہو جاتے ہیں، ان کی شادی کو اپنی ذمے داری یا فرض نہیں گردانتے ایسے میں لڑکیاں گھٹ گھٹ کر یرقان میں مبتلا ہو جاتی ہیں یا پھر باغی ہو کر اپنا راستہ خود چن لیتی ہیں۔ رشیدہ آپا خوبصورت نہیں ہیں لیکن ہنر مند ہیں، انھیں زندگی کو بھر پور طریقے سے جینے کی اور زندگی سے وابستہ ہر خوشی کو پانے کی چاہ ہے لیکن ان کے والد جو کہ پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں نہ صرف بیٹی کی طرف سے بے نیازی برتتے ہیں بلکہ ہر طرح کی پابندی میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشیدہ آپا چونکہ جوان ہیں ان کے اندر خواب تمنائیں اور آرزوئیں بھی جوان ہیں وہ ایک وقت تک تو اپنے ارمانوں کو دبائے رکھتی ہیں لیکن پھر راستے نکال ہی لیتی ہیں اور ماں باپ کے حکموں کی پرواہ کیے بنا جینا شروع کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کسی بھی قسم کی روک ٹوک کو برداشت نہیں کرتی ہیں اور جہاں انھیں جانا ہوتا چلی جاتیں وہ چاہے سنیما دیکھنے جانا ہو کہ مارکیٹ یا پھر محلے میں کسی کے گھر۔ ان کی ودستی گھر کے پیچھے کی طرف رہنے والی ساجدہ سے ہوتی ہے اس کے گھر بہت زیادہ میل جول بڑھتا ہے، ساجدہ کے حاملہ ہونے پر وہ اس کے گھر اور بچوں کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لیتی ہیں اسی دوران دھیرے دھیرے اس کے شوہر شاکر علی خاں کے ساتھ بھی بے تکلف ہو جاتی ہیں اور جب ساجدہ زچگی کے لیے اپنے میکے جاتی ہے تب ان کے تعلقات شاکر علی کے ساتھ اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ محلے میں رسوائی ہی نہیں ہوتی بلکہ خود رشیدہ آپا حاملہ بھی ہو جاتی ہیں۔ تب ان کے والدین کو ہوش آتا ہے اور شاکر علی خاں سے منت سماجت کرتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں ہی ان کا نکاح کر کے رشیدہ آپا کو رخصت کر دیتے ہیں۔

ادھر جب ساجدہ کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ غصے سے بھری واپس آتی ہے اور رشیدہ آپا کو گھر سے نکالنے پر مصر ہوتی ہے تب شاکر علی ساجدہ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رشیدہ پہلے کی طرح تمھارے ساتھ سارے کام بھی کرے گی اور تمھارے بچے بھی سنبھالتی رہے گی لیکن جب ساجدہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا ہے تو ایک ہی بات ایسی کہہ دیتے ہیں کہ ساجدہ چپ ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ''اب چپتی ہے کہ نہیں سوکھی جھانکر بچہ کیا پیدا کرتی ہے چھ مہینہ پلنگ توڑتی ہے نہ کسی کام کی نہ مصرف کی۔ دوسرا نکاح نہ کرتا تو کیا دنیا زمانہ میں منہ کالا کرتا پھرتا۔''

دراصل یہ افسانہ ایک مسئلے پر سے ہی پردہ نہیں اٹھاتا ہے بلکہ شاکر علی خاں کی زندگی کی اہم ضرورت جو کہ ان کی مدقوق بیوی پوری کرنے سے قاصر تھی اسے بھی بیان کرتا ہے۔ یہ افسانہ والدین کی آنکھیں کھول دینے والا افسانہ ہے کہ اگر وہ صرف اپنی زندگی کو دیکھیں گے جیسا کہ رشیدہ آپا کے ابا نے کیا تھا پہلے تو وہ اپنی دنیا میں مگن رہے جب ریٹائر ہوئے تو عبادت میں لگ گئے جسے طنزیہ انداز میں مصنفہ نے لکھا ہے:

''رشیدہ آپا کے ابا نے شادی تو کر لی تھی لیکن اپنے مشاغل میں سے کسی ایک کو طلاق نہ دی۔ یونیورسٹی سے آکر وہ زیادہ تر باہر مردانہ میں اپنی لائبریری میں رہتے اور حمیدہ خالہ اندر دالان میں تخت پر دسیوں گٹھریوں، بقچیوں میں گھری خدا معلوم کیا ادھیڑا سیا کرتیں۔

خالو اب ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے اور ملازمت سے کیا ریٹائر ہوئے جیسے دنیا ہی سے ریٹائر ہو گئے اور بس اللہ میاں سے ناطہ جوڑ لیا۔ ہر وقت اوراد و وظائف میں مشغول رہتے جیسے اتنے دنوں تک اللہ میاں کو بھلائے رکھنے کا ازالہ کر رہے ہوں۔'' (وجود کے ٹکڑے)

رشیدہ آپا اس طرح کے ماحول میں جوان ہوتی ہیں ان کے رشتے آنے پر بھی شادی کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ تب جوان لڑکی بغاوت کا راستہ اختیار کر لیتی ہے کیونکہ فطری خواہشوں پر قابو پانا کسی جہاد سے کم نہیں ہوتا۔ اسی طرح شاکر علی خاں کی بھی اپنی ضرورتیں ہیں جنھیں ان کی بیوی پورا نہیں کر پاتی ہے۔ اس افسانے میں مصنفہ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت کی نفسیات کو اجاگر کر دیا ہے۔ بلا شبہ ان کا یہ افسانہ ایک بہترین افسانہ ہے۔

افسانوی مجموعے کا جو عنوان ہے اسی نام سے یعنی 'وجود کے ٹکڑے' عنوان سے بھی ایک افسانہ شامل ہے۔

جو کہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں ایک عورت کی باطنی کیفیات کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس کا مرکزی کردار خالدہ اپنی بارہ سال پرانی محبت کے حصار میں زندگی گزارتی نظر آتی ہے ایک ایسی محبت جو اسے نہ مل سکی لیکن وہ اس پر اتنی زیادہ طاری رہی کہ اس کی وجہ سے خالدہ اپنی اصل زندگی سے خوشیاں کشید نہیں کر پاتی ہے وہ اپنے آپ کو ایک مشین بنائے رکھتی ہے جو فیڈ کیے ہوئے کاموں کو کرتی رہتی ہے لیکن جذباتی طور پر اس کے اندر اپنے سے وابستہ رشتوں کے لیے گرمجوشی نہیں ہوتی، ان رشتوں سے وہ بیزاری محسوس کرتی ہے جبکہ وہ رشتے اس کے ساتھ خلوص رکھتے ہیں۔ارشد جو کہ اس کا شوہر ہے وہ مشرقی روایتی شوہر ہے جو نہ صرف اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے بلکہ بہت اعتماد بھی کرتا ہے جس کا اظہار افسانے میں خالدہ کی باتوں سے ہوتا ہے، خالدہ کے تین بچے ہیں، جن کے لیے وہ سب کچھ کرتی ہے ماں ہونے کے ناطے ان کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے شوہر کے فرائض بھی ادا کرتی ہے لیکن اس سب کو کرتے ہوئے اسے اپنی ذات کا ادھورا پن ہمیشہ بے چین رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ان سب سے خوشیاں کشید نہیں کر پاتی، ایسے میں ایک دن اچانک اس کے سابقہ محبوب اسلم کا فون آجاتا ہے وہ اسے ملنے کے لیے اپنے گھر بنا کسی خوف و تردد کے بلا لیتی ہے اور اسے شام تک اپنے گھر رکنے پر اصرار بھی کرتی ہے۔جبکہ اس کا دوست جو اس کے شوہر سے بھی واقف ہے اس کی جذباتیت سے گھبرا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ارشد کی غیر موجودگی میں اس کا دیر تک رکنا مناسب نہیں لیکن خالدہ بضد رہتی ہے یہاں تک کہ اسے ڈرپوک تک کہہ دیتی ہے تب وہ کہتا ہے کہ:

''نہیں خالدہ یہ بات نہیں ہے تم خود سوچو اب تم ایک ماں ہو ایک بیوی ہو تمھاری پرسکون گھریلو زندگی ہے میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمھاری خوشیوں پر آنچ آئے۔'' (ص 41)

تب خالدہ اپنے باطن کا حال بیان کر بیٹھتی ہے وہ یہ بھی بتا دیتی ہے کہ اب تک اس کے دل میں ارشد کے لیے کیسی امیدیں پل رہی ہیں۔

'' خالدہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی '' اسلم تم کیا جانو سکون کے لیے تو میں ترستی ہوں۔ یہ تو شاید اب مجھے مر کر ہی نصیب ہوگا اور کبھی کبھی تو ڈر لگتا ہے کہیں قبر میں بھی ایسی ہی نہ تڑپتی رہوں۔ رہی بات بچوں کی تو وہ ارشد کے بچے ہیں میں تو صرف انھیں پیٹ میں رکھنے کی گنہگار ہوں مجھے تو لگتا ہے کہ میں اب بھی وہی پہلی والی تمھاری خالدہ ہوں تم کسی دن آؤ گے اور میں ارشد کا گھر اور بچے انھیں سونپ کر تمھارے ساتھ چل دوں گی'' (ص 41)

اسلم بھی اس کی محبت کو بھولا نہیں ہے لیکن وہ ہوشمند ہے اس لیے اس کی جذباتی باتوں کے جواب میں خود پر قابو رکھتا ہوا دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔اس کے جانے کے بعد خالدہ کے جذبات میں مزید شدت پیدا ہوتی ہے اور وہ بے تحاشا بلک بلک کر رو پڑتی ہے یوں اس کے اندر کا سالوں سے بھرا غبار بہہ نکلتا ہے۔اس کا وجود ٹوٹنے بکھرنے لگتا ہے اسے محبوب ملتا ہے لیکن اب بھی وہ اسے پا نہیں سکتی۔لیکن جب اس کے بچے اسکول سے گھر آتے ہیں ان کی محبت اسے دوبارہ حالیہ زندگی کی طرف لوٹا لاتی ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اب تک سراب کے پیچھے دوڑ رہی تھی اس کی اصل زندگی تو وجود کے ان ٹکڑوں میں نہاں ہے یہ خیال ہی اسے سکون عطا کر دیتا ہے۔

مصنفہ نے بڑی خوبی کے ساتھ ایک ناکام محبت کے دائرے میں محصور خالدہ کو زندگی کا ادراک کروایا ہے۔ اس کے ظاہر و باطن کی کشمکش کو کمال خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔اس افسانے کو ہم اصلاحی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو لڑکیاں اپنی حساسیت کی بنا پر زندگی کی سچائیوں کو قبول نہیں کر پاتی ہیں وہ درحقیقت اپنی خوشیوں کا اور اپنے سکون کا قتل کر رہی ہوتی ہیں۔ ماضی کو بھول کر حال کو قبول کر لینا ہی زندگی کو آسان اور خوشنما بناتا ہے۔

نسیم اقتدار علی کے ہر افسانے میں ایک ایسا موضوع ہے جو معاشرے کی ایک بڑی سچائی کو سمیٹے ہوئے ہے۔

جڑیں ایک ایسا افسانہ ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور ساری خوبصورتی اس کی جڑوں یعنی اس کے وطن میں ہی ملتی ہیں۔ جس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ پر آباد ہو جانا آسان تو ہوتا ہے لیکن جب بڑھاپا آتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ کہانی ایک بوڑھے کی جسمانی کیفیت کے بیان سے شروع ہوتی ہے کہ اب اس کی آنکھوں کی روشنی کم ہو چکی ہے وہ تو اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ زیادہ دور تک چل بھی نہیں پاتا۔ایک ایک قدم وہ بہت سنبھل سنبھل کر اٹھاتا ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ اگر وہ گر گیا اور اگر کہیں کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تو اس کی تیمارداری کرنے والا کوئی نہیں ہے تو اس کا کیا ہوگا۔ یہ خوف اسے چلنے پھرنے سے روکے ہوئے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بالکل اکیلا ہے اس کی بیوی ہے لیکن وہ اپنی دنیا میں مگن ہے یہ کہانی تہذیبوں کی بدلتی صورت کا بھی آئینہ ہے۔ دکھاوا، نمائش کس طرح انسانی رشتوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔درج ذیل اقتباس اس کی بہترین منظر کشی کر دیتا ہے۔

'' ایک ہاتھ میں خالی مگ تھامے، دوسرے ہاتھ سے زینے کی ریلنگ کا سہارا لیے وہ اپنے کمرے میں گیا، لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر دوسری منزل پر واقع کھانے کے کمرے میں لنگڑاتا ہوا داخل ہوا۔ بائیں پیر کا گھٹنا اب بہت تکلیف دینے لگا تھا، بیگم شاہینہ سلطان قرمزی رنگ کی ساری اور بغیر آستین کا بلاؤز پہنے اسی رنگ کی لپ اسٹک لگائے کافی اسمارٹ نظر آ رہی تھیں، وہ ناشتہ ختم کر چکی تھیں، پلیٹ میں کانٹا چھری سیدھا سیدھا رکھ کر نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے، ہیرے کی انگوٹھیوں کو برابر کرتی ہوئی مخاطب ہونے سے پہلے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولیں:'' ایک ڈگڈگی کی کمی ہے وہ بھی لے لیجیے بے پیسے کے تماشہ ہوا کرے گا۔''

شاہینہ کا برتاؤ مرکزی کردار کی بے چارگی کو قاری کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ یہ معاشرتی کہانی قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔مرکزی کردار اپنی جڑیں چھوڑ کر دوسری جگہ آبسا ہے جہاں تہذیب نے نئے رنگ اختیار کر لیے ہیں۔وہ عمر کے آخری پڑاؤ میں تنہائی کا شکار ہے، وہ باغبانی کر کے کسی نہ کسی طرح اپنا وقت گزارنا چاہتا ہے لیکن اس کی مغرب زدہ فیشن ایبل بیوی شاہینہ کو یہ سب اپنے اسٹیٹس کے خلاف لگتا ہے۔

''یہاں گھر میں اللہ کا دیا کیا نہیں ہے، خانساماں، بیرہ، ڈرائیور اور چوکیدار سب ہیں لیکن ایک مالی نہ رکھنے کی آپ کی ضد ہے اور وہ بھی شاید مجھے جلانے کے لیے۔''

جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی ہے اس کی آنکھوں کی بینائی اور سماعت دونوں کمزور ہوتی جاتی ہیں۔ اس کی اکلوتی بیٹی دور دیس میں ہے، بیوی کی جڑیں چونکہ اسی شہر میں ہیں اس لیے اسے تو کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا، یہاں اس کے رشتے دار ہیں دوست ہیں جن میں وہ مگن ہے، جبکہ وہ ملازموں کے رحم و کرم پر ہے ایسے میں اسے اپنا گاؤں اپنا گھر یاد آتا ہے اور اسے احساس ہوتا کہ اس نے اپنی جڑوں کو چھوڑ کر بڑی بھول کی۔اسے یاد آتا ہے کہ بڑے بھیا نے اپنا گاؤں اپنی جڑوں کو نہیں چھوڑا وہ آج بھی آباد ہیں۔نسیم اقتدار علی کا افسانہ قاری کو ماضی کی یادوں اور پچھتاوے کی دنیا میں لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔

افسانہ شادی ایک نفسیاتی مریض کی زندگی بیان کرتا افسانہ ہے یہ افسانہ نہ صرف اس مریض کی حالت بیان کرتا ہے بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ سماج کتنا بے

رحمانہ سلوک کرتا ہے اسے مصنفہ نے نہایت سچائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے، سماج کی بے حسی پر یہ ایک گہرا طنز ہے۔ اس کا مرکزی کردار چھدو ہے جو کم ذہن ہے لیکن چونکہ جوان ہے اس لیے اس کے اندر تمام جذبات بھی ہیں، اس کے اندر جنسی جذبہ بھی موجود ہے اور زندگی کے دوسرے عوامل بھی کارفرما ہیں اس کی اس کیفیت کا اسی کے گاؤں کے چند لوگ مذاق کا موضوع بناتے ہیں اور اس کی زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔ جب محلے میں بہت دنوں تک کسی قسم کی کوئی ہلچل نہیں ہوتی ہے، نہ کسی کا شادی بیاہ، نہ کوئی لڑکی بھاگی، نہ کوئی ناجائز اولاد گھورے پر ملی تو گاؤں کے چند اوباش تفریح کے لیے چھدو کو نشانہ بنا لیتے ہیں یہیں سے افسانے میں وہ درد کی لہریں چلنے لگتی ہیں جو سماج کے غلیظ چہرے کو قاری کے سامنے آہستہ آہستہ بے نقاب کرتی ہیں۔

دراصل چھدو اپنے بھائی کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھتا ہے تو اس کے اندر فطری خواہشیں انگڑائی لینے لگتی ہے جس کی وجہ سے اس میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور اسے دورہ پڑ جاتا ہے۔

جب بھی اس پر تشنجی کیفیت طاری ہو جاتی تھی تب اس کی ماں اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈال کر اسے نارمل کر دیتی تھی لیکن جب اس کے چھوٹے بھائی کی شادی ہوئی تو دلہن کو دیکھ کر اس پر پھر شدید تشنجی کیفیت طاری ہوئی، اس کے منہ سے کف نکلنے لگا اور بے قابو ہو کر جب گرا تو چکی سے ٹکرانے کے باعث سخت چوٹ لگی اس کی ماں بے حد پریشان ہوئی اور مدد کے لیے رحمت، جمعہ خاں وغیرہ کو بلا کر لائی۔ جب چھدو ہوش میں آیا تو رحمت نے اس کی دکھتی رگ کو ہی مرہم بنانے جیسی بات کہہ دی۔

''ارے یار کیوں پریشان ہوتا ہے ذرا ٹھیک ہو جا ہم تیری شادی کرا دیں گے'' رحمت کے یہ جملے چھدو کے لیے بہت کارگر ثابت ہوئے۔ رحمت اپنی تفریح کی خاطر اپنی اسی بات کو پورا کرنے کے لیے قبرستان میں رہنے والی فقیرنی شبو سے کہتا ہے اور اسے شادی کے لیے تیار کر لیتا ہے۔

اپنی تفریح اور دل لگی کی غرض سے وہ یہ کھیل کھیل بیٹھتا ہے جس میں گاؤں کے سارے اوباش شریک ہو جاتے ہیں اور مزہ لیتے ہیں۔

مصنفہ اس کا تعارف ہی اس کی شادی کے لیے بنائے گئے حلیے سے کرواتی ہیں۔

''وہ سفید چھالٹین کا کھڑکھڑاتا پائجامہ اور نیل سوسی کا کرتا پہنے تھا سر پر مخمل کی رام پوری ٹوپی تھی۔ منہ پر سرخ رومال رکھے شرم سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

اپنی مسکراہٹ دبائے ہوئے اب پھوپھی اماں بھی چبوترے پر نکل آئیں اور بظاہر ناراضگی سے بولیں۔

اوئی توبہ یہ لونڈوں نے اس موئے کا کیا سوانگ بنایا ہے۔ ارے شیطانو! اللہ کے غضب سے ڈرو کیوں دیوانوں کے منہ لگتے ہو۔ خدا جانے اس دیوانگی کے پردے میں اس پر کس شے کا سایہ ہے۔'' (ص 60)

لیکن لڑکے اس بات کا کوئی اثر نہیں لیتے ہیں۔

جمعہ خاں ''گاجر کی پینڈی گل خیرے کا پھول۔ کہو میاں دولہے تمھیں دولہن قبول'' کہہ کر اس کا نکاح پڑھا دیتے ہیں چھدو بہت خوش خوش اپنی ہی شادی کے بتاشے لوٹتا ہے، اسی ہنگامے کے دوران دولہن شبو کو بھی وہاں سے بھگا دیا جاتا ہے اور تمام لڑکے بھی چلے جاتے ہیں چھدو کے دولہن کے بارے میں پوچھنے پر کہہ دیتا ہے کہ اندر رخصت ہونے گئی ہے۔ اس کے بعد رحمت چھدو کے ساتھ وہ سفاکی کا کھیل کھیلتا ہے جس کے انجام کا اسے خود بھی گمان نہیں تھا۔

''شاگرد پیشہ کی ایک آسیب زدہ کوٹھری میں اندھی لالٹین جل رہی تھی چھدو ازخود اندر چلا گیا ملگجی سی روشنی میں کھٹیا کا جھلنگا اسے چھپر کھٹ نظر آیا اور مکڑی کے جالے جیسے پھولوں کی لڑیاں لٹکی ہوں۔ وہ بہت خوش تھا اور سرخ لڑی نظروں میں بسی ہوئی تھی اتنے میں رحمت کو تنہا آتے دیکھ اس کی گدلی مچچاتی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس نے لپک کر رحمت کا گریبان پکڑ لیا الفاظ کے بجائے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔''

چھدو کی اس کیفیت سے رحمت ذرا ڈر سا جاتا ہے اور اسے کھانا کھانے کا کہہ کر دھوکے سے اسی کوٹھری میں بند کر زنجیر لگا دیتا ہے۔

اس کے بعد چھدو کی جو کیفیت مصنفہ نے بیان کی ہے وہ ہر حساس قاری کے دل کو لرزا دیتی ہے اور انسانیت پر سے یقین اٹھا دیتی ہے۔ چھدو کھانا کھانے کے بعد دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے کیونکہ وہ باہر سے بند ہے، دروازے پر مکے مار مار کر اس کے ہاتھ لہولہان ہو جاتے ہیں اور چیخ چیخ کر آواز بھی بند ہو جاتی ہے، جس وقت وہ ذہنی معذور دروازہ پیٹتا ہے اور چیختا ہے اس کی بے بسی اور بے چارگی پر رحمت اور اس کے ساتھی مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ یہاں مصنفہ کا قلم چھدو کی بے بسی اور بے چارگی کو بہت پر اثر الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

''آدھی رات کو اس کی چیخیں مدھم ہوتے ہوتے تھم گئیں اور جب صبح کو دروازے کی زنجیر کھولی گئی اور رحمت نے ذرا سا پٹ ہٹا کر اندر جھانکا تو خود اس کی چیخ نکل گئی۔ سامنے زمین پر چھدو کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی'' (ص 65)

یہ افسانہ ہر حساس قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے کہ انسان اتنا بھی سفاک ہو سکتا ہے یہ سوال اسے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، ایسے میں سوال اٹھتا ہے کہ اس رات اس کی ماں اور بھائی کہاں تھے اس کا جواب بھی قاری کے ذہن میں ابھر آتا ہے کہ کسی ناکارہ اور معزور انسان کو گھر والے بھی کب اہمیت دیتے ہیں، اس کی زندگی ان کے لیے بوجھ سی بن جاتی ہے کہاں ان کی پرواہ کی جاتی ہے۔ جسے یہ جملہ واضح کر دیتا ہے ''یوں تو اسے کسی بات کی خبر نہ ہوتی وہ کون سا گھر میں رہتا تھا سارا دن گلیوں میں واہی تباہی پھرتا رہتا'' یہ بات پورے سماج کی ذہنیت کی طرف اشارہ کر دیتی ہے کہ اس قسم کے کرداروں کی زندگی کس طرح کی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ماں بھی ہر سال وبائی امراض پھیلنے پر جھولی پھیلا پھیلا کر اس کے مرنے کی دعائیں کرتی ہے 'اللہ پاک اب کی سے چھدو کی مٹی ٹھکانے لگا دے۔ ارے کسی کی آئی اس کو سمیٹ لے جائے'' یعنی ایسے کرداروں کا وجود اس پیدا کرنے والی ذات کے لیے بھی ایسا بوجھ ہے جس سے وہ چھٹکارہ چاہتی ہے۔

بلاشبہ یہ افسانہ اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔

اس مجموعے کے افسانے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ نسیم اقتدار علی نے اپنے افسانوں کا موضوع ان مسائل کو بنایا ہے جنھیں ہم بہت اہمیت نہیں دیتے لیکن وہ کہیں نہ کہیں زندگیوں پر اور معاشرے کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ افسانوں کی زبان انتہائی سادہ ہے اور یہی ان کے افسانوں کی خوبی قرار پاتی ہے وہ سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہہ جاتی ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں اودھ کی مٹتی تہذیب کے نوحے بھی ملتے ہیں اور زوال آمادہ معاشرے کی بدلتی تصویریں بھی جس کی مثالیں ان کے افسانے جڑیں، پٹی گلی اور نظر بند ہیں۔ المختصر ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کے افسانوں کا جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں کے موضوعات ہمارے معاشرے کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں جنھیں انھوں نے فنی چابکدستی سے افسانوی رنگ عطا کر دیا ہے۔

■

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor, Maulana Azad National Urdu University, Lucknow Campus
504/122 Tagor Marg
Near Shabab Market Daliganj
Lucknow-226020 (UP)
Mob.: 09598987727

یاسمین رشیدی

نجمہ نکہت کی افسانوی شعریات

نجمہ نکہت سے میری ملاقات ایک کتاب کے تبصرے کے دوران ہوئی۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'سیب کا درخت' پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ نجمہ نکہت کی کہانیاں تہذیبی وراثت کے کھنڈر میں حاشیے پر پڑی عورت کا بیانیہ ہے۔ ان کے افسانے عورت کے وجود، اس کے خواب، تمناؤں سے معاملہ کرتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نجمہ نکہت کے افسانوں میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میری یہ تحریر نجمہ نکہت کے ان افسانوں پر مشتمل ہے جن میں عورت کے احساسات و جذبات کو آواز دینے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں عورت اپنی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتی برتتی ہے، جہاں وہ اپنی 'دوجی حیثیت' سے انکاری ہے۔

میں یہاں جاگیردارانہ نظام کی خوبیوں و خامیوں کے سیاسی پہلوؤں پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ ہر دور کی اپنی خوبیاں و خامیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خامیاں خوبیوں سے زیادہ ہوں۔ اور اس بات سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظام شاہی دور میں بھی عورت کی حیثیت کم وبیش 'دوجی' ہی تھی۔

ریاست حیدرآباد میں بھی دیگر مقامات کی طرح کئی ایک سماجی برائیاں عرصہ سے چلی آ رہی تھیں اور جن کے اثرات خواتین پر مرتب ہو رہے تھے۔[1]

میری دلچسپی نجمہ کے ان نسوانی کرداروں میں ہے جو نامساعد حالات میں بھی اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹ کر رکھنے کا ہنر جانتی ہیں اور بعض دفعہ مسلسل ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ بھی تلاش کر لیتی ہیں۔

افسانہ 'دو ٹکے کی' میں ندا، 'اسی رہگذر پر' میں شونا، 'سیب کا درخت' میں چاندنی، 'پھر وہی صبح، پھر وہی شام' میں ڈاکٹر کا کردار، 'سکینڈ ہینڈ' میں راجی، 'ریشمی قمیص' میں سائماں اور افسانہ 'ایر کنڈیشنڈ' کا مرکزی کردار وغیرہ کی مثال کہے جا سکتے ہیں۔ نجمہ نکہت نے بالخصوص 'ڈیوڑھی' میں عورت کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

مگر آج جب چھوٹے سرکار نے ایک ذرا سے گلدان ٹوٹ جانے پر اسے دو ٹکے کی باندی کا طعنہ دیا تو وہ تن کے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر کو آنکھوں میں لپکنے والے شعلوں نے آتش فشاں کا خوفناک روپ دھار لیا اور دل سے اٹھا ہوا لاوا آنکھوں میں آنسو بن کے اتر آیا اور آج اس نے اپنے سارے احساسات کو کھلے بندوں لڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔[2]

افسانہ 'ایر کنڈیشنڈ' میں افسانہ نگار نے نوکری پیشہ عورتوں کی روزانہ کی جدو جہد کو لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بات کروں تو روزانہ نوکری سے جڑی مشکلات کے ساتھ ساتھ کتابوں سے رشتہ زندہ رکھنے کے لیے بھی ایک مسلسل جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ میں اس نوکری کا حال بتا رہی ہوں جہاں بنیادی کام ہی پڑھنا پڑھانا ہے۔ پر صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ خود کو زندہ رکھنے کی یہ کوشش بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے لیکن حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دینا اور 'مردہ' ہو جانے کا خیال مجھے اس تھکن سے کہیں زیادہ خوفزدہ کرتا ہے۔

اتوار کے دن پچھلے چھ دنوں کی تھکن بوجھ بن کر اس پر سوار ہو جاتی اور اس دن اس کا جی چاہتا کوئی اس کے پاس نہ آئے... کوئی اچھا شعر سن کر اس پر سر دھننے کی فرصت نہ ملتی۔ شاید ہفتوں گزر گئے تھے کہ اس نے کسی اخبار کو چھوا تھا۔ کسی پرچے کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ دن بہ دن سارے لطیف جذبے سنگ ریزوں میں تبدیل ہو رہے تھے اور قہقہے لگانے، لطیفے سنانے، ہنسنے ہنسانے کی عادت چھوٹتی جا رہی تھی۔[3]

یہاں فلم 'Women Talking' کا تذکرہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں برسوں سے ایک کالونی کی عورتوں کو ڈرگس دے کر، بیہوشی کی حالت میں، مرد اپنی ہوس کا شکار

بناتے آ رہے تھے۔ جہاں عورتوں کو پڑھنے، لکھنے کا حق حاصل نہیں تھا۔

توجہ کا مرکز نجمہ نکہت کے وہ نسوانی کردار ہیں جو نظام شاہی دور، ڈیوڑھی سے جڑے ہیں اور زندگی سے خالی۔ میری دلچسپی کا مرکز وہ عورتیں ہیں جن کی کہانیاں مین اسٹریم بیانیہ میں نظر نہیں آتیں۔

افسانہ 'کھنڈر' کی بات کریں تو یہ صرف نظام شاہی حکومت کے دور کا کھنڈر نہیں بلکہ ان تمام عورتوں/کنواری لڑکیوں کے وجود کا کھنڈر بھی ہے جنھیں اپنا گھر چھوڑ کر 'ڈیوڑھی' کا حصہ بننا پڑا۔ وہ ڈیوڑھی جہاں جبراً لائی گئی عورتوں کی کوئی شناخت نہیں ہوتی؟ کوئی خوشی اپنی نہیں ہوتی؟ شاید ان کی زندگی بھی پرائی ہوتی ہے:

یہاں تو سب کچھ پرایا ہے۔ سہاگ، بچے، گھر بار، نوکر چاکر سب پرائے ہیں۔ کسی چیز میں کوئی حصہ نہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کو وہ اپنی اور صرف اپنی کہہ سکے۔[4]

کھنڈر اور عورت؛ کیا ان دونوں میں آپ کو کوئی مماثلت نظر آتی ہے؟ شاید دونوں کی مٹی مشترک ہے۔

ڈیوڑھی کے کئی حصے گر پڑ گئے تھے اور اب ان کھنڈروں میں گرتے ہوئے منقش ستون آنے جانے والوں سے عظیم داستانیں بیان کرتے، وہ بھی ایک کھنڈر تھی کمزور بوسیدہ، گری ہوئی دیواروں کا کھنڈر، جس کے نیچے ایک عہد دبا پڑا تھا۔[5]

یہ سطریں نجمہ نکہت کے افسانے 'کھنڈر' سے مختص ہیں۔ وہ کھنڈر جو صرف نظام شاہی دور کے خاتمے کی علامت نہیں بلکہ عورت کے وجودی تشخص کا استعارہ بھی ہے۔ افسانہ 'کھنڈر' محلوں میں کچلی ہوئی روحوں کا بیانیہ ہے۔

افسانوی بیانیہ 'ڈیوڑھی' کے اندر عورت کی زندگی، اس کے دکھ درد کی عکاسی کرتا ہے۔ ماضی و حال کے تصادم میں عورت کا یہ وجودی بیانیہ ایک کھنڈر کی مانند ہی ہے۔ یہاں دو طبقے کی عورتوں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ ایک طبقہ وہ ہے جسے عام یا عوام کہا جا سکتا ہے، جس کے وجود کی نفی کرنا ہماری سوسائٹی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر اس پر حاکم وقت کا دل آ جائے تو اپنا گھروندا چھوڑ کر انھیں ڈیوڑھی کی زینت بننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے:

روز روز کی پٹائی اور مار کوٹ سے تنگ آ کے اس کے باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈیوڑھی کا رخ کیا تو جیسے اس نے اپنے سارے حسین خوابوں کو گھر کی بوسیدہ چوکھٹ پہ چھوڑ دیا۔ بچپن کی ضد، الھڑپن اور بات بات پر پھوٹنے والی ہنسی اس کے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ گھر کے بڑے سے لکڑی کے صندوق میں بند ہو گئی۔[6]

شاید مجھے یہاں زینت لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جاگیردارانہ نظام میں ان کی زندگی کا جو خاکہ افسانوی بیانیہ میں موجود ہے وہ بہر حال ایسا نہیں کہ اسے ڈیوڑھی کی زینت کہا جا سکے۔ شاید اسی لیے مصنفہ نے اس کردار کو بے نام رکھا ہے، یہ بے نام وجود (بوا) اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ افسانوی بیانیہ میں جلوہ گر ہے۔

نجمہ کا افسانوی بیانیہ حیدرآباد کی مخصوص تہذیبی شناخت سے معاملہ کرتا ہے۔ انھوں نے جاگیردارانہ نظام کے خوبصورت ماضی کا ذکر اپنے افسانوں میں کیا ہے لیکن یہ خوبصورتی صرف محل کی خوبصورتی، شان و شوکت، دولت کی ریل پیل تک محدود نظر آتی ہے۔ عورت کی زندگی پر شاید اس تبدیلی کا کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ حالانکہ مصنفہ نے افسانے 'دو ٹکے کی' میں یہ تبدیلی دکھانے کی کمزور سی کوشش ضرور کی ہے لیکن شاید افسانے کے کلیدی کردار 'ندا' کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے یہ کوشش ناکافی نظر آئی۔

دوسری طرف حشمت جہاں کا کردار ہے جو مقتدر طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں اور اپنے وقت کی ملکہ تھیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے ذکر کیا عورت اور کھنڈر کی مٹی مشترک ہے۔ عورت 'ملکہ' ہو یا 'بوا' وجودی کرب اس کا مقدر ہے۔ دور کوئی سا بھی ہو، عورت کی حیثیت میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔

نجمہ نکہت نے ڈیوڑھی میں زندگی کے کنارے پر پڑی عورتوں کی کہانیوں سے اپنا افسانوی بیانیہ تشکیل دیا ہے۔ وہ عورتیں جنھیں شاید زندہ کہنا درست نہ ہوگا۔ عورت کی بے بسی کا یہ بیانیہ آج بھی بامعنی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب جاگیردارانہ نظام نہیں رہا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ حکومتیں بدلتی ہیں، زمانے بدلتے ہیں لیکن عورت کی زندگی میں بہت زیادہ فرق نہیں آتا:

بہت دن سے وہ یہ ساری تبدیلیاں دیکھ رہی تھی مگر اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ عاجز آ کے سوچتی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے کوئی انقلاب نہیں آیا ہے۔ دنیا ایک ہی ڈگر پر چلی جا رہی ہے کم از کم اس کو تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی، شاید یہ ڈیوڑھیاں ہمیشہ اپنی اونچی اونچی دیواروں پر انقلابات کے حملوں کو سپر بن کے روکتی رہی ہیں اگر کوئی تبدیلی دھیرے دھیرے اندر رینگ آئی ہو تب بھی ندا اور وہ ساری زر خرید چھوکریاں جو مہمانوں کے ساتھ آتی جاتی تھیں اور جانے کتنی جو ایسے شاندار مقبروں میں اپنی زندگی کی لاش اٹھائے اٹھائے پر اسرار انداز میں پھرتی ہیں، اس تبدیلی سے بے خبر تھیں۔[7]

سرزمین حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی نجمہ نکہت کے افسانے حیدرآباد کی تہذیب و ثقافت کا بیانیہ بھی ہیں۔ افسانہ 'آخری حویلی' اس دور کے ماضی و حال کی بہترین تصویر کہا جا سکتا ہے۔

افسانہ 'آخری حویلی' نظام شاہی دور/ جاگیردارانہ نظام کی تہذیب و ثقافت، خوبیوں و خامیوں اور اس دور کی دم دوڑتی روایات کا مکمل بیانیہ ہے۔ افسانہ نگار نے بہت خوبصورتی سے اس دور کی تصویر کشی کی ہے۔ افسانے کا ہر کردار؛ گویا وہ حاکم ہو یا محکوم نظروں کے سامنے چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے:

جاگیرداری ختم ہو گئی تو صمصام الدولہ کو آئے دن دل کے دورے پڑنے لگے۔ ہر وقت سینہ تان کے مضبوط قدموں سے چلنے والے جسم میں خمیاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ حویلی کے اندر باہر تیز تیز آنے جانے والے قدم تھک کے گاؤ تکیہ کا سہارا بن گئے مگر اب بھی نوابی آن نبھائے جاتے تھے۔[8]

جب تک حویلی کی ایک ایک چیز فروخت نہ ہو گئی اور ایک دن حویلی بھی۔ ماضی و حال کا تصادم افسانوی بیانیے میں نمایاں ہے۔ وہیں افسانہ 'سیب کا درخت' چاندنی کی امیدوں کا استعارہ کہا جا سکتا ہے جس نے بالآخر اسے ڈیوڑھی کی زندگی سے نجات دلائی۔

نظام شاہی دور کے خاتمے کی جھلکیاں بھی نجمہ کے افسانوی بیانیے میں نظر آتی ہیں:

جاگیرداری کے خاتمے کا دوسرا تازیانہ پڑا تو ڈیوڑھی کی کمر ٹوٹ گئی۔ یوں سب بکھر گئے منتشر ہو گئے جیسے آندھی سوکھے پتے اڑائے لیے جا رہی ہو۔ سارا قیمتی سامان دو تین برسوں میں فروخت ہو گیا۔[9]

نجمہ کا افسانوی بیانیہ حیدرآباد کی مخصوص تہذیبی شناخت سے معاملہ کرتا ہے۔ انھوں نے جاگیردارانہ نظام کے خوبصورت ماضی کا ذکر اپنے افسانوں میں کیا ہے لیکن

نجمہ نکہت کے افسانوں کی خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں میں مرکزی کردار 'عورت' ہے؛ جس کا طبقہ، معاشی حالات ممکن ہے، الگ ہو، لیکن دکھ سانجھا ہے، عورت کے احساسات و جذبات کی ترجمانی میں نجمہ نکہت کو کمال حاصل ہے،افسانہ 'پھر وہی صبح،پھر وہی شام' بھی اس کی ایک عمدہ مثال کہا جا سکتاہے۔

یہ خوبصورتی صرف محل کی خوبصورتی، شان و شوکت، دولت کی ریل پیل تک محدود نظر آتی ہے۔عورت کی زندگی پر شاید اس تبدیلی کا کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ حالانکہ مصنفہ نے افسانے 'دو ٹکے کی' میں یہ تبدیلی دکھانے کی کمزور سی کوشش ضرور کی ہے لیکن شاید افسانے کے کلیدی کردار 'ندا' کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے یہ کوشش ناکافی نظر آئے۔

بہرکیف نجمہ نکہت کے افسانوں کی خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں میں مرکزی کردار 'عورت' ہے؛ جس کا طبقہ، معاشی حالات ممکن ہے، الگ ہو، لیکن دکھ ساجھا ہے۔عورت کے احساسات وجذبات کی ترجمانی میں نجمہ نکہت کو کمال حاصل ہے۔افسانہ 'پھر وہی صبح، پھر وہی شام' بھی اس کی ایک عمدہ مثال کہا جاسکتا ہے۔

نجمہ نے جہاں جاگیردارانہ نظام کے کلچر کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے، اس کی شان وشوکت بیان کی ہے وہیں اس دور کی خامیوں پر بھی کھل کر خامہ فرسائی کی ہے۔ان کا افسانوی بیانیہ ڈیوڑھی کی کہانیوں، نوعمر لڑکیوں کی خرید وفروخت، جاگیردارانہ نظام اور اس کا خاتمہ، اس دور کے رسم ورواج، روایات، ڈیوڑھی میں بیگمات اور باندیوں کی زندگی، نوابوں کی عیاشیاں، ماضی و حال کا تصادم وغیرہ سے معاملہ کرتا ہے۔بقول نجمہ:

میں نے 'نظام' کا جگمگاتا دور بھی دیکھا ہے اور اس دور کا عکس بھی آپ کو میرے افسانوں میں ملے گا۔ بادشاہت، جاگیرداری اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ اور اس زرین دور کی لعنتوں کا شکار ہونے والے کردار بھی آپ کو ان افسانوں میں ملیں گے۔10

افسانہ 'سائے' جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد زلیخا بیگم کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں سے معاملہ کرتا ہے۔جنھوں نے محل میں بادشاہت کی تھی اور اب وہ ایک معمولی عورت کی طرح ایک معمولی گھر کی کرایہ دار تھیں۔ماضی وحال کے تصادم کو پیش کرتی یہ کہانی جنریشن گیپ کو بھی اجاگر کرتی ہے۔زندگی کی دوڑ میں ماں باپ کو پیچھے چھوڑ کرآگے نکل جانے والے بچے آج ہر گھر میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کی تصویریں افسانے میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔زلیخا بیگم اور انجمن آرا کے کردار دو مختلف زمانے کی علامت کہے جاسکتے ہیں۔جن کے اقدار مختلف ہیں۔زلیخا بیگم ایسے دور کی نمائندگی کرتی ہیں جو ماضی کے صفحوں کا حصہ ہے لیکن ان کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ماضی کی ان یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ماضی کے سائے ان کی زندگی کا واحد سہارا ہیں۔دوسری طرف انجمن آرا کا کردار ہے جو نئے زمانے کی خاتون ہیں اور ماضی کے سایوں کو حال میں استعمال کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔لوگوں کی باتوں کو اپنے آنچل سے نیچے جھٹک کرآگے بڑھ جانے کے فن سے بھی واقف ہیں۔یہ وہ دور ہے جہاں ماضی کے سائے حال پر پڑتے نظر آتے ہیں:

جاگیرداری بڑی سخت جان ہے مرنے والی چیز نہیں۔شاید ہر دور میں روپ بدل کر زندہ رہتی ہے اور اپنا کام کیے جاتی ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔11

افسانہ 'پتھر اور کونپل' اور 'دور دیس سے' ان عورتوں کی کہانی ہے جو اپنے وجود کی نفی کر کے شوہر کے رنگ میں رنگنے کو ایمان لانے کی حد تک قبول کرتی ہیں۔اس کوشش میں نہ صرف ان کی شخصیت مسخ ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ ان کی روح تک چھلنی ہوجایا کرتی ہے مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اپنے گھر میں نازوں کی پلی یہ عورت جب 'بیوی' بنتی ہے تو اسے اپنے سارے خواب آنکھوں میں دفن کرنے پڑتے ہیں:

''زندگی عجیب وغریب زاویوں میں تقسیم ہوگئی ہے— میں ایک روایتی بیوی اور ماں بن کے رہ گئی ہوں جس کے لیے اپنا ماضی یاد رکھنا بھی ناقابل معافی گناہ ہے— یہ کمرہ تو میرا تابوت ہے جس پر چڑھا ہوا سیاہ غلاف سورج کی کرنیں بھی روک لیتا ہے۔ میں ان کرنوں کے لیے ترس گئی ہوں۔ مجھ میں اب بھی جان باقی ہے۔ میری اپنی آرزوئیں اب بھی جانکنی کی حالت میں تڑپتی ہیں۔''12

مرد کو 'عورت' تو چاہیے پر ذمہ داری نہیں۔وہ یہاں بھی آزادی چاہتا ہے اور شادی کا بندھن اس آزادی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

عورت تو بری چیز تب سے ہے جب حوا پیدا کی گئیں اور حضرت آدم بھی جنت سے نکلے ہوئے یہی تیر عورت کے کلیجے پر لگاتے گئے مگر عورت کا کلیجہ تیر کھا کھا کے چھلنی بھی ہو جاتا ہے تو اپنے زخم چپکے سے چھپالیتی۔ یوں اعلان نہیں کرتی پھرتی۔13

افسانوی بیانیہ سماج کی اس تلخ حقیقت کو اجاگر کرتا ہے جہاں عورت کا وجود بے معنی بوجھ سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ بھی اپنے وجود کو بوجھ ہی تصور کرے، مردوں کو حاکم قبول کرے اور خود کو محکوم۔عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ گونگی بن کر رہے:

سب سے بڑی خوبی جو عورت میں دیکھی جاتی ہے۔ وہ اس کی بے زبانی ہے جو عورت بے زبان ہوگی، اس کو سسرال والے اور شوہر سب قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔گائے کی طرح سیدھی اور بیل کی طرح بوجھ اٹھانے والی عورتیں کبھی بے گھر نہیں ہوتیں۔14

چھوٹے شہروں میں تو ساتھ کام کرنے والے مرد بھی عورت سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ گونگی بن کر رہے، اس کے خلاف اگر کبھی کسی عورت نے اپنی رائے پیش کر دی تو سمجھیے کہ گناہ عظیم کر دیا۔

نجمہ نکہت کے مطابق،''میں ایک ایماندار ادیب کو یا تخلیق کار کو اپنے زمانے کا مؤرخ مانتی ہوں اور نئی نسل کی ذہنی تربیت کا ذمہ دار بھی۔''

اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے۔

حواشی

1 آمنہ تحسین: حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص65
2 نجمہ نکہت: سیب کا درخت، شالیمار پبلی کیشنز: حیدرآباد، ص65
3 ایضاً، ص109
4 ایضاً، ص18
5 ایضاً، ص22
6 ایضاً، ص15
7 نجمہ نکہت: سیب کا درخت، شالیمار پبلی کیشنز: حیدرآباد، ص64
8 ایضاً، ص96
9 ایضاً، ص21
10 نجمہ نکہت: سیب کا درخت، شالیمار پبلی کیشنز: حیدرآباد، ص7
11 ایضاً، ص31
12 ایضاً، ص200
13 نجمہ نکہت: سیب کا درخت، شالیمار پبلی کیشنز: حیدرآباد، ص37
14 ایضاً، ص166

Dr. Yasmeen Rashidi
Assistant Professor
T.P. College, BNMU
Madhepura- 852113
Mob.:9968549837

شمس کمال انجم

ادب وصحافت کے امام
ڈاکٹر امام اعظم

یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں جانے کے لیے لیکن کبھی کبھی اچانک کچھ لوگوں کا جانا پرملال ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے غم والم کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ انسان بے بسی سے اس بے ثبات دنیا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے۔ سب کچھ لایعنی اور بیکار سا لگتا ہے۔ گزشتہ کچھ برسوں میں میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ میرے حقیقی بڑے بھائی حماد انجم ایڈووکیٹ، میرے بڑے بھائی جیسے بہت ہی شفیق وکریم ڈاکٹر حنیف ترین، مولانا عبد اللہ مدنی (نیپال)، عنبر بہرائچی، ڈاکٹر فرید پربتی، پروفیسر سلیمان اشرف جیسے اکابر علم وفن اور ماہرین شعروسخن کے اچانک انتقال کی خبر نے جیسے مجھے مضمحل وملول اور کبیدہ خاطر کردیا تھا ویسے ہی بہت ہی شفیق ومشفق ڈاکٹر امام اعظم (دربھنگہ، بہار) کے اچانک انتقال کی خبر سن کر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ میں غم والم کے صحرا میں کھوگیا۔ دل مضمحل وکبیدہ ہوگیا۔

یادش بخیر! یہ اکتوبر 2002 کی بات ہے۔ میں قطر میں تھا۔ دفتر پہنچا تو میرے ایک ساتھی نے کہا کہ امام اعظم کا خط آیا ہے۔ ساتھ میں تمثیل نو کا تازہ شمارہ بھی تھا۔ یہیں سے دربھنگہ بہار سے تعلق رکھنے والے شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم کے ساتھ تعلق کی بنیاد پڑی جو ان کی وفات تک قائم رہی۔ ایک سال کے بعد دربھنگہ کے علاقے میں بڑی شدید باڑھ آئی تو میں نے انھیں فون کیا۔ کہنے لگے کہ ہم لوگ چھت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑی پریشانی کے عالم میں ہیں۔ اس کے بعد موصوف نے مجھے گاہے بگاہے 'تمثیل نو' میں بہت اہتمام سے شائع کیا۔ میری غزلیں بھی، خطوط بھی اور مضامین بھی۔ گزشتہ دنوں ان کی کتاب 'چھٹی آئی ہے' موصول ہوئی تو دیکھا میرے بھی خطوط شامل کتاب ہیں۔ ایک مرتبہ بڑے بھائی حماد انجم ایڈووکیٹ مرحوم نے مجھے فون کیا۔ پوچھا تمثیل نو آیا؟ میں نے کہا ابھی نہیں پہنچا، کہنے لگے، اس شمارے میں میں بھی ہوں، تم بھی اور سہیل بھی۔ تینوں بھائی۔ اس طرح ڈاکٹر امام اعظم صاحب ہم تینوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک دن حماد صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نے سہیل صاحب کو فون کیا تو نہیں ملے۔ دوسرے دن فون کیا تو کہنے لگے امام اعظم سے ملنے گیا تھا اس لیے بات نہیں ہوسکی۔ حماد صاحب ظریفانہ انداز میں کہنے لگے کہ لوگ تو امام اعظم کی تقلید واتباع پر ہی اکتفا کرتے ہیں اچھا کیا جو تم امام اعظم سے مل بھی لیے۔

تمثیل نو کے صفحۂ اول پر امام اعظم کا یہ شعر نقش رہتا تھا کہ

صاف کرکے آئینے کی گرد کو　　ڈھونڈھ کر لاؤ کوئی تمثیل نو

حماد صاحب نے ڈاکٹر امام اعظم کو خط لکھا تو انھوں نے تمثیل نو پر فی البدیہہ یہ تین شعر لکھ بھیجے:

ترے 'تمثیل نو' کی اک نئی تمثیل لکھ دوں
اسے میں 'مجمع الاجمال' کی تفصیل لکھ دوں
میں پھر یہ سوچتا ہوں اور بھی کیا کیا رقم کردوں
ادب کے مسئلے کی میں اسے تاویل لکھ دوں
خیال آتا ہے دل میں یہ امام اعظم کا پرچہ ہے
میں اس 'تمثیل نو' کو 'مصحف جبریل' لکھ دوں

میں نے جب تمثیل نو میں ان کے خط کے ساتھ یہ اشعار پڑھے تو میں نے ان سے ازراہ مذاق کہا آپ نے تمثیل نو کو 'مصحف جبریل' کہہ دیا ہے۔ 'مولی صاحب' لوگ آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔ وہ ہنسنے لگے۔ کہنے لگے مولی صاحب لوگوں کا ادبی فتوی یہاں نہیں چلے گا۔ مزید فرمایا کہ میں نے 'خیال آتا ہے' لکھا ہے۔ میں نے کہا ہاں ایسے ہی جیسے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا ہے 'وجدھا تغرب فی عین حمئۃ' کہ انھوں نے سورج کو گرم چشمے میں ڈوبتا 'محسوس' کیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کہنے لگے، واہ شاباش، تم نے تو دلیل بھی پیش کردی۔

2005 میں میری کتاب 'جدید عربی ادب' جو کہ عربی سے اردو میں ترجمہ ہے، شائع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے اس پر تمثیل نو میں تبصرہ شائع کیا۔ مختصر مگر بہت جامع۔ ایک پیراگراف میں موصوف نے لکھا:

''اردو والوں کے لیے ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اس مینارۂ نور سے اکتساب نور کا اچھا موقع فراہم کردیا ہے۔ اردو میں مغربی ادب کے تراجم کی تو بہتات ہے مگر اس نوع کے تراجم کا فقدان ہے۔ مترجم نے اہم کام یہ کیا ہے کہ اپنے مقدمے میں عربی ادب کی ارتقائی تاریخ کی جھلک بھی بطور پس منظر دکھائی ہے اور ڈاکٹر شوقی ضیف کی حیات وخدمات سے متعارف بھی کرایا ہے۔ عربی ادب سے وابستہ طلبا واساتذہ کے لیے تو یہ جنسِ گرانمایہ ہے اور عام زبان وادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بھی مفید ہے کہ اس میں وادیِ نیل کی سیاسی تاریخ بھی آگئی ہے۔''

قابل ذکر یہ بھی ہے کہ میں جب بھی انھیں کوئی کتاب بھیجتا تھا تو اس پر وہ تبصرہ کرتے تھے یا کم از کم اپنے تاثرات سے ضرور نوازتے تھے۔ سوشل میڈیا پر بھی گاہے بگاہے میری پوسٹوں پر اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت کیا کرتے تھے جس سے تعلق کا اعادہ ہوجاتا تھا۔ اپنی بھی کتابیں وہ مجھے مسلسل بھیجتے رہتے تھے۔ سب سے اخیر میں انھوں نے مجھے 'تمثیل نو، ادبی صحافت کا نقش' (مرتبہ ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، صفحات 480)، 'چھٹی آئی ہے' (مشاہیر کے خطوط امام اعظم کے نام، مرتبہ شاہد اقبال، صفحات 752) 'سہرے کی ادبی معنویت' (مرتب ڈاکٹر امام اعظم صفحات 320) اور 'پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار' (تالیف ڈاکٹر امام اعظم، صفحات 272) ایک ساتھ دربھنگہ کے ڈاکٹر عبدالمعبود عامر کے توسط سے بھجوایا جو کہ راجوری کے ہمالین ڈگری کالج میں اردو کے استاد ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم صاحب کی کم وبیش دو درجن کتابیں شائع ہوئیں جن میں دو شعری مجموعے: قربتوں کی دھوپ (1995) اور نیلم کی آواز (2014) تین تحقیقی وتنقیدی کتابیں: مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ (1997)، عہد اسلامیہ میں دربھنگہ (2009) مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری زون (2014) ادبی مضامین پر مشتمل ایک کتاب 'گیسوئے تحریر' (2011) شائع ہوئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دو مونوگراف 'ہندوستانی ادب کے معمار عبدالغفور شہباز' (2011) ہندوستانی ادب کے معمار مظہر امام (2019) اور دیگر مرتبہ کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اورفن پر بھی نصف درجن کتابیں لکھی

گئیں جن میں اوپر ذکر کی گئی دو کتابیں 'چٹھی آئی ہے' اور 'تمثیل نو، ادبی صحافت کا نقش' کے ساتھ ساتھ 'ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ از صلاح الدین' (2012)، ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات (پی ایچ ڈی مقالہ) از ڈاکٹر سرور کریم (2013) ڈاکٹر امام اعظم کی باز آفرینی از پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (2018) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

'چٹھی آئی ہے' میں کل تین سو چونتیس خطوط شامل ہیں۔ اردو منظر نامے پر موجود کم وبیش سبھی اکابرین علم وفن کے خطوط امام اعظم کے نام شامل کتاب ہیں۔ اس پر مستزاد پروفیسر نظیر احمد کے خطوط بنام ڈاکٹر امام اعظم ہیں جنھیں وہ شروع سے ہی تمثیل نو کے ہر شمارے میں شائع کرتے تھے۔ یہ خطوط اس کتاب میں شامل نہیں ہیں بلکہ 'نامۂ نظیر' کے نام سے الگ سے 2013 میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب میں شامل خطوط پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمثیل نو کی رسائی کہاں کہاں اور کن کن ارباب فکر ونظر تک تھی۔ ملک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں میں بھی خاص طور سے تمثیل نو کے اچھے خاصے قاری تھے۔ تمثیل نو میں شائع شدہ ان خطوط سے تمثیل نو کی تعیین قدر بھی ہوتی ہے اور ڈاکٹر امام اعظم کے ادبی وصحافتی وژن کی یافت بھی ہوتی ہے۔ اس کا ہر شمارہ بہت معیاری اور وقیع ہوا کرتا تھا۔ 'چٹھی آئی ہے' کے مرتب شاہد اقبال نے کتاب پر بہت جامع مقدمہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اردو میں مکتوب نگاری کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر امام اعظم کی تصنیفات وتالیفات کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری کا ورثہ کتنا زرخیز ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کے نام لکھے گئے ان خطوط کے ساتھ ڈاکٹر ابرار اجراوی کے مرتب کردہ تمثیل نو کا اشاریہ بھی دیکھ کر قاری حیران رہ جاتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ مختصر سے عرصے میں تمثیل نو کو کتنی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ مرتب کتاب اور ڈاکٹر سرور کریم کے پیش لفظ سے تمثیل نو کے علمی قد وقامت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی یقین کرنا پڑتا ہے کہ امام اعظم حقیقی معنوں میں ادب وصحافت کے امام تھے۔ اس کتاب میں تمثیل نو پر کہی گئی نو نظمیں شامل ہیں۔ دو درجن مضامین اور دو درجن تبصرے تمثیل نو کی تعیین قدر کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

سید اعجاز حسن المعروف بہ ڈاکٹر امام اعظم بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ اردو اور فارسی میں ایم اے تھے۔ قانون کی ڈگری بھی آپ نے حاصل کی تھی لیکن کبھی قانون کی موشگافیوں میں خود کو نہیں الجھایا۔ بس ادب کے شانے پر الجھے سلجھے گیسوؤں کی مشاطگی میں پوری عمر گزار دی۔ اسی لیے کبھی 'ایڈووکیٹ' کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ نہیں لگایا۔ پی ایچ ڈی بھی تھے اور ڈی لٹ بھی، شاعر بھی تھے ادیب بھی، محقق بھی نقاد بھی، صحافی بھی اور دانشور بھی، مانو کیمپس کلکتہ کے ریجنل ڈائرکٹر کی حیثیت سے ایک ماہر مدبر اور بابصیرت منتظم بھی۔ یوں سمجھیے کہ 'ادبستان دربھنگہ' میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتے تھے، مرنجاں مرنج، شفیق وکریم، مہربان، خوش خط وخوش خصال۔ تریسٹھ برس کی عمر میں لکھتے پڑھتے، چلتے پھرتے اچانک مالک حقیقی کی طرف سفر کر گئے لیکن اپنی علمی وادبی خدمات کے ذریعے شعر وادب کی دنیا میں اپنا نام امر کر گئے۔ اپنے نقوش چھوڑ گئے۔

یہ موت تو ہر غم سے تمھیں دے گی فراغت
مرنے کے لیے یار کا پہلو نہیں مانگو

ڈاکٹر امام اعظم جیسا کہ عرض کیا گیا شاعر بھی تھے، ادیب ومحقق اور صحافی بھی لیکن یہ بات درست ہے کہ وہ بحیثیت صحافی پھر بحیثیت ادیب ومحقق اور پھر شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ یعنی میری رائے میں ان کی ادبی زندگی میں ان کی شاعرانہ خو نمبر تین پر ہے۔ اصل میں وہ صاحب علم ادیب تھے، محقق تھے اور پھر شاعر تھے۔ ایسے بہت سارے اکابرین ادب ہیں جو شعر وسخن سے رسم وراہ رکھتے تھے لیکن انھوں نے ادب سے زیادہ سروکار رکھا۔ خود امام شافعی نے کہا ہے کہ اگر میں شعر کہتا رہتا تو لبید بن ربیعہ عامری سے بھی بڑا شاعر ہوتا۔ ہر زبان میں اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ اس لیے بہت سارے ایسے صاحبان علم جو شاعر بھی تھے اور ادیب بھی تو انھوں نے اپنے ادبی ذوق وجنون کو شعری شوق وذوق پر ترجیح دی۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر امام اعظم بھی شاعر سے بڑے ادیب، محقق اور صحافی تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، انھوں نے کئی اشعار میں فنی گلکاریاں بھی دکھائی ہیں، کچھ نیا کہنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

اسے جنون ہے لفظوں سے کھیلنے کا بہت
ہماری سادہ سی لیکن زباں نہ سمجھے گا
ہاں وہی بات جسے میں نہیں کہہ سکتا تھا
تو نے ہر بار اسی بات پہ اصرار کیا
زمیں کے ہونٹ اک اک بوند کو اب بھی ترستے ہیں
بہ ظاہر دور سے سب کھیتیاں سیراب لگتی ہیں
لوگ پڑھتے ہیں مجھے پڑھ کے تڑپ اٹھتے ہیں
میں ہوں انسان کوئی سرخی اخبار نہیں
شام ڈھلے دریا کا پانی لال ہوا
ڈوبتے سورج جیسا اس کا حال ہوا
اپنی تنہائی میں لپٹے رات گئے
خواب کا بستر یادوں کا رومال ہوا

ان کا یہ شعر بھی وطن کی مٹی سے محبت کی کیا عمدہ مثال ہے۔ کہتے ہیں۔

ہمیں اپنا وطن پیارا بہت ہے
کہ ہم نے اس پہ دل وارا بہت ہے
ہمیں اپنی یہ آزادی ہے پیاری
یہ زندہ باد کا نعرہ بہت ہے

ڈاکٹر صاحب نظمیں بھی خوب کہتے تھے۔ ایک مختصر آزاد نظم یوں ہے۔

منزل کے بعد بھی/ کئی رستے ہیں اور بھی/ بہتر ہے اپنے راستے/ ہم منتخب کریں/ حالات کے جنون سے/ ہرگز نہ ہم ڈریں/ الزام بے وفائی کا/ تم پر نہ ہم دھریں/ بس حوصلہ رہے کہ تمھیں یاد ہم رہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا شعری سفر بتدریج ارتقا پذیر تھا، قربتوں کے سفر سے نیلم کی آواز تک آتے آتے ان کی شعری آواز کافی توانا محسوس ہوتی ہے۔ اگر اور سانسیں رہتی تو اور خوب کہتے لیکن جتنا کہہ گئے ہیں وہ انھیں تاریخ ادب میں زندہ رکھنے کے لیے بہت ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کے ساتھ میں مسلسل رابطے میں تھا۔ عید کی مناسبتوں سے خاص طور پر رابطہ ہوتا تھا، فیس بک پر بھی وہ میری تحریر پڑھتے تھے تو اختصار سے ہی سہی اس پر کمنٹ فرماتے تھے۔ گزشتہ دنوں میں نے بڑے بھائی حماد انجم ایڈووکیٹ شخص اور شاعر مرتب کی تو انھیں بھیجی اور عرض کیا کہ کچھ لکھ دیجیے، انھوں نے بہت خوش دلی سے کہا کہ ضرور لکھوں گا۔

میں یہ بات بھی یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ دراصل دربھنگہ جیسے علمی وادبی شہر کو میں نے امام اعظم اور ان کے 'تمثیل نو' کے ذریعے ہی جانا۔ وہاں کی علمی وادبی اور ثقافتی سرگرمیاں، وہاں کے جامعات، کالج اور اسکول، ادبا ،شعرا سب کے بارے میں تمثیل نو ہی کے ذریعے جانکاری حاصل ہوئی۔ اس عہد کے سب سے برجستہ اور فی البدیہہ شاعر عبدالمنان طرزی صاحب کا نام 'تمثیل نو' ہی کے ذریعے جانا اور ان کے کلام سے آشنائی کا موقع ملا۔ یہی ایک عظیم انسان کی علامت ہوتی ہے کہ وہ سماج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے فکر وفن، علم وادب، شعر وسخن، صحافت ودانش کے امام تھے۔ پورے ملک کے ادبی منظر نامے پر سورج کی طرح رواں دواں تھے۔ ان کے اچانک انتقال پر ملال سے یوں کہیے کہ سچ میں ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ دربھنگہ اور کلکتہ دو بڑے شہر اس عظیم الشان ادیب، شاعر، محقق اور دانشور عرصے تک کمی محسوس کرتے رہیں گے۔

■

Dr. Shams Kamal Anjum
Dept of Arabic, Baba Ghulam
Shah Badshah University
Rajouri-185234 (J & K)

مسرت جہاں

آج کے ناولوں کے اسلوب و اظہار پر بدلتی ہوئی تہذیب کا اثر ہے

شہاب ظفر اعظمی

موجودہ دور میں 'ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی' اردو فکشن کی تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ اپنے منفرد انداز اور اسلوب کی وجہ سے انہوں نے ناولوں اور افسانوں کی تنقید میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے دوسری اصناف میں بھی گراں قدر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔اب تک ان کی پانچ کتابیں..... 'اردو ناول کے اسالیب، جہان فکشن، متن اور معنی، مطالعات فکشن، قرات: مطالعہ و محاسبہ' شائع ہو کر پوری اردو آبادی سے داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ وہ تنقید میں تعمیری نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ انہیں ان کی ادبی تصانیف پر مختلف انعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ پیش خدمت ہے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی سے ایک ملاقات کا تحریری منظر نامہ۔

مسرت جہاں: آپ اپنے سوانحی حالات اور کارناموں سے روشناس کرائیے۔

شہاب ظفر اعظمی: میری پیدائش یکم اپریل 1972 کو گیا (بہار) میں ہوئی۔ میرے والد کا نام عبدالبر اعظمی ہے اور وہ عالم دین تھے۔ میری ابتدائی تعلیم والد ماجد کے زیر سایہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مگدھ یونیورسٹی سے بی اے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی ایڈ مکمل کیا۔ ایم اے کی تعلیم جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پوری کرنے کے بعد میری تقرری آرہ کے ایک ہائی اسکول میں ہوگئی۔ اسکولی درس و تدریس کے ساتھ میں نے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنا شروع کر دیا تھا جس پر پروفیسر حسین الحق کی نگرانی میں مگدھ یونیورسٹی نے ڈگری تفویض کی۔ اسی درمیان 2003 میں میری تقرری شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر ہوئی۔اس وقت سے اب تک وہیں مصروف کار ہوں۔ میری شادی شمع انجم بنت خلیل الرحمٰن مرحوم سے 2002 میں ہوئی۔ دو بیٹے شایان ظفر اور فرحان ظفر زیر تعلیم ہیں۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک ہفت روزہ اخبار 'رفاقت' سے کیا۔ میرا پہلا مضمون 'رفاقت' میں جذبہ عشق کے عنوان سے شائع ہوا۔

م ج: آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں، مگر جو داد 'اردو ناول کے اسالیب' کو ملی۔ وہ کسی اور کتاب کو نہ مل سکی۔

ش ظ ا: 'اردو ناول کے اسالیب' میرے تحقیقی مقالے کا ایک حصہ ہے۔ اس مقالے میں پہلی مرتبہ اسلوب کے حوالے سے ناول کی تاریخ و تنقید کی گئی تھی اس لیے یہ کتاب قارئین کو زیادہ پسند آئی۔

م ج: ادب میں اردو فکشن کی صورت حال اور اہمیت کیا ہے؟ کل سے آج تک اردو فکشن کے سفر پر کچھ بتائیں؟

ش ظ ا: اردو فکشن کے سرمائے میں بنیادی حیثیت مختصر افسانے اور ناول کو حاصل رہی ہے۔ اِس لحاظ سے اردو فکشن نے اب تک تقریباً ڈیڑھ صدی کا لمبا سفر طے کیا ہے۔ اِس مدت میں اس نے مزاجی اعتبار سے پانچ ادوار دیکھے ہیں۔ پہلا دور بیسویں صدی کی ابتدا تک کا ہے جب فکشن ناول تک محدود تھا اور فنی و موضوعاتی سطح پر نذیر احمد کے ناولوں سے امراؤ جان ادا تک سارے تجربات اسی میں کیے جا رہے تھے۔ دوسرے دور کو 1936 تک لے جایا جا سکتا ہے جب افسانہ منظر عام پر آیا اور اس میں اصلاح پسندی، حب الوطنی اور مثالیت پسندی کا رجحان غالب رہا۔ تیسرا دور 1936 سے 1960 تک ہو سکتا ہے جس میں حقیقت نگاری، اشتراکیت اور رومان پسندی کی لہر ملتی ہے۔ چوتھے دور کو 1960 سے 1980 تک پھیلا

سکتے ہیں جب فکشن بالخصوص افسانے میں حقیقت نگاری، علامت نگاری، ابہام، پیچیدگی، انسان کی بے چہرگی اور اقدار کی شکست وریخت کو بنیادی اہمیت حاصل رہی اور قاری کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا۔ 1980 کے بعد کا زمانہ مکمل طور پر نئی تلاش اور نئی بصیرت کا منظر نامہ سامنے لایا جسے اردو فکشن کی واپسی کا زمانہ بھی کہا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں فکشن نے غیر ضروری اور نامانوس علامتوں سے دامن چھڑا کر ایک نئے تیور کے ساتھ زندگی کا ہاتھ تھاما۔ انتظار حسین، قاضی عبدالستار، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، احمد یوسف، نیر مسعود، عابد سہیل، اقبال مجید، عبدالصمد، حسین الحق، مشتاق احمد نوری، شموئل احمد، شوکت حیات، صلاح الدین پرویز، پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، جوگندر پال، مشرف عالم ذوقی، طارق چھتاری، ترنم ریاض، شفق، غضنفر، ساجد رشید، مظہرالزماں خاں، غزال ضیغم، شاہد اختر، عشرت ظفر، رحمان عباس، اشعر نجمی، اسلم جمشید پوری، شفیع مشہدی، اقبال حسن آزاد اور محمد علیم جیسے بہت سارے فکشن لکھنے والوں نے فکشن کی حسیت میں تبدیلی لانے کی شعوری کوشش کی۔ اِن سب نے مل کر تھیم، ہیئت اور محاورے کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا جس نے اردو فکشن کو اچانک ثروت مند اور مختلف بنا دیا۔ عالمی ادب میں فکشن کی پیش رفت اور اس کے تخلیقی امکانات کی توثیق سے اس کی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی۔ اب فکشن محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ اعلیٰ فن پاروں کی طرح زندگی، معاشرے اور کائنات کے رازہائے سربستہ کی بصیرت افروزی کا موثر وسیلہ بھی بن گیا۔ جدید فکشن کا یہ دور اِس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ کہانی کا کینوس تمام براعظموں تک پھیل گیا، جس سے ہمارا فکشن نگار عالمی انسانی برادری کو ایک اکائی کے روپ میں دیکھنے، دکھانے پرکھنے اور تجربہ کرنے پر قادر ہوگیا ہے۔ یعنی یہ بات اب بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ اردو فکشن اس دور سے آگے نکل گیا ہے جسے ''عبوری دور'' سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اردو فکشن اب روبہ ترقی ہے اور ایک وقیع اور امکان خیز صنف کے طور پر اپنی انفرادی حیثیت اِس حد تک منوا چکا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے موجودہ صدی کو اردو فکشن کی صدی قرار دے دیا۔

م ج: پروفیسر نارنگ کے اِس بیان پر ایک بڑا حلقہ چیں بجبیں ہوا، آپ کا کیا خیال ہے؟

ش ظ ا: مجھے اِس بیان میں کوئی قابل اعتراض یا تعجب خیز وجہ نظر نہیں آتی۔ موجودہ صدی کو اردو فکشن کے نام معنون کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری کم رتبہ ہوگئی، یا آج اردو شاعری روبہ زوال ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری کے بغیر ادب کا تصور ہی ناممکن ہے۔ ہماری شاعری کی مرکزیت غزل سے ہے اور غزل کو اردو میں وہی درجہ دیا جاتا ہے جو ہندوستانی تہذیب میں تاج محل کو حاصل ہے۔ سات آٹھ سو سالوں کے ہند اسلامی کلچر کی جو روح اردو شاعری بالخصوص غزل میں سمٹ آئی ہے اس کا جواب نہیں، لیکن آج غزل کے پہلو بہ پہلو فکشن نے بھی اپنا مقام بنالیا ہے۔ کوئی ایک صنف ادب میں کسی دوسری صنف کو دباتی نہیں ہے، ادب کو مزید دولت مند بناتی ہے۔ غزل اور شاعری کی اہمیت بلاشبہ اپنی جگہ مسلم ہے لیکن آج فکشن کی اہمیت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو

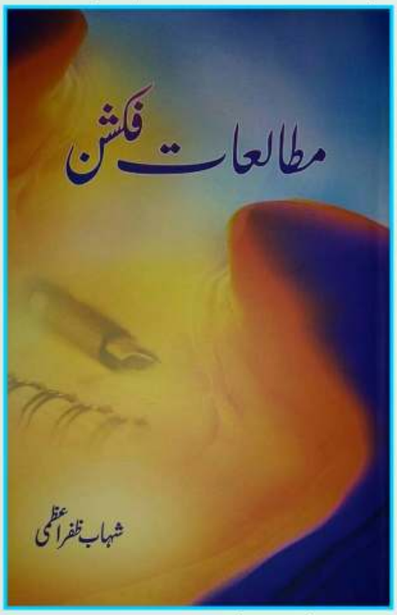

فقط شاعری کی زبان نہیں پریم چند، منٹو، عینی آپا، انتظار حسین، جوگندر پال، عبدالصمد، سلام بن رزّاق اور مشرف عالم ذوقی کی زبان بھی ہے۔ اِس کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ میں شاعری کو فکشن سے کم رتبہ سمجھتا ہوں۔ دراصل میں ادب میں فوقی درجہ بندی کا قائل نہیں۔ ایسی اصناف ادب جو بنیادی طور سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک پیمانے سے جانچی نہیں جا سکتیں۔ ایسی تمام اصناف کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، خواہ وہ شاعری ہو، افسانہ ہو، ڈرامہ ہو یا ناول!

م ج: ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ افسانہ یا کہانی کا کینوس بہت چھوٹا ہوتا ہے اس لیے یہ دوسرے درجے کا ادب ہے، کیا صحیح ہے؟

ش ظ ا: بالکل نہیں، بھلا حضرتِ معترض سے کون کہے کہ شاعری میں تو ہماری پہچان غزل سے ہے جس کا ہر شعر مفرد اور مکمل ہوتا ہے۔ اس سے چھوٹا پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ دوہا صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہائیکو کے لیے تین مصرعے کافی ہیں۔ دراصل ادب کی شناخت چھوٹے بڑے پیمانوں سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی انفرادیت اور پیشکش اسے شناخت عطا کرتی ہے۔ کوئی فن پارہ قاری کے جمالیاتی تقاضوں کی کس حد تک تکمیل کر رہا ہے؟ یا قاری کے تہذیبی اور جذباتی عناصر کی کس قدر نمائندگی کر رہا ہے؟ یہ باتیں فن پارے کو پہچان دیتی ہیں۔ فکشن ہماری تہذیب، ہمارے جذبات اور ہمارے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل صدیوں سے کر رہا ہے اس لیے پیمانوں، اصولوں اور درجہ بندی وغیرہ کے اعتراضات سے اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اِسے فکشن کا جادو ہی کہا جائے گا کہ وہ صنف جس میں اعلیٰ درجے کے ادب کی تخلیق ناممکن قرار دی گئی تھی بعد میں توجہ کا مرکز بن گئی اور گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں سب سے زیادہ سمینار، مذاکرے، جلسے فکشن اور فکشن کی تنقید پر ہوئے جن میں ان لوگوں نے بھی حصہ لیا جو اسے قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ آج ہندستان اور پاکستان کی ادبی فضا میں افسانوی ادب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور کتب ورسائل کا بڑا حصہ فکشن اور فکشن پر گفتگو کا احاطہ کر رہا ہے۔

م ج: آج فکشن تنقید میں کون لوگ دلچسپی لے رہے ہیں؟

ش ظ ا: مجھے بے حد افسوس ہے کہ اچھے ناقدوں کی ایک بڑی کھیپ مثلاً پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، سید محمد عقیل، ابوالکلام قاسمی، اسلم آزاد، مشرف عالم ذوقی، مولا بخش وغیرہ اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ (ان کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں)۔ فی الوقت علی احمد فاطمی، ارتضیٰ کریم، محمود واجد، اعجاز علی ارشد، صغیر افراہیم، اسلم جمشید پوری، مہدی جعفر، خورشید احمد، احمد صغیر، نسیم احمد نسیم، صفدر امام قادری، حقانی القاسمی، خورشید حیات، ابوبکر عباد، ہمایوں اشرف، نعیم انیس، غالب نشتر، سلمان عبدالصمد، شہناز رحمٰن، سفینہ بیگم، نورین علی حق اور ضیاء اللہ وغیرہ فکشن کی نظریاتی اور عملی تنقید کے نہایت عمدہ نمونے پیش کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ روز بروز قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔

م ج: آپ کی نظر میں فکشن تنقید کیسی ہونی چاہیے؟

ش ظ ا: فکشن کی تنقید صبر طلب اور نسبتاً مشکل کام ہے کیونکہ یہ ناقد سے متعدد تقاضے کرتی ہے۔ مثلاً پوری کہانی پر نظر ہونا، کہانی کی جزئیات، زبان، قصہ پن اور فن قصہ نگاری سے واقفیت، اسلوب اور موضوع میں ہم آہنگی وغیرہ فکشن کی تنقید کے اہم اجزا ہیں، جو ناقد سے گہرے اور مسلسل توجہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ کسی فکشن نگار کی قدر سنجی کے لیے اس کی جملہ تصانیف کے علاوہ پورے افسانوی

ادب کا مطالعہ بھی خاصا وقت طلب اور پیچیدہ عمل ہے۔ شاید اسی لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ ''اچھے شعر کا معاملہ نسبتاً اتنا مشکل نہیں، اچھی کہانی کے ساتھ بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔''

م ج: کیا شاعری کی تنقید کم مایہ یا آسان ہوتی ہے؟

ش ظ ا: اس بیان کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ شاعری کی تنقید کم مایہ ہوتی ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ و تہذیب نے وہ مخصوص ذہن پیدا کر دیا ہے کہ ادب کی تعبیر و تفہیم کا عمل شاعری سے شروع ہوتا ہے اور اکثر شاعری پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایک عظیم کلاسیکی ورثے کے طور پر بھی شاعری نقادوں کے لیے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہی ہے۔ شاید اسی لیے ہمارے بعض ناقدین فکشن کی تنقید میں بھی شاعری کی تنقید کی طرح اشاروں، کنایوں اور علامتوں میں بات کرنے کے فیشن میں مبتلا نظر آتے ہیں جن کی تحریریں بعض اوقات علامتی افسانوں سے بھی زیادہ گنجلک اور ثقیل ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف بعض نقاد فکشن کی روح کو چھونے کے بجائے اسے نثری روپ میں منتقل کر کے اس کی تلخیص پیش کرنے کو ہی غایت نقد سمجھ بیٹھے ہیں جبکہ اصل مقصد یہ جاننا ہے کہ افسانہ یا ناول کن لسانی اور ہیئتی وسائل کو کام میں لے کر تخلیق کا درجہ حاصل کر سکا ہے۔

م ج: میں نے دیکھا ہے کہ فکشن تنقید میں اسلوب کو آپ بہت اہمیت دیتے ہیں، کیا سبب ہے؟

ش ظ ا: فکشن کے مطالعے کے ضمن میں کرداروں، واقعات، تہذیب و معاشرے اور سماجی و نفسیاتی عوامل کے ساتھ کلیدی اہمیت اس لسانی برتاؤ کو حاصل ہے جو کہانی کی تشکیل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہانی کا ہر جملہ اور ہر لفظ اور اس کا محل استعمال اور اس کے سیاقی تلازمات تخلیقی تجربے کو متشکل کرتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ادب کو غیر ادب سے جو چیز امتیاز بخشتی ہے وہ 'اسلوب' ہے۔ یہ بات فکشن پر سب سے زیادہ صادق اس لیے آتی ہے کہ فکشن نگار کا مقصد قاری تک صرف کہانی، کردار، فضا اور معاشرتی، بشریاتی اور ثقافتی معلومات پہنچانا نہیں بلکہ کہانی کے لسانی برتاؤ سے کرداروں کے اندرونی تضادات، جذباتی تہہ داریوں اور حیات و کائنات کی پیچیدہ اور مشکل سے مشکل آگہی سے اسے باقاعدہ متعارف کرانا بھی ہے۔ چنانچہ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ کہانی کا اسلوبیاتی و لسانی تجزیہ کر کے اس تجربے کو بھی پہچاننے کی سعی کرے۔ جس نے افسانے یا ناول کو تخلیقی شناخت عطا کیا ہے اور جس نے کہانی میں طلسمی کیف و اثر پیدا کر دیا ہے۔ فکشن کی اسلوبیاتی و لسانی ساخت کا ایسا ہی مطالعہ تنقید کے تفاعل کو متعین کرتا ہے۔

م ج: کچھ اپنے تنقیدی نظریات کے بارے میں بتائیے؟

ش ظ ا: اپنے نظریات کے بارے میں خود کچھ اظہار خیال کرنا اس لیے مناسب نہیں سمجھتا کہ میری تحریریں خود اس کا اظہار ہیں۔ اس کے علاوہ میں یوں بھی کسی ادعا کا قائل نہیں۔ میں نقاد اور ادیب بھی کہلوانا پسند نہیں کرتا

اردو ناول کی تاریخ میں آج کے بہت سے ناول اضافہ ثابت ہو رہے ہیں۔ نت نئے تجربات ہو رہے ہیں، معنی کی تعبیریں وقت کے ساتھ بدلتی ہیں۔ ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انھی ناولوں میں سے کوئی بڑا ناول بھی نکلے گا جو دنیا کو حیرت زدہ کر دے گا۔ اسلوب و افکار کی سطح پر جو تجربات ہو رہے ہیں وہ ان خوش آئند اور روشن امکانات کی طرف واضح اشارہ کر رہے ہیں جو اکیسویں صدی میں اردو ناول کا مقسوم ہوں گے۔

کیونکہ میں خود کو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم سمجھتا ہوں جس کا مطالعہ بہت محدود اور جس کی نظر بہت کمزور ہے۔ ایک طالب علم اور قاری کی حیثیت سے میں جو کچھ پڑھتا ہوں اس پر اپنے خیالات یا تاثرات کا اظہار کرتا ہوں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص میری ہر بات سے اتفاق کرے۔ اختلاف بھی فکر کو مہمیز کرتا ہے بشرطیکہ اس کی بنیاد تنگ نظری اور عصبیت پر نہ ہو۔ اگر میری تحریریں سوچنے پر مجبور کریں اور ان سے نئی فکر کے راستے کھلیں خواہ ان کی سمت مختلف ہی کیوں نہ ہو تو یہی بہت ہے۔ مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ اپنی تحریروں میں کوئی نئی اور انوکھی بات پیش کر رہا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں مضامین سپرد قلم کرتے ہوئے ایماندارانہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ موضوع کے اندرون میں داخل ہو کر ایسے نتائج اخذ کر سکوں جو قارئین کو مطمئن کریں اور انھیں فن پارے یا فنکار کی تحریروں کے مطالعے کے لیے مہمیز کر سکیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ موضوع سے انصاف کیا جائے اور مصنف یا متن کا مثبت اور غیر جانبدارانہ مطالعہ سامنے آئے۔ میں خواہ مخواہ نکتہ چینی، جارحانہ اظہار خیال اور استہزائی لب و لہجے کو سخت معیوب سمجھتا ہوں۔ میں ہمدردانہ اور تعمیری نقطۂ نظر کا حامی ہوں کیونکہ میرا ایقان ہے کہ مصنف یا ادیب اپنی تخلیقات میں زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی اپنے طور پر بہتر سے بہتر طریقے سے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ زندگی کے تجربات کو اپنے نقطۂ نگاہ سے پیش کرتا ہے۔ وہ خود کو تجربات کی بھٹی میں جلا کر، ناکامیوں اور محرومیوں میں تپا کر اپنے زمانے کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یعنی اپنے افکار و تجربات کو تخلیقی اور فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی ہر پیش کش آپ کو مطمئن کرے یا آپ کے معیار پر پوری اترے، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کا مذاق اڑا کر یا اس کی منفی نکتہ چینی کر کے اس کا حوصلہ پست کر دیا جائے۔ اچھے نقاد کا فرض ہے کہ وہ تخلیق کے سیاہ و سفید اور اچھائی، برائی سے مصنف کو آگاہ کرے مگر اس طرح کہ اسے نقاد اپنا ہمدرد و رہنما محسوس ہو دشمن جاں نہیں۔ مثبت اور تعمیری تنقید سے فنکار کو سمت و رفتار ملتی ہے اور خوشی بھی۔

م ج: اردو ناول کی پیش رفت کیا تھم گئی ہے؟

ش ظ ا: میرا خیال ہے کہ اردو ناول موضوعات، افکار اور اسالیب اظہار کے میدان میں بتدریج ارتقا کی طرف گامزن ہے۔ اردو کے نئے ناول مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے عکاس اور پاسباں ہیں۔ آج کے ناول صرف تفنن طبع یا وقت گزارنے کی چیز نہیں ہیں۔ ان میں ہم حالات سے جوجھتے جدوجہد کرتے انسان کی پوری زندگی دیکھ سکتے ہیں۔ بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر سماج کی ہر دھڑکن ان میں محسوس کر سکتے ہیں۔ اردو ناول کی تاریخ میں آج کے بہت سے ناول اضافہ ثابت ہو رہے ہیں۔ نت نئے تجربات ہو رہے ہیں، معنی کی تعبیریں وقت کے ساتھ بدلتی ہیں۔ ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انھی ناولوں میں سے کوئی بڑا ناول بھی نکلے گا جو دنیا کو حیرت زدہ کر دے گا۔ اسلوب و افکار کی سطح پر جو تجربات ہو رہے ہیں وہ ان خوش آئند اور روشن امکانات کی طرف واضح اشارہ کر رہے ہیں جو اکیسویں صدی میں اردو ناول کا مقسوم ہوں گے۔

م ج: اکیسویں صدی میں اردو کے اہم ناول کون کون سے آئے ہیں؟

ش ظ ا: اکیسویں صدی میں ناول کی رفتار حوصلہ افزا ہے۔ صرف بہار جیسے ایک صوبے سے تقریباً 35 سے 40 ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ناموں کو شمار کروانے میں چھوٹ جانے کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے مگر چند اہم ناولوں کا

کلاسیکی اصول و ضوابط بے ترتیبیوں اور تضادات میں رل مل کر اس طرح آرہے ہیں کہ اسالیب کا تمام رکھ رکھاؤ پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے۔اس میں روایت سے انحراف، پرانے اسلوب سے بیزاری اور بندھے ٹکے اصولوں سے علیحدگی کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ زبان، جذبہ اور خیال سب مل کر ایک بہت ہی نیا اسلوب بنا رہے ہیں جس میں نہ تزئین کاری ہے اور نہ فطرت کی پینٹنگ۔ ہاں بدلتی ہوئی قدروں اور حقیقتوں کا احساس ضرور ہے۔ بدلتی ہوئی قدریں زندگی میں تہذیب کی پالش گوارا نہیں کرتیں اس لیے ناول کے اسلوب سے رنگینی ختم ہوتی جارہی ہے اور اس نے جذباتیت سے بھی ہاتھ کھینچ لیاہے۔

بھی ذکر کیا جائے تو اکیسویں صدی میں ناول کی تاریخ شکست کی آواز، مہاماری، وش منتھن، پلیتہ، چراغ تہ داماں، جنگ جاری ہے، پوکے ماں کی دنیا، نالۂ شب گیر، بادل، کئی چاند تھے سرِ آسماں، برف آشنا پرندے، اندھیرا پگ، موت کی کتاب، صدائے عندلیب بر شاخِ شب، میرے نالوں کی گمشدہ آواز، خدا کے سائے میں، آنکھ مچولی، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، کہانی کوئی سناؤ متاشا، اگرتم لوٹ آتے، دھند میں اگا پیڑ، کالی مائی، لیمینیٹڈ گرل، دکھیاری، گرداب، تخم خوں، لفظوں کا لہو وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان ناولوں میں موجودہ یا گذشتہ زندگی کو اس طرح سمیٹ لیا گیا ہے کہ شاید ہی عوام و خواص کی زندگی کی کوئی صورت ان کی گرفت اور اظہاریت سے چھوٹی ہو۔اکیسویں صدی کا یہ عرصہ ناول کی تخلیق کے لحاظ سے بھرپور رہا ہے۔

م ج: اکیسویں صدی میں خواتین ناول نگاروں پر روشنی ڈالیں۔

ش ظ ا: اکیسویں صدی میں جن خواتین کے ناول میری نظروں سے گزرے ہیں ان میں ساجدہ زیدی (مٹی کے حرم) ثروت خان (اندھیرا پگ) ترنم ریاض (برف آشنا پرندے) شائستہ فاخری (نادیدہ بہاروں کے نشاں، صدائے عندلیب بر شاخ شب) صادقہ نواب سحر (کہانی کوئی سناؤ متاشا) افسانہ خاتون (دھند میں کھوئی ہوئی روشنی) نسرین ترنم (ایک اور کوسی) آشا پربھات (دھند میں اگا پیڑ) نیلوفر (اوٹرم لین) نشاط پیکر (شمع ہر رنگ میں جلتی ہے) نصرت شمسی (اوڑھنی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔تانیثیت اکیسویں صدی کا اہم رجحان ہے۔جس نے ان ناولوں میں جگہ بنائی ہے۔عورتوں کے مسائل، حقوق کی پامالی، نسائی استحصال اور معاشرے کے جبریہ نظام کے خلاف خواتین کا احتجاج ان ناولوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

م ج: اعلیٰ اور معیاری ناولوں کی تخلیق میں کیا فرق ہے؟

ش ظ ا: اعلیٰ اور معیاری ناول قاری کو زندگی کی بصیرت عطا کرتا ہے۔اچھا ناول معاشرہ، فرد اور ذات کے نہ صرف خارجی عوامل وعناصر کو پیش کرتا ہے بلکہ داخلی تضاد و تصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔یہ کسی قوم، سماج یا معاشرے کی فکری و نظریاتی فضا کا اظہاریہ ہوتا ہے......ناول زندگی کا جزو نہیں کل ہے۔اس میں ایک وسیع سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو سمیٹنے کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔بڑا ناول مصنف کے مخصوص وژن یا نقطۂ نگاہ سے قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔بڑا یا معیاری ناول محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ اعلیٰ فن پاروں کی طرح زندگی، معاشرے اور کائنات کے رازہائے سربستہ کی بصیرت افروزی کا موثر وسیلہ بھی ہوتا ہے۔

م ج: ناول کی بہ نسبت افسانہ کی طرف عام رجحان زیادہ کیوں ہے؟

ش ظ ا: اِس کا بہت آسان جواب جو ہمیشہ دیا جاتا رہا ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ مختصر ہوتا ہے اس لیے زیادہ پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ناول، ضخامت کے اعتبار سے بڑا اور منصوبہ بند طریقے سے لکھا ہوا فن پارہ ہوتا ہے اس لیے نسبتاً کم تعداد میں سامنے آتا ہے۔لہٰذا کم پڑھا بھی جاتا ہے۔آج کی بے انتہا مصروف زندگی میں ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل وغیرہ سے جو وقت بچ جاتا ہے اس میں قاری افسانہ تو آسانی سے پڑھ لیتا ہے، ناول کے لیے اسے خاص طور پر وقت نکالنا پڑتا ہے۔اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ناول کی طرف قاری کا رجحان کم ہوا ہے۔بقول فاروقی صاحب اردو معاشرے میں عمومی طور پر قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور عبداللہ حسین کا نفوذ ان کے معاصر شعرا سے بڑھ کر ہے۔

م ج: کیا جنس اور عورت کے بغیر اردو میں معیاری ناول نہیں لکھا جاسکتا؟

ش ظ ا: نہیں۔جس طرح ایک نارمل اور کامیاب زندگی کے لیے عورت کا وجود ضروری ہے اسی طرح اچھے ناول میں عورت کا کردار اہم ہے۔وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔کہا جاتا ہے کہ ناول زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے، تو ناول کی کائنات بغیر عورت کے کیسے مکمل ہوسکتی ہے؟

م ج: زوال آمیز تہذیب کے بدلتے نقش کو آج کے کن ناول نگاروں نے موضوع بنایا ہے؟

ش ظ ا: 21 ویں صدی کے جن ناولوں کا میں نے ذکر کیا ان سب میں زوال پذیر تہذیب کے بدلتے نقش بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں، مگر خاص طور سے مشرف عالم ذوقی، عبدالصمد، حسین الحق، شموئل احمد، پیغام آفاقی، حبیب حق، احمد صغیر، شائستہ فاخری، رحمان عباس اور غیاث الدین کے ناولوں میں قدروں کے زوال کی عکاسی نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

م ج: آج کے ناول نگار بدلتے اسلوب واظہار کے معاملے میں کس حد تک مطمئن ہیں؟

ش ظ ا: گزشتہ دو دہائیوں میں جو ناول سامنے آئے ہیں ان میں فکر، ہیئت اور اسلوب کی سطح پر مختلف تجربات کی کوششیں ملتی ہیں۔ان تجربات میں زبان اور اسلوب واظہار کے تجربات سب سے نمایاں ہیں۔آج کے ناولوں کے اسلوب واظہار پر بدلتی ہوئی تہذیب کا اثر ہے اور نت نئے موضوعات کا بھی۔اس اسلوب میں پرانی صورتیں تیزی سے بدل رہی ہیں۔کلاسیکی اصول وضوابط بے ترتیبیوں اور تضادات میں رل مل کر اس طرح آ رہے ہیں کہ اسالیب کا تمام رکھ رکھاؤ پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے۔اس میں روایت سے انحراف، پرانے اسلوب سے بیزاری اور بندھے ٹکے اصولوں سے علیحدگی کو آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔زبان، جذبہ اور خیال سب مل کر ایک بہت ہی نیا اسلوب بنا رہے ہیں جس میں نہ تزئین کاری ہے اور نہ فطرت کی پینٹنگ۔ہاں بدلتی ہوئی قدروں اور حقیقتوں کا احساس ضرور ہے۔بدلتی ہوئی قدریں زندگی میں تہذیب کی پالش گوارا نہیں کرتیں اس لیے ناول کے اسلوب سے رنگینی ختم ہوتی جارہی ہے اور اس نے جذباتیت سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔سنجیدہ سے سنجیدہ اور دل ہلا دینے والا واقعہ غیر جذباتی الفاظ میں سامنے آتا ہے اور صرف واقعہ بتا کر گزر جاتا ہے۔یعنی یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ناول کے نئے اسلوب واظہار پر عقلیت اور سوجھ بوجھ کا دائرہ حاوی نظر آتا ہے۔اور آج کے ناول نگار اس بدلتے اسلوب سے پوری طرح مطمئن بھی ہیں۔

■

Dr. Musarrat Jahan
Vaishali Mahila College,
Hajipur, Bihar, Pin. No-844101

ابرار حسین

مظہر امام کی خاکہ نگاری

مظہر امام بہار کے شہر دربھنگہ میں 12 مارچ 1928 کو پیدا ہوئے۔ آپ ایک ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام سید امیر علی تھا اور والدہ کنیز فاطمہ تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ 1951 میں بی۔اے اور 1969 میں بہار یونیورسٹی سے فارسی میں اور 1971 میں مگدھ یونیورسٹی سے اردو سے ایم اے کیا۔ گریجویشن کے بعد کلکتہ میں صحافت اور درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ 1975 میں سری نگر دوردرشن سے منسلک ہوئے اور وہیں سے سلیکشن گریڈ ڈائرکٹر کے منصب سے 1988 میں ریٹائر ہوکر دہلی آ گئے۔

اردو ادب کی دنیا میں مظہر امام شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے افسانے بھی لکھے لیکن ان کا خاص میدان شاعری تھا۔ شاعری میں غزل، نظم، نظم معریٰ، آزاد نظم، ترائلے، سانیٹ ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ ان کو شاعری کے ہیئتی تجربوں سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ کلام کی باقاعدہ اشاعت کا سلسلہ 'نقوش' لاہور (دسمبر 1950) اور شاہراہ، دہلی (اکتوبر 1951) سے ہوا۔ ان کے کلام کے ترجمے انگریزی، روسی، عربی کے علاوہ ہندوستان کی تقریباً تمام اہم زبانوں مثلاً ہندی، بنگالی، آسامی، اڑیا، میتھلی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، کشمیری اور ڈوگری وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔

مظہر امام کا پہلا شعری مجموعہ 'زخم تمنا' 1962 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'رشتہ گونگے سفر کا' 1974 اور تیسرا شعری مجموعہ 'پچھلے موسم کا پھول' 1988 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ان کی تقریباً پچاس منتخب نظموں کا مجموعہ 'بند ہوتا ہوا بازار' 1992 میں شائع ہوا۔ شاعری کے علاوہ ان کی نثری تخلیق قابل قدر ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'آتی جاتی لہریں' 1981، 1988 میں تحقیقی اشاریہ 'آزاد غزل کا منظر نامہ'۔ ساہتیہ اکادمی نئی دلی کی جانب سے 1992 میں 'ہندوستانی ادب کے معمار' جمیل مظہری پر ان کا مونوگراف منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ادبی شخصیتوں کے خاکوں کا مجموعہ 'اکثر یاد آتے ہیں' کے نام سے 1993 میں اشاعت پذیر ہوا۔

مظہر امام 30 جنوری 2012 کو اس دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کیا۔

مظہر امام کے خاکوں کا مجموعہ 'اکثر یاد آتے ہیں' 1993 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں آٹھ خاکے شامل ہیں۔ جگر مرادآبادی، عبدالرزاق ملیح آبادی، اشک امرتسری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، کرشن چندر، اختر قادری اور خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں۔ اس مجموعے میں اپنے اساتذہ کا تذکرہ، بعض بزرگوں کے نظریات، ان کی خوبیوں، کمزوریوں اور دوستوں کی کارستانیاں وغیرہ کے ذکر کے ساتھ مصنف نے طالب علمی کے دور کی کمزوریوں کی روداد بھی پیش کی ہے۔

مظہر امام نے جن آٹھ شخصیات پر اپنی یادداشتوں کو قلمبند کیا ہے۔ ان میں بعض تاثراتی مضامین کا درجہ رکھتے ہیں اور بعض خاکے فنی معیار پر اترتے ہیں۔

افتخار اجمل شاہین کے نزدیک مظہر امام کے خاکے، خاکے کے فن پر کھرے نہیں اترتے بلکہ ان کے خاکے کو شخصی مضامین یا یادداشتوں کا نام دیا ہے لیکن حیدر قریشی نے مظہر امام کے ان مضامین کو 'آزاد خاکے' کا نام دیا ہے جو بہت حد تک درست بھی ہے۔ مظہر امام ادب میں تجربے کے قائل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے غزل سے آزاد غزل کا تجربہ کر کے اسے ایک باضابطہ شکل دی۔ اس وجہ سے انھیں آزاد غزل کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس طرح انھوں نے خاکوں کی معروف اور مروجہ تعریفوں سے ہٹ کر آزاد خاکوں کا تجربہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ حیدر قریشی ان مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اکثر یاد آتے ہیں' کے مضامین کو شاید خاکہ کی کسی لگی بندھی تعریف کے دائرے میں لانا مشکل ہو۔ اس کے باوجود ان مضامین میں خاکہ نگاری کے بیشتر اوصاف موجود ہیں۔ مظہر امام نے اپنے آٹھ ممدوحین کی صورت میں باری باری آٹھ آئینوں میں اپنے آپ کو دیکھا ہے۔ ہر آئینے میں ان کی شخصیت اپنے گزرے ہوئے کسی زمانے کو ساتھ لیے جلوہ گر ہے۔ پھر اسی زمانے کی خاک سے ان کے ممدوح ابھرتے ہیں اور مظہر امام کے ساتھ بتائی ہوئی اپنی زندگی پھر سے جیتے دکھائی دیتے ہیں۔''

بہرحال مظہر امام کے یہ مضامین خاکہ نگاری کے معیار پر کھرے اترتے ہوں یا نہ اترتے ہوں لیکن ان تحریروں میں مذکورہ شخصیتوں کے ضمن میں بعض ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن کا ذکر دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے مظہر امام کے یہ خاکے منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔

خاکہ نگار کو کسی شخصیت کا خاکہ لکھنے سے پہلے اس کے بارے میں پوری جانکاری رکھتا ہو یا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہو۔ تبھی وہ ایک اچھا خاکہ لکھ سکتا ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کی تصویر اس وقت بنا سکتا ہے جب شخصیت کے تمام پہلوؤں کو غیر جانبدار ہو کر پیش کرے۔ مظہر امام نے اپنے خاکوں میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ وہ شخصیات کی ادبی قابلیت ان کے اخلاق و کردار اور سیرت کے صرف مثبت پہلوؤں پر ہی نظر رکھتے ہیں اور منفی پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

خاکے کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ خاکوں میں چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے شخصیت کے کردار، اخلاق اور سیرت وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں جس سے شخصیت اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔ لیکن مظہر امام کے خاکوں میں چھوٹے چھوٹے واقعات نظر نہیں آتے بلکہ وہ ایک تواتر سے شخصیت کی ادبی اور سماجی حیثیت کو بیان کرتے ہیں۔

تمام اصناف ادب کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جس سے وہ صنف پہچانی جاتی ہے۔ خاکے کا بھی اپنا ایک اسلوب ہے۔ وہ یہ کہ خاکے کی تحریروں میں شگفتگی اور سنجیدگی کے ساتھ کہیں کہیں طنز و مزاح کے پہلو بھی نظر آئیں۔ مظہر امام کے یہاں وہ اسلوب کی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے جس سے ان کی تحریر خشک نظر آتی ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعے مزاح پیدا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ ہمیں ان کے خاکوں میں انہی ساری کمیوں کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

'اکثر یاد آتے ہیں' کا پہلا خاکہ جگر مرادآبادی کی شخصیت پر ہے۔ اس خاکے کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

''جگر صاحب کا نام بچپن سے ہی سنتا آیا تھا۔ میٹرک کا طالب علم تھا جب اپنے بڑے بھائی جناب حسن امام

درد کے اصرار پر پہلی دفعہ کسی مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ (خاکہ جگر مرادآبادی، مشمولہ، اکثر یاد آتے ہیں، ص 5)

مظہر امام کو بچپن سے ہی جگر مرادآبادی سے ذہنی وابستگی رہی ہے۔ ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے اور ان کو شاعری کی طرف راغب کرنے میں جگر مرادآبادی کی پرکشش شخصیت کا شعوری و غیر شعوری طور پر ایک اہم رول رہا ہے۔ جگر صاحب سے کئی ملاقاتیں بھی رہی ہیں، اس کا ذکر مظہر امام نے خاکے میں کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جگر کی شخصیت کو پیش کرنے میں اپنی خاکساری، معتقدانہ اور سعادت مندانہ انداز اختیار کیا ہے۔

اشک امرتسری ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ مظہر امام ان کے خاکے میں شاعری کے ذریعے ان کی شخصیت کا تعارف کراتے ہیں۔ یہ مجموعے کا مختصر ترین خاکہ دس صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص سے متعلق معلومات سے پر ہے جسے غیر متغزلانہ زبان اور کھردرے موضوعات کی بنا پر شرفا کی بزم سخن میں شرکت کی دعوت نہ دی جاتی تھی لیکن صاحب کتاب ان کی خداداد صلاحیتوں اور ذاتی خوبیوں کی بنا پر ان سے رشتہ یگانگت استوار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ مظہر امام جب کلکتہ گئے تو وہاں کے ادبی ماحول سے نا آشنا تھے۔ کلکتے میں اپنے دوستوں (انوار عظیم، ش مظفر پوری اور نشاط الایمان) کے علاوہ کسی سے شناسائی نہ تھی۔ اچانک ایک مشاعرے کا دعوت نامہ ان کے پاس آیا۔ جب مشاعرے میں پہنچے تو پہلی بار اشک امرتسری پر نظر پڑی جو مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے اس وقت مظہر امام کے ذہن میں اشک امرتسری کا جو نقشہ ابھرا اس کو خاکے میں اس انداز سے بیان کیا ہے:

''انور عظیم شعرا کے نام پکار رہے تھے۔ سردار جعفری اور پرویز شاہدی کے قریب مسند صدارت پر ایک دبلا پتلا شخص موٹے شیشے کی عینک لگائے معمولی قمیص پائجامے میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اندر کو دھنسے ہوئے رخسار، حد سے بڑھی ہوئی لمبی ناک، چہرے پر چیچک کے گہرے داغ، مہندی سے رنگے ہوئے بال۔ عمر پچاس کے لگ بھگ۔ بھلا ایسے صدر سے کون متاثر ہوتا! معلوم ہوا، آپ اشک امرتسری ہیں۔''

(خاکہ اشک امرتسری، مشمولہ اکثر یاد آتے ہیں، ص 28)

مظہر امام نے خوش اسلوبی سے جمیل مظہری کا تفصیلی تعارف کرایا ہے اور ان کے متعلق بہت ساری معلومات بہم پہونچائی ہیں کہ وہ کلکتہ اور پٹنہ میں ان سے برابر ملتے اور قریب سے دیکھتے رہے۔ ان میں وہ باتیں بھی ہیں جو ان کی شخصیت سے وابستہ ہو کر مشہور ہو چکی ہیں اور ایسی باتیں بھی جن سے ان کے کردار کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ جیسے شراب نوشی سے مکمل پرہیز اور اپنے نادار اقربا کی مالی امداد کرنا۔

مظہر امام نے جمیل مظہری کے خاکے میں ان کے شاعرانہ اوصاف کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جمیل صاحب نے ایک عرصے تک شادی نہیں کی، اپنی پہلی محبت کو سینے سے لگائے رہے۔ دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر 40 سال کی عمر میں مٹیا برج کی ایک بیوہ سے شادی بھی کی تو ازدواجی زندگی کا سکھ انھیں نصیب نہ ہو سکا۔ حد تو یہ کہ ان کی بیوی کے یہاں آنا جانا بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جمیل صاحب صاف صفائی کے معاملے میں قدرے بے پرواہ تھے، لیکن ایک دردمند طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بھائی اور بہن کے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ آمدنی کا زیادہ تر حصہ عزیز و اقارب پر خرچ کر دیتے تھے۔ مظہر امام ان کی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جمیل مظہری دوسروں کی خوشی اور غم دونوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ وضع داری آج کی تیز رفتار زندگی میں معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ کہتے تھے!''اے گم شدگی! اے بے نیازی! تیرا نام جمیل مظہری ہے۔'' ایسے پراگندہ طبع لوگ کہاں ہیں۔ کاش ایسی گم گشتگی اور بے نیازی ہر ایک کو میسر ہو جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھے، جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی محرومیوں کا سایہ نہ پڑنے دے۔'' (خاکہ جمیل مظہری، مشمولہ اکثر یاد آتے ہیں، ص 65)

اختر قادری پر تحریر کردہ خاکہ ایک لائق اور سعادت مند شاگرد کی جانب سے ایک خوبصورت خراج عقیدت ہے۔ مظہر امام اپنے استاد سے پہلی ملاقات، پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ ہونے کی وجہ سے استاد سے بہت زیادہ قریب ہو گئے اور اس قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مظہر امام جو بھی تخلیق کرتے استاد کو بطور اصلاح ضرور دکھاتے۔ قادری صاحب اس تخلیق کی تعریف کرتے اور اصلاح بھی فرماتے۔ استاد سے اپنی شعری اصلاح کے بارے میں فرماتے ہیں:

'' مجھے صحیح یاد نہیں، شاید 1946 میں اپنی 18-20 بالکل ابتدائی غزلیں میں نے ان کے پاس اصلاح و مشورہ کی غرض سے بھیجیں۔ قادری صاحب نے حسب معمول انکساری سے کام لیتے ہوئے لکھا کہ آپ میں شعر گوئی کی خداداد صلاحیت ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس لیے کلام پر اصلاح کیا معنی! البتہ آپ نے اتنی محبت سے یاد کیا ہے تو کہیں کہیں اپنے خیالات پیش کر دوں گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قادری صاحب نے بہت توجہ سے ان غزلوں کو دیکھا، کہیں کہیں ترمیم کے اسباب بھی بتائے، کچھ اشعار کو قلم زد بھی کیا، ایک حذف کردہ شعر یہ تھا۔

ان دنوں ناراض ہے مجھ سے خدا
رازگار سر خوشی ہے آج کل

اس پر اختر قادری نے اتنا لکھا تھا: نعوذ باللہ آپ نہیں جانتے، خدا کی ناراضی کیا ہے!''

(خاکہ اختر قادری مشمولہ اکثر یاد آتے ہیں، ص 139)

کرشن چندر کے خاکے کی ابتدا عقیدت مندانہ لب و لہجے سے کی گئی ہے۔ ان کے کئی افسانوں کے نام گنوا کر ان کے مطالعے ہی کی نہیں بلکہ انھیں حرز جاں بنانے کی بات کی گئی ہے۔ پھر ان سے خط و کتابت اور کلکتہ میں ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی سے مظہر امام کے دیرینہ تعلقات رہے ہیں۔ یہ دونوں ایک عرصے تک ترقی پسند تحریک کے شہسواروں میں تھے، چنانچہ اس حوالے سے ان دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں اور ملاقات و تعلقات کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ مصنف نے اس تاثراتی خاکے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی یار باشی، ان کے اخلاق و محبت، ان کا حافظہ، معروف اور غیر معروف ادیبوں کی چیزوں کو پڑھنا، یاد رکھنا نیز ان کی شعری و ادبی خدمات وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے ملاحظہ ہو:

''خلیل الرحمٰن اعظمی شاعر اور نقاد کی حیثیت سے دو چار سال کے اندر ہی معتبر تسلیم کر لیے گئے اور ان کی نثری اور شعری تخلیقات ارباب نقد و نظر کی توجہ کا مرکز بننے لگیں۔ انھیں جائز طور پر نئی غزل کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں جو بصیرت اور نظر ملتی ہے، خیالات کی جو صفائی، وضاحت اور انداز نظر کی جو معروضیت ہے وہ ہماری نئی تنقید کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔''

(خاکہ خلیل الرحمٰن اعظمی، مشمولہ اکثر یاد آتے ہیں، ص 148)

مظہر امام کے خاکے شاہد ہیں کہ انھوں نے بحیثیت خاکہ نگار اپنے قلم کے جوہر دکھانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت کے حوالے سے ادبی اور تہذیبی دنیا کے ایک عہد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور اپنے انداز سے خاکہ نگاری کی روایت میں توسیع بھی کی ہے۔ ان کے خاکے الگ الگ زمانے میں لکھے گئے مگر مجموعے کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان آٹھ منفرد اور باکمال شخصیتوں کے درمیان تقریباً اسی معیار کی نویں شخصیت بھی اپنے پورے جمال و کمال کے ساتھ ابھری ہے اور وہ شخصیت خاکہ نگار کی ہے۔ 'اکثر یاد آتے ہیں' کے خاکوں کے مطالعے سے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ان خاکوں کو مصنف نے پوری دل سوزی اور خلوص کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ خاصے معلوماتی بھی ہیں اور دلچسپ بھی اور اردو کے شخصی خاکوں میں یاد رکھے جانے کے لائق بھی ہیں۔

■

Abrar Husain Azmi
Research Scholar, Dept. of Urdu,
Delhi University, Arts Faculty
Delhi-110007
Mob:9598910538

محمد شاہنواز خان

حالی کا تصور وزن
ایک جائزہ

حالی نے 'مقدمہ شعروشاعری' میں شعر کے تصور وزن پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کے تصور وزن کو پیش کر دیا جائے۔

'شعر کے لیے وزن ضروری ہے یا نہیں' کے عنوان کے تحت حالی لکھتے ہیں:

شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول، جس طرح راگ فی حد ذاتہ الفاظ کا محتاج نہیں۔ اسی طرح نفس شعر وزن کا محتاج نہیں۔ اس موقع پر جیسے انگریزی میں دو لفظ مستعمل ہیں: ایک پوئٹری اور دوسرا ورس، اسی طرح ہمارے ہاں بھی دو لفظ استعمال میں آتے ہیں: ایک شعر اور دوسرا نظم اور جس طرح اُن کے ہاں وزن کی شرط پوئٹری کے لیے نہیں، بلکہ ورس کے لیے ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں ہونی چاہیے۔

(مقدمہ شعر و شاعری، الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، 2018، ص 43)

''عرب شعر کے کیا معنی سمجھتے تھے'' کے عنوان کے تحت حالی عربوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ عرب برجستہ اور دل آویز فقروں، مؤثر اور دل کش تقریروں کو شاعری سے تعبیر کرتے تھے۔ نیز محقق طوسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'عبری اور سُریانی اور قدیم فارسی میں شعر کے لیے وزن حقیقی ضروری نہ تھا سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے۔' (مقدمہ شعروشاعری، ص 44)

تصور وزن پر گفتگو سے پہلے وزن کی حقیقت پر تھوڑی سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وزن کے تعلق سے ممتاز حسین اپنی کتاب 'حالی کے شعری نظریات: ایک تنقیدی مطالعہ' میں لکھتے ہیں:

تمام حکما اس امر پر متفق ہیں کہ وزن کا تعلق حسب ذیل باتوں سے ہے:

1 ادائیگی حرف کی مدت، زمان یا دوران۔ (Duration)
2 ادائیگی حرف سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان کا حجم (Volume) یعنی بھاری، ہلکی، ثقیل، خفیف، بلند و کوتاہ آواز۔
3 ان آوازوں کے سُر اور تال (Timing) یعنی وہ وقفہ جو تکرار آہنگ کے درمیان متعین کیا جاتا ہے۔

(حالی کے شعری نظریات، ایک تنقیدی مطالعہ، ممتاز حسین، سعد پبلی کیشنز، کراچی، 1988 ص 6)

یہ بات واضح ہو کہ وزن کمیاتی یعنی Quantitative، یا کیفیاتی یعنی Qualitative ہوتا ہے۔ اردو میں وزن کا تعلق کمیاتی وزن سے ہے۔ اس میں مصوتے کی طوالت یا اختصار مد نظر رہتا ہے، نہ یہ کہ کسی آواز کو ادا کرنے میں کتنا زور صرف ہوا ہے۔

شعر کی ماہیت کے بارے میں سب سے پہلے ارسطو نے اپنی 'بوطیقا' میں گفتگو کی ہے۔ اس کے ایک متنازعہ فیہ جملے نے متاخرین کو وزن کے تعلق سے دو گروہ میں تقسیم کر دیا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ارسطو کے نظریۂ شعر پر ہی ایک نظر ڈال لی جائے۔ ارسطو کے حوالے سے یہ بات تقریباً تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ شعر میں وزن کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف کلام مخیّلہ کو شعر کہتا ہے، خواہ وہ موزوں ہو یا غیر موزوں۔ جب کہ ارسطو کا نظریۂ شعر درج ذیل تین باتوں کی تفہیم پر مبنی ہے:

(1) کلام مخیّلہ موزوں، جسے وہ شعر کہتا ہے۔ جیسے ہومر کا کلام۔
(2) کلام غیر مخیلہ موزوں، جسے ارسطو شعر کہنے سے گریز کرتا ہے۔ جیسے امپڈ اکلیز Empedocles کا منظوم کلام، جو علم طبعیات پر مبنی ہے۔ ارسطو اس کے کلام کو منظوم ہونے کے باوجود شعر نہیں کہتا۔ اور نہ ہی امپڈ اکلیز کو شاعر مانتا ہے۔
(3) کلام مخیلہ غیر موزوں، جسے وہ شعر نہیں کہتا، بلکہ اسے شعر کے علاوہ کچھ دوسرا نام دینا چاہتا ہے، لیکن اُس وقت اس کے ذہن میں کوئی اصطلاحی لفظ نہیں تھا، جس سے وہ اسے موسوم کرتا۔ جیسے 'مکالمات افلاطون' باوجود کہ کلام مخیلہ ہے لیکن وہ اسے شعر کہنے سے گریز کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارسطو کو 'کلام مخیلہ' لیکن 'غیر موزوں' کو شعر کہنے میں تأمل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ وزن کو شعر کے لیے غیر ضروری نہیں قرار دیتا۔

حالی کا نظم اور شعر میں وزن کے تعلق سے تفریق کرنے کا نقطۂ نظر بھی دراصل ارسطو کے نقطۂ نظر کی وہ تفہیم ہے، جو بعد کے محققین نے اپنے طور سے کی ہے۔ 'بوعلی سینا' نے اپنی کتاب 'الشفا' میں ارسطو کے حوالے سے شعر اور نظم میں تفریق کے تعلق سے لکھا ہے۔

وہ ارسطو کے نظریے کی تشریح کرنے والوں میں سر فہرست ہیں۔ اس لیے ان کے نظریے کی جھلک بعد کے محققین کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ محقق طوسی بھی ان کے خوشہ چیں رہے ہیں، جن کا حوالہ حالی نے بھی دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کی حالی نے بھی شعر اور نظم میں تفریق کا نظریہ یہیں سے اخذ کیا ہے۔ حالی نے تصور وزن کے تعلق سے محقق طوسی کا حوالہ دیا ہے۔ اس لیے محقق طوسی کی عبارت بھی درج کی جاتی ہے:

'پس شعر در عرف منطقی (ارسطو) کلام مخیل است و در عرف متأخراں کلام موزوں مقفی۔ چہ بحسب ایں عرف ہر سخنے را کہ وزنی و قافیتی باشد خواہ آں سخن برہانی باشد و خواہ خطابی و خواہ صادق و خواہ کاذب و اگر ہمہ بمثل توحید خالص یا ہذیانات محض باشد آں را شعر خوانند۔ و اگر از وزن و قافیہ خالی بود و اگرچہ مخیّل بود آنرا شعر نخوانند۔ و امّا قدما شعر کلام مخیّل را گفتہ اند و اگرچہ موزون حقیقی نبودہ است۔ و اشعارِ یونانیاں بعض چناں بودہ است۔ و دیگر لغات قدیم مانند عبری، سریانی، فرس ہم، وزن حقیقی اعتبار نکردہ اند۔ و اعتبار وزن حقیقی بداں می ماند کہ اول ہم عرب را بودہ است۔'

(اساس الاقتباس، چاپ دانشگاہ تہران، بہمن 1326، ص 586،

بحوالہ حالی کے شعری نظریات، ایک تنقیدی مطالعہ، ص 2)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ شعر منطقیوں (ارسطو) کی اصطلاح میں کلام مخیل ہے اور متاخرین (ارسطو کے بعد) کی اصطلاح میں شعر ایسا کلام ہے جو موزوں و مقفیٰ ہو، یعنی متاخرین کے نزدیک اگر شعر میں وزن و قافیہ نہ ہو تو وہ شعر نہیں اگرچہ کلام مخیل ہو۔ اس اعتبار سے ہر وہ کلام جو موزوں و مقفیٰ ہو، وہ شعر ہوگا گرچہ اس میں کچھ بھی نہ پیش کیا گیا ہو۔ لیکن قدما (ارسطو) کے نزدیک شعر کلام مخیل ہے اگرچہ اس میں وزن حقیقی نہ ہو۔ یونانی اور دیگر قدیم زبانیں جیسے عبری سُریانی وغیرہ میں بھی شعر وزن حقیقی کے بغیر ہوا کرتے ہیں۔ وزن حقیقی کا استعمال سب سے پہلے عربوں نے کیا ہے۔

محقق طوسی کو بطور حوالہ پیش کرتے ہوئے حالی نے یہ دعوی کیا کہ نفس شعر کے لیے وزن ضروری نہیں۔ جب کہ طوسی کی عبارت ہے 'قدما شعر کلام مخیل را گفتہ اندو اگرچہ موزون حقیقی نبودہ است' یعنی ارسطو کلام مخیل کو شعر کہتا ہے اگرچہ وہ موزون حقیقی نہ ہو۔ یہاں یہ بات مدنظر رہے کہ محقق طوسی 'موزون حقیقی' کا لفظ استعمال کرتا ہے اور موزون حقیقی عربوں کے نزدیک وزن مع قافیہ ہے یعنی ایسا وزن جس میں قافیہ کی پابندی ضروری ہو۔ اور وزن کے ساتھ قافیہ کی پابندی عرب ہی کرتے تھے۔ دوسری زبانوں میں وزن کی پابندی تھی، قافیہ کی نہیں۔ اسی لیے محقق طوسی عبری اور سُریانی کے لیے 'وزن حقیقی اعتبار نکردہ اند' کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان زبانوں میں وزن کے ساتھ قافیہ کا استعمال ضروری نہیں تھا۔ یونانی زبان کے لیے محقق طوسی لکھتے ہیں 'واشعار یونانیاں بعض چناں بودہ است'۔ یعنی یونانی زبان میں کبھی وزن کے ساتھ قافیہ کا استعمال ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ محقق طوسی نے مختلف زبانوں میں وزن کا کیا تصور ہے، اس پر گفتگو کی ہے۔ یہ دعوی نہیں کیا ہے کہ شعر کے لیے وزن غیر ضروری ہے۔

حالی نے 'وزن حقیقی' سے کیا مراد ہے، اس فرق کو ملحوظ رکھے بغیر طوسی کے حوالے سے لکھا ہے:

'عبری اور سُریانی اور قدیم فارسی میں شعر کے لیے وزن حقیقی ضرور نہ تھا۔ سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے۔'

حالی کا آخری جملہ محل نظر ہے کیونکہ طوسی نے موزون حقیقی کا لفظ استعمال کیا ہے اور موزون حقیقی کا مفہوم وزن مع قافیہ ہے۔ حالی نے اس فرق کو نظر انداز کر دیا اور دوسری زبانوں کی شاعری کو بھی زیور وزن سے عاری ہونے کی بات کہہ دی، جب کہ حقیقت یہ تھی کہ دوسری زبانوں میں وزن کے ساتھ قافیے کی پابندی ضروری نہ تھی۔

حالی نے اپنے دعوے کو مدلل اور جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لیے یوروپی محققین کا بھی حوالہ دیا ہے، لیکن نام درج نہیں کیا۔ حالی لکھتے ہیں:

'یورپ کا محقق لکھتا ہے کہ اگرچہ وزن پر شعر کا انحصار نہیں ہے اور ابتدا میں وہ مدتوں اس زیور سے معطل رہا ہے۔ مگر وزن سے بلاشبہ اس کا اثر زیادہ تیز اور اس کا منتر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے۔'

اس عبارت میں 'یورپ کا محقق' کی نشاندہی ممتاز حسین نے 'ورڈز ورتھ' سے کی ہے۔ ورڈز ورتھ کے ساتھ سر فلپ سڈنی اور شیلی کے حوالے بھی وزن کے غیر ضروری ہونے کے تعلق سے دیے جاتے ہیں، جن کا نظریۂ وزن ارسطو کے اسی متنازعہ فیہ جملے سے ماخوذ ہے، جس کی وضاحت اس سے پہلے کی جاچکی ہے۔

'عرب شعر کے کیا معنی سمجھتے تھے' کے عنوان کے تحت حالی عربوں کے برجستہ اور دل آویز فقروں، مؤثر اور دل کش تقریروں کو، جنھیں عرب شعر سے تعبیر کرتے تھے، وزنِ شعر کے لیے غیر ضروری ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حالی کا مفروضہ یہ ہے کہ شعر کے لیے وزن کی شرط اگر ضروری ہوتی تو ان جملوں اور فقروں کو عرب شعر سے تعبیر نہ کرتے۔ اس سلسلے میں پروفیسر احمد محفوظ اپنے ایک مضمون 'حالی اور غزل کی تنقید' میں لکھتے ہیں:

'یہاں اس بات کا ثبوت فراہم نہیں کیا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی قدیم شاعری میں جس طرح کے برجستہ اور دل آویز فقروں کی مثال لائی گئی ہے اور جنھیں عام بول چال کے مقابلے میں فوقیت رکھنے والے کہا گیا ہے، انھیں فی نفسہ شعر کی حیثیت حاصل تھی یا انھیں محض چند شاعرانہ خصوصیات کے حامل فقرے ہی سمجھا جاتا تھا کیونکہ شاعرانہ بیان کی صفات میں ندرت اور نرالا پن بھی شامل ہے۔ لہٰذا ممکن ہے قدیم عرب کے لوگ ایسے فقروں کی برجستگی اور ندرت کی بنا پر انھیں شاعرانہ انداز کے فقرے سمجھتے رہے ہوں اور ان کی نگاہ میں ایسے فقروں کی حیثیت فی نفسہٖ شعر کی نہ رہی ہو۔'

(حالی اور غزل کی تنقید، پروفیسر احمد محفوظ، مشمولہ الطاف حسین حالی، تحقیقی، تنقیدی جائزے، مرتب پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2002، ص 427)

پروفیسر احمد محفوظ کی بات بالکل درست ہے کیونکہ شعر کے لیے جدلیاتی انداز بیان جس میں الفاظ کے مجازی معنی کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے، ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ان ناموزوں فقروں کو شعر کہہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی موزوں لیکن غیر مخیلہ فقرے کو بھی شعر کہہ دیا جائے۔

حالی نے شعر میں وزن کو غیر ضروری قرار دینے کے لیے عربی فقروں اور جملوں کا سہارا لیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشہور علمائے بلاغت کا نظریۂ وزن بھی درج کر دیا جائے۔ 'قدامہ ابن جعفر' اپنی کتاب 'نقد الشعر' میں لکھتے ہیں:

'شعر اس موزوں اور مقفّٰی قول کا نام ہے جس سے کسی معنی پر دلالت ہو سکے۔'

(نقد الشعر، قدامہ ابن جعفر، ترجمہ محمد جعفر احراری، بحوالہ کلاسیکی تصور شعر، آفتاب عالم عارفی، براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2018 ص 67)

ابن خلدون تصور شعر سے بحث کرتے ہوئے اپنے مقدمے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

'ایک ایسا کلام موزوں و مقفّٰی ہے جو معنی رکھے اور اس کے تمام اوزان ایک حرف روی پر مشتمل ہوں۔' (ایضاً، ص 67)

ابن رشیق شعر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'شعر ذہنی نشاط اور اہتزاز نفس کا ذریعہ ہے، جو دلوں کو گرماتا ہے اور روح کو تڑپاتا ہے، یہی شعر کا مقصد ہے اور اسی غرض سے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔' (ایضاً ص 68)

طہٰ حسین اپنی کتاب 'ادب الجاہلی' میں عربوں کے یہاں وزن کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'تمام عرب ہر زمانے میں اس امر پر متفق الرائے رہے ہیں کہ شعر کے لیے موزوں ہونا ضروری ہے خواہ وہ کوئی سا وزن ہو جس کا شاعر قصد کرے۔ کوئی عربی النسل آدمی شعر کا کوئی اور تصور ہی نہیں کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے الفاظ اس عروضی مقیاس کے پابند ہوں یا یہ کہو کہ اس موسیقی (ترنم) والے معیار کے پابند ہوں جو قصیدے کے اشعار کے درمیان ایک قسم کی موزونیت پیدا کر دیتا ہے۔'

(ادب الجاہلی، مترجم، محمد رضا انصاری، بحوالہ کلاسیکی تصور شعر، ص 68)

طہٰ حسین نے حالی کے ایک عرصے بعد تمام عرب کے حوالے سے تصور وزن کے بارے میں جو بات کہی ہے، وہ اپنا محل رکھتی ہے۔

حالی وزن کو شعر کی ماہیت اور اس کے اصلی عنصر ہونے سے خارج کرتے ہیں، لیکن وہ بالطبع شاعر ہونے کے باوجود بطور نمونہ کوئی ایک شعر بھی ایسا پیش نہیں کرتے جو وزن سے عاری ہو، بلکہ وہ وزن کی اہمیت اور شعر میں وزن کے ذریعے جذبات کی ادائیگی اور تاثیر کے دوبالا ہونے کی بات کرتے ہیں۔

■

Mohd Shahnawaz khan
Research Scholar, Dept. of Urdu, JMI
B/3rd Floor, B20 Okhla Vihar
New Delhi-110025
Mob:9536673993
E.mail: shahnawazrazi73@gmail.com

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

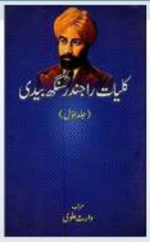

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلداوّل)

مرتب: وارث علوی

صفحات: 970، قیمت: 425روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو فکشن کی تاریخ اور ترقی پسند افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی کا مقام و مرتبہ بہت اہم ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں میں اپنے ایک مختصر ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' سے جہاں اپنی انفرادی شناخت قائم کی وہیں کئی افسانوی مجموعوں کے ذریعے صنف افسانہ میں اپنی شناخت کو مزید مستحکم کیا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ فنی اور فکری دونوں اعتبار سے بہت اہم ہے۔ بیدی کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف پریم چند کی حقیقت نگاری اور سماجی مقصدیت کو نئی جہت عطا کی بلکہ حقیقت نگاری کو نئی بصیرتوں سے روشناس بھی کرایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ کہانی کی بنت، کرداروں کی پیش کش، زبان و بیان کے برمحل استعمال، کفایت لفظی، جزئیات نگاری اور وحدت تاثر کی پیش کش میں اپنا الگ مقام بنایا۔ بیدی کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کا افسانہ آغاز اور انجام میں قید ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اس بات سے بعض نقاد متفق نہیں ہیں بلکہ کچھ افسانوں کو بطور مثال پیش کرکے اس کی تردید بھی کی ہے۔

بیدی کے افسانوں کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تہذیب وثقافت کی پیش کش ہے۔ ان کے افسانوں میں تہذیبی وثقافتی رنگ کرداروں کی سماجی زندگی کا اٹوٹ حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک اور اہم خصوصیت اساطیری ودیومالائی بیانیہ بھی ہے۔ ان کا اساطیری بیانیہ ہمیں کئی سطح پر نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے وارث علوی نے بالکل درست لکھا ہے کہ 'مذہبی اساطیر اور روایات، تہوار اور رسوم، شادی بیاہ کی تقریبات، آنگن کے گیت اور رت جگے، چاند گرہن کے اساطیر، اور گرہن کے دوران زچگی سے متعلق توہمات، دن کو کہانی کہنے اور جوتے پر جوتا چڑھ جانے سے مسافروں کے راستہ بھول جانے اور سفر درپیش ہونے کے وہ توہمات جو ضرب الامثال بن چکے ہیں۔ یہ سب قصے کہانیاں اور تمثیلیں، علامات اور استعاروں کی شکل میں افسانوں کو ایسی تہذیبی ثروت مندی عطا کرتی ہیں کہ بیدی کے افسانوں کو پڑھنا ایک رسم میں شریک ہونے کا سحر انگیز تجربہ بن جاتا ہے۔' بیدی کی یہی سحر انگیزی قاری کو غور وفکر کرنے اور اپنے سماج ومعاشرے کا محاسبہ کرنے کا اہل بناتا ہے۔ چونکہ بیدی کا تعلق عام زندگی اور عام انسانوں سے رہا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں عام زندگی کا جہاں حسن نظر آتا ہے وہیں دوسری طرف عام زندگی کا جشن اور ماتم بھی نظر آتا ہے۔ زیرنظر کلیات میں موجود تمام افسانوں کو پڑھتے ہوئے مذکورہ تمام باتوں کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

اس کلیات کی پہلی جلد بیدی کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ وارث علوی نے بیدی کے تمام افسانوی مجموعوں کا متن اس کے پہلے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر ترتیب دیا ہے۔ اس کلیات میں مرتب نے چھ مطبوعہ افسانوی مجموعوں میں جو افسانے شامل ہیں ان کو پیش کرنے کے ساتھ ان گیارہ افسانوں کو بھی شامل کیا ہے جو کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ مطبوعہ افسانوی مجموعے اور ان میں شامل افسانے سن اشاعت کے اعتبار سے اس طرح ہیں:

پہلا افسانوی مجموعہ 'دانہ ودام' (1943) ہے۔ اس میں جو افسانے شامل ہیں ان میں بھولا، ہم دوش، من کی من میں، گرم کوٹ، چھوکری کی لوٹ، پان شاپ، منگل اشٹکا، کوارنٹین، تلادان، دس منٹ بارش میں، حیاتین ب، پھمن، ردعمل اور موت کا راز ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'گرہن' (1942) ہے۔ اس میں شامل افسانے گرہن، رحمان کے جوتے، بکی، اغوا، غلامی، ہڈیاں اور پھول، زین العابدین، لاروے، گھر میں بازار میں، دوسرا کنارہ، آلو، معاون اور میں، چیچک کے داغ، ایوالانش ہیں۔ تیسرا افسانوی مجموعہ 'کوکھ جلی' (1949) ہے۔ اس میں لمس، کوکھ جلی، نامراد، جب میں چھوٹا تھا، مہاجرین، کشمکش، ایک عورت، ٹرمینس، گالی، خط مستقیم اور قوسین، ماسوا اور آگ ہیں۔ چوتھا افسانوی مجموعہ 'اپنے دکھ مجھے دے دو' (1965) ہے۔ اس میں لاجونتی، جوگیا، ببل، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ٹرمینس سے پرے، حجام الٰہ آباد کے، دیوالہ، یوکلپٹس شامل ہیں۔ پانچواں افسانوی مجموعہ 'ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'

(1974) ہے۔اس میں جن افسانوں کوشامل کیا ہے ان میں صرف ایک سگریٹ، کلیانی، متھن، باری کا بخار، سونفیا، وہ بڈھا، جنازہ کہاں ہے اور تعطل اہم ہیں۔ چھٹا افسانوی مجموعہ 'مکتی بودھ' (1982) ہے۔اس میں شامل افسانے مکتی بودھ، ایک باپ بکاؤ ہے، چشم بد دور، بولو اور بلی کا بچہ ہیں۔اس کے علاوہ وہ افسانے جو مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں ہیں ان میں مہارانی کا تحفہ، خودغرض، جہلم اور تارو، ناگفتہ، مثبت اور منفی، نورا، پہاڑی کوا، سارگام کے بھوکے، چھ ادب پارے، تک شک، شکار اور فرشتے قابل ذکر ہیں۔اس طرح کل 74 افسانے اس کلیات میں شامل ہیں جنھیں پڑھ کر بیدی کی تخلیقات کی تفہیم کی جاسکتی ہے۔ مذکورہ افسانوں کے علاوہ ابتدا میں عرض مرتب کے بعد دو مضامین شامل ہیں جن میں پہلا تعارف (راجندر سنگھ بیدی: زندگی اور شخصیت) اور دوسرا راجندر سنگھ بیدی کے افسانے (ایک تعارف) ہے۔مجموعی طور کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلیات ادب کے سنجیدہ قارئین کے کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ بیدی کے تمام افسانوں کواس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ کلیات طباعت اور قیمت کے اعتبار سے تو بہتر ہے ہی، اس میں پروف کی غلطیاں بھی نہ کے برابر ہیں۔سرورق دیدہ زیب ہے۔امید قوی ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

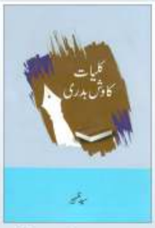

کلیات کاوش بدری

مرتب: سید ظہیر
صفحات: 224، قیمت: 145 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی
مبصر: عزہ معین، ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی، دہلی

کاوش بدری کا شمار اردو کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک پختہ اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ماہرین اردو ادب نے ان کی مشاقی کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ سہل زبان مربوط اور واضح اسلوب نے ان کی شاعری کو منفرد رنگ عطا کیا ہے۔ زندگی کے روزمرہ واقعات اور ذاتی حالات کا بیان ان کی شاعری میں خوب ملتا ہے۔ کاوش بدری کا اصل نام وی پی رزاق پاشا ہے۔ کاوش بدری آمبور تمل ناڈو میں پیدا ہوئے۔ تمل ان کی مادری زبان ہے۔ باوجود اس کے اردو زبان میں ان کی مہارت ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو زبان میں طبع آزمائی کی بلکہ اردو شاعری میں ملکہ حاصل کیا۔ تمل زبان کا پروردہ زبان اردو کا بہترین شاعر اور الفاظ کے ذخیرہ سے مالا مال ہے۔ان کی تقریبا چھ کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں جن میں کاویم (مونولوگ) 1977، مثنوی قبلہ نما 1965، شردھانجلی 1964 (پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد میں)، قطب مدراس 1983، کن فیکون 2004، قدیم تمل ناڈو میں عربی اور فارسی ادبیات کی چار سو سالہ تاریخ 2004 جلد اول عربی شامل ہیں۔

پیش نظر کتاب 'کلیات کاوش بدری' شاعری کی منفرد کتاب ہے۔ جسے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو سے شائع کیا گیا ہے۔اس کتاب کو تین عناوین کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ مرتب ظہیر سید نے ایک مبسوط مقدمے میں اپنے تجربات کی بنیاد پر واقعات کو سپرد قلم کیا ہے۔ مقدمہ کاوش بدری کی شخصیت وفن کو سمجھنے میں بہت مددگار ہے۔

اس کتاب کا پہلا حصہ ایک مونولوگ ہے یہ طویل نظم ہے۔ تقریبا 80 صفحات پر مشتمل یہ نظم اپنی انفرادیت کی وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ابتدائی چند بند قاری کو سمجھ میں نہیں آتے لیکن جیسے جیسے اس کو پڑھتے جاتے ہیں یہ اپنی پہچان کروا دیتی ہے۔اس نظم میں واضح اور غیر واضح انداز میں واقعات کا تسلسل کہانی بن جاتا ہے۔ بچپن اور جوانی پھر بڑھاپے، (اس کے بعد جنت دوزخ کو بھی اس میں پرو دیا گیا ہے) کے خمیر سے تیار یہ نظم عمر کی ہر منزل اور بعد مرگ ذہن کے اندر پنپنے والے خیالات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ عشق رسول کی مثالیں، معراج، نبیوں کے قصے بھی اس نظم کے خوبصورت حصے ہیں۔ شاعر اپنے تمام آلام اور گہرائیوں کو بیان کرتے ہوئے اپنے قاری سے مخاطب ہوتا ہے تو بول پڑتا ہے۔

میرے احساس کی نبضوں کو ٹٹولے کوئی　　　کتنے ادوار کے آلام کی تخلیق ہوں میں
کتنے افکار و روایات کا سنجوگ ہوں میں　　　کتنے رہوار تفکر کی اڑائی ہوئی گرد

اس شاعری کو زندگی سے جڑے ہونے اور زندگی سے پرے ہونے کا ملا جلا تاثر کہیے یا مجموعی اعتبار سے شعری لغت کا اضافہ کہیے دونوں پہلو قاری کے سامنے آتے ہیں۔ اشعار کے ساتھ شاعر کے اندر کا غم اور افسردگی اس طرح اٹھتا ہے کہ قاری خود کو گویا یہ بھی میرے دل میں ہے، کے مصداق انھیں آلام میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعری کے ساتھ تخیل کی رفتار خود ہی مائل بہ پرواز ہو جاتی ہے۔ پھر شاعر اپنے تمام عارضوں پر قابو پا لیتا ہے اور کہتا ہے۔

میں ذمہ دار ہوں احساس زندگی ہے بہت　　　مجھے عوام کی آنکھوں میں جگمگانا ہے

دوسری طویل آزاد نظم ہے کن فیکون 'حامد تو ہم توئی یا ربنا' اس نظم میں قلم رب کی ثنا اس انداز میں کر رہا ہے کہ خدائے برتر کی صفات اور بڑائی قرآن کریم کی رو سے بیان کرتا ہے اور یہاں 'تو' کی جگہ 'میں' کا واحد متکلم صیغہ اس رب کائنات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس پروقار نظم میں بندگی اور عبودیت کی شمعیں روشن ہیں۔ اس نظم میں الفاظ کا ایک بحر بے کراں قاری کو نظم کی دیگر خوبیوں کے ساتھ بھلا لگتا ہے۔ یہ نظم ذات باری کے آگے سر جھکا کر عاجزی کی مثال قائم کرتی ہے۔ اس نظم میں صفات باری پر عمیق بحث کی گئی ہے۔ پرت در پرت رموز سے آگاہی کی طرف اشارے کرتی یہ نظم قاری کو مبہوت کر دیتی ہے۔

عرش بھی ایک مرتبے کا نام فرش بھی ایک مرتبے کا نام
ایک حالت میں نور میرا لطیف ایک حالت میں نور میرا کثیف
یہ کثافت بھی ایک اضافی ہے فرق آتا نہیں کثافت میں
سب صفات مقدسہ ہیں میرے سب کمال منورہ ہیں میرے

غزل و نعت پر بھی شاعر کو دسترس حاصل ہے۔ غزل کے انداز میں مشہور قلم کاروں کی نذر کی گئی غزلیں اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ نذر شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس اور جاں نثار اختر جیسے اعلی پایے کے شعرا کے ساتھ اس کتاب میں 'غزل ممتاز جان ادا کی گائیکی کے لیے' جیسے عنوان بھی قاری کو متجسس کرتے ہیں۔ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے انھوں نے شاعری میں نئی نئی جہتیں اپنائی ہیں۔

یہ کتاب اردو کے طالب علموں کے لیے تو مفید ہے ہی ساتھ ہی الفاظ کے ذخیرے کی وجہ سے کسی بھی عمر کے قاری کو اس کے مطالعے سے فائدہ ہوگا۔

کاوش بدری کی شاعری میں ان کی زبان اور ان کا منفرد انداز بیان ان کے تخیل کی بلند پروازی قاری کو احساس و تاثر کے ایک مختلف تجربے سے ہمکنار کرتی ہے۔

کاوش بدروی کا سادہ اسلوب، ان کی زبان کی سادہ روی، شاعری میں مشکل موضوعات کو آسان بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ بڑی سے بڑی اور متاثر کن صورت حال کو خوبصورت انداز میں قاری کے سپرد کیا گیا ہے۔

طویل نظموں اور متفرق غزلوں کے بعد 'نذر غالب' پر یہ مجموعہ تمام ہو جاتا ہے۔ شائقین اردو ادب کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے کیونکہ اس مجموعے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں نئے اور رواں دواں الفاظ کا ذخیرہ ملتا ہے جو قاری کو خوب فیض یاب ہونے کا موقع دیتا ہے۔

تحقیق و تنقید

سریمد بھگوت گیتا

مولف: منشی پنالال بھارگو
مرتب و ناشر: ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
صفحات: 182، قیمت: 350 روپے،
مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی، E-167، فورتھ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

سریمد بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ منشی پنالال بھارگو نے کیا تھا۔ نامور محقق اور معلم ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے اس کو زیور طبع سے آراستہ کر کے اردو والوں کے لیے پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی صحیفوں کے ترجمے کی تاریخ ہزاروں برس پرانی ہے۔ ویدوں کے پالی زبان میں کیے گئے ترجمے، چینی سیاحوں کے ذریعے چین، جاپان، روس اور منگولیا تک جا پہنچے۔ رامائن اور مہابھارت ہندوستانی تہذیب کے وہ عمدہ صحیفے ہیں جن کے سب سے زیادہ ترجمے اردو میں ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی گیتا کے اس منظوم نسخے تک رسائی قابل ستائش ہے۔ اس سے پہلے بھی منظوم اور منثور چھ نسخوں کو انہوں نے دریافت کیا ہے۔ یہ سبھی راجستھان کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ بھگوت گیتا کا ایک منظوم ترجمہ لچھمی نرائن آذر ٹونکی نے 1893 میں کیا جو مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ دوسرا منظوم ترجمہ 'جلوۂ عالم نما' ہے جس کو کیول کشن فرح نے 1911 میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور ہیرالال پریس جے پور سے شائع ہوا۔ تیسرا ترجمہ 'گنجینہ معرفت' مترجم شنکر دیال نگار نظامی پریس کانپور سے 1915 میں شائع ہوا۔ چوتھا زیر تبصرہ منظوم ترجمہ سریمد بھگوت گیتا منشی پنالال بھارگو کا ہے جو کہ دہلی پرنٹنگ پریس دہلی سے 1917 میں شائع ہوا۔ منظوم ترجمے کے علاوہ گیتا کے اردو میں منثور ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ سریمد بھگوت گیتا کا منثور ترجمہ حکیم جگن ناتھ پرشاد ٹونکی نے مخطوطہ کی شکل میں 1951 میں کیا ہے، اس سے پہلے گوپی ناتھ غمگین نے 1943 میں کیا جو کہ غیر مطبوعہ ہے اور نایاب بھی ہے، جبکہ تیسرا منثور ترجمہ بوندی راجستھان کے گنگا سہائے نے کیا ہے۔ لیکن ان سب تراجم میں منشی پنالال بھارگو کا منظوم ترجمہ سریمد بھگوت گیتا اپنی الگ شناخت اور پہچان رکھتا ہے۔ منشی جی کی ادبی کاوشوں میں بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں شری کرشن جی کے وہ جوابات اور ارشادات شامل ہیں جو انھوں نے ارجن کو دیے تھے۔ اس منظوم ترجمے میں ان تمام سوالات و جوابات کو بہت ہی اختصار اور جامعیت کے ساتھ اشعار کا جامہ پہنا کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مترجم نے صاف ستھری زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ہندی الفاظ اور ہندی کی اصطلاحات کا جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی ابتدا تمہید سے ہوئی ہے جو کتاب کے صفحہ نمبر 69 پر کچھ اس طرح رقم ہے:

''ہری اوم تت ست۔ اٹھو خواب غفلت سے آنکھوں کو کھولو۔ سری کرشن پیارے کی جے منہ سے بولو۔ دلوں میں ٹھنی باہمی جدّ ہ کی جب۔ فراہم کروکشیتر میں ہو گئے سب۔ معاون مددگار یار اور یاور۔ ہوئے جمع آ آ کے لے لے کے لشکر۔ نہ آئے دھرت راشٹ مجبور تھے وہ۔ اسی واسطے ہستنا پور تھے وہ۔ سری بیاس جی ان سے ملنے کو آئے۔ لڑائی سے پہلے وہ تشریف لائے۔ کہا ماجرا اپنا راجا نے سارا۔ کیا مدعا تھا جو کچھ آشکارا۔ لڑائی ٹھنی بھائیوں بھائیوں میں۔ ہیں مصروف سارے صف آرائیوں میں۔ مرا جی بھی یہ چاہتا ہے کہ دیکھوں۔ مگر کیا کروں دیکھ سکتا نہیں ہوں۔''

اس کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ گیتا کے فلسفے کو مترجم نے بہت ہی بہترین انداز میں اردو کے مزاج میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اس منظوم ترجمہ میں کرشن جی اور ارجن کی زندگی کے اسرار و رموز کو عام فہم، آسان اور بامحاورہ زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ترجمہ میں جگہ جگہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ و اصطلاحات ہونے کی وجہ سے ترجمہ عام فہم ہونے کی بجائے مشکل ہو گیا ہے۔

گیتا کا پہلا ادھیائے یعنی پہلا باب جو کہ 'ارجن بکھاد یوگ' کے نام سے ہے، 47 منتر پر مشتمل ہے۔ اس باب میں ہندی اور اردو الفاظ کا استعمال بہت ہی خوبصورتی سے کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے صاف ستھری زبان میں منظوم ترجمہ کے دوران ہندی الفاظ اور ہندی کی اصطلاحات کا استعمال کر کے ترجمہ نگاری کے فن کو خوبی سے برتا ہے، کیونکہ ترجمہ نگاری کسی ایک زبان کو دوسری زبان میں خوبصورتی اور ہنرمندی سے منتقل کرنے کا نام ہے، لیکن اس میں ترجمہ نگار کو اس بات کا پورا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ معنی و مطالب برقرار رہے۔

پہلا ادھیائے کچھ اس طرح سے ہے:

''ہماری بھی سینا نہیں ان سے کچھ کم۔ تمہارے سبب سے بھی ہیں مطمئن ہم۔ کرن اور بکرن ہیں یاور ہمارے۔ ہیں جانباز پورے دلاور ہمارے۔ بہت سورما اور بھی صف بہ صف ہیں۔ ہمارے لیے سب کے سب جاں بکف ہیں۔''

کتاب میں شامل دوسرے ادھیائے (باب) بعنوان 'سانکھ یوگ نام' میں 72 منتر ہیں، تیسرے ادھیائے 'کرم یوگ نام' میں 43، چوتھے 'کرم سنیاس یوگ نام' میں 42، پانچویں 'سنیاس یوگ نام' میں 29، چھٹے ادھیائے 'آتم سنجم یوگ نام' میں 47 منتر، ساتویں ادھیائے بعنوان 'گیان وگیان یوگ نام' میں 30 منتر جبکہ سب سے اخیر ادھیائے 'سنیاس یوگ نام' میں 78 منتر شامل ہیں۔ ترجمہ نگاری کوئی آسان کام نہیں ہے یہ ایک مشکل فن ہے۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ ہو رہا ہے، دونوں ہی زبانوں میں مترجم کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم منشی پنالال بھارگو اور خود مرتب ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی دونوں ہی اس شرط پر کھرے اترتے ہیں۔ بھگوت گیتا کا یہ صحیفہ فیض عام ہے، یہ تمام عالم کے لیے ہے۔ آج تک گیتا کے تقریباً دو سو (200) تراجم کا پتہ چل پایا ہے، جن میں سے 175 مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ ان میں مزید اضافے کے امکانات ہیں۔

یہ کتاب منظوم ترجمہ نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ اور گیتا شناسی میں کارآمد ثابت ہوگی۔

فکشن

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے نمائندہ افسانے

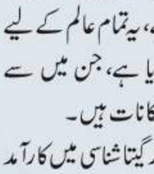

مرتب: عمران عاکف خان
صفحات: 232، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: صہیب عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کا شمار جدید عہد کے مشہور و معروف فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں کہانیوں کا مجموعہ، ناول اور خودنوشت منظر عام پر

آچکی ہیں، جیسے نازش جنوں (ناولٹ)، دھوپ کے سات رنگ، ٹوٹا ہوا آدمی، مانو یا نہ مانو، حقیقت سے فسانے تک، آٹھ راتیں، سات کہانیاں اور پھر کیا ہوا، شجر سایہ دار اور یاد رفتگاں اور فرہنگ کلیات نظیر اکبرآبادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کی کہانیوں کا زیرنظر مجموعہ جسے عمران عاکف خان نے مرتب کیا ہے، 28 کہانیوں پر مشتمل ہے، وہ یہ ہیں: چوتھی کا ایک اور جوڑا، خود آ گہی، زہریلی دھوپ، اب کے برس، کرایے کی کوکھ، بھرم، اف یہ آسمان، دستک، امربیل، آخر کب تک، ٹوٹا ہوا آدمی، شناسا، بابل کا آنگن، شیشہ و تیشہ، داغدار اجالا، تحلیل، خوبصورت، کفارہ، احساس کا مجرم، چاند کا داغ، آتنک وادی، بدلہ، وہ، کاک راج، انوکھا مقدمہ، انکھوں کی مہکتی خوشبو، کینچوے، ایک وفا ایسی بھی۔

والدین اور اولاد کے درمیان کشمکش، اولاد کی اپنے والدین سے بے اعتنائی اور غفلت اور اپنی دنیا میں مصروف رہنے جیسے مسائل کا بیان نعیمہ پاشا نے اپنی کہانی 'خود آ گہی' میں کیا ہے، اس کہانی میں والدین اور اولاد کے رشتوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مدیحہ نے سمجھایا: ''نہیں بیٹا کبوتر کے بچے جب اڑنا سیکھ جاتے ہیں تو اپنا ٹھکانہ کہیں اور بنا لیتے ہیں''۔

''جیسے ممی ڈیڈی نے اپنا گھر الگ بنالیا۔''

ریحان نے معصومیت سے پوچھا ''تو کیا وہ اپنے ممی پاپا سے ملنے کبھی نہیں آتے۔''

مدیحہ کے گلے میں کانٹے سے اگ آئے۔

''کم آن ممی! یادیں انسان کے دل میں بستی ہیں۔ کسی مکان میں نہیں بستیں۔ ان فضول مفروضوں کو رہنے دیجیے۔ Be Realistic ہمارے بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ گڑگاؤں کا فلیٹ ہمارے لیے چھوٹا پڑتا ہے اور پھر کب تک ہم کرایے کے مکان میں رہتے رہیں گے۔ دوسری طرف آپ تین سوگز کے مکان میں اکیلی رہ رہی ہیں۔ اسے بیچ کر میں آپ کے لیے دو کمروں کا ایک فلیٹ خرید دوں گا اور ہم لوگ گڑگاؤں میں بلڈرس فلور خرید لیں گے۔''

مدیحہ یہ گھر تمھارے نام ہے۔ یہ تمہاری سوشل سیکوریٹی ہے۔ اپنے جیتے جی اسے کسی کے نام مت کرنا۔''

نعیمہ پاشا نے والدین کے اپنی اولاد سے لگاؤ اور ان کی تمناؤں کا ذکر بھی اپنی کہانی 'شیشہ و تیشہ'' میں بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

''عزیزی گلریز سلمہ

خدا تمہاری عمر دراز کرے اور کامیابی دے۔ بیٹا آج محسوس ہو رہا ہے کہ جوانی میں دیکھے گئے خوابوں کی قیمت بڑھاپے میں کتنی مہنگی چکانی پڑتی ہے۔ ہم نے بھی تمہاری پیدائش پر تمہیں ڈپٹی کلکٹر بنانے کا جو خواب دیکھا تھا آج اس نے جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ خدا کرے ہمارے خواب کی تعبیر تم پوری کرو۔ مجھے تو اب دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رہی، چرونجی لال نے کھیتوں پر قبضہ کرلیا۔ دوسرا ساہوکار بیل کھول کر لے گیا۔ تمہاری ماں کی حالت الگ تشویشناک ہے۔ حکیم جی نے دوا بدل کر دی ہے۔''

سماج میں بڑھتی ہوئی ایک وبا کرایے کی کوکھ ہے جسے انگریزی میں Surrogacy کہا جاتا ہے۔ اس مسئلے کو نعیمہ پاشا نے اپنی ایک کہانی کرایے کی کوکھ میں بیان کیا ہے، اور مائیں جس جذباتی کرب سے گذرتی ہیں اس کو کیا ہی خوب انداز میں بیان کیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے، جب اس نے ایک صحت مند بیٹی کو جنم دیا تھا، لیکن اسپتال سے خالی گود لے کر گھر آئی تھی۔ تب سے اب تک وہ اپنی بچی کے لیے ہمک رہی تھی۔ شروع میں تو یہ سب اور بھی مشکل تھا۔ چھاتیوں سے دودھ کی دھار بہتی اور وہ اپنی تڑپتی بلکتی ممتا کو لیے رات رات بھر جاگتی رہتی، جی چاہتا دوڑ کر جائے اور کہیں سے اپنی بچی کو لے کر آئے، اپنے سینے سے لگالے، اپنے دودھ سے اسے سیراب کردے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔''

کہانیوں کا یہ مجموعہ قابل مطالعہ ہے، مولفہ نے بڑی جرأت کے ساتھ سماجی تصادم اور کشمکشوں کو دل گداز اسلوب میں بیان کیا ہے۔ زبان نہایت ہی شستہ اور عام فہم ہے۔

گلنار (افسانوں کا مجموعہ)

مصنف: فیروز جلالپوری

صفحات: 140 قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مطبع: العباس پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: رقیہ فاطمہ، اردو اسکالر، اودھ یونیورسٹی ایودھیا

افسانہ جدید نثری ادب کی ایک خاص صنف ہے جن کے ذریعے ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانے کے مشاہدات و تجربات سمیٹ کر انسان کی معاشی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تاریکی و روشنی کی عکاسی و ترجمانی کی جاتی ہے۔

زیرتبصرہ کتاب 'گلنار' صوبہ اترپردیش ضلع امبیڈکر نگر کے مردم خیز صنعتی قصبہ جلال پور سے تعلق رکھنے والے فیروز جلالپوری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ فیروز جلالپوری نئی نسل کے مشہور افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ انھیں افسانہ نگاری اور شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ان کے قلم میں روانی ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی کا عنصر غالب ہے۔ عصری حسیت اور کہانی پن ان افسانوں کی دلکشی میں اضافہ کا سبب ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں 11 صفحات پر مشتمل 'پیش لفظ' بہ قلم خود تحریر ہے۔ جس میں فیروز جلالپوری نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز 1983 بتایا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس مجموعے میں کل 34 افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں 24 افسانے 1983 سے 1995 کے درمیان تحریر کیے گئے ہیں۔ باقی کے 10 افسانے 2015 سے 2021 کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان تنظیموں کے واٹس ایپ پر بھی فیروز جلالپوری کی نگارشات جلوہ افروز ہوتی رہتی ہیں۔

فیروز جلالپوری کے رموز فن کے تعلق سے اس مجموعے میں چار بڑی شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر محبوب عالم (سابق ایسوسی ایٹ، پروفیسر اردو، ترلوک ناتھ، پی، جی، کالج ٹانڈہ امبیڈکر نگر) کا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر ذیشان حیدر جلال پوری کا ہے۔ تیسرا مضمون محمد شہزاد، انچارج اردو سروس ہندوستھان سماچار کا 'فیروز جلالپوری کی غماز صلاحیتوں کے نام' ہے۔ چوتھا مضمون ساجد جلال پوری کا 'فیروز جلالپوری کی افسانہ نگاری' ہے۔

زیرنظر کتاب میں پہلا افسانہ 'گلنار' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس افسانے میں فیروز جلال پوری نے ایک ایسی عورت کا کردار پیش کیا ہے جو اپنے تعلیم یافتہ شوہر سے محض اس لیے طلاق لے لیتی ہے کہ وہ بے روزگاری اور بے کاری سے دوچار رہتا ہے۔ برسوں کے بعد جب اس عورت کی ملاقات اپنے پہلے شوہر سے ہوتی ہے تو وہ حیرت میں پڑ جاتی ہے، کیونکہ پہلا شوہر اس وقت ایک بہت بڑے سرکاری محکمے میں سروس کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ عالیشان مکان اور گاڑیاں ہیں۔ جبکہ وہ عورت بیحد غریب اور بے اولاد ہوتی ہے۔ دوسرے افسانہ 'دھند سے پرے' میں یہ کہانی ہے کہ جب ایک غریب انسان ایک امیر لڑکی سے شادی کی بات کرتا ہے تو وہ غریب آدمی کو اس

کی غربت کا طعنہ دے کر اسے ذلیل کر دیتی ہے۔ کہانی کے آخر میں جب اس غریب آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ لڑکی بازارحسن میں بیچ دی گئی ہے تو وہ اس لڑکی کو بچانے کے لیے اپنی پوری طاقت، روپے پیسے، سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔

فیروز جلالپوری کے پاس حساس دل، وسیع تجربہ اور الفاظ پر قدرت رکھنے والا قلم ہے۔ وہ اپنے عہد کے ظلم واستحصال کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ بات کا زہر، حادثہ کیسے ہوا؟، شراب، کہانی ایک رات کی اور 'سوال' انہی موضوعات پر بڑے سلیقے سے لکھے گئے افسانے ہیں۔

اردو افسانے کے آغاز سے ہی اس میں دو متوازی دھارے موجود تھے۔ ایک رومان پسند، دوسرا حقیقت پسند۔ فیروز جلالپوری کے یہاں حقیقت پسندی کا رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔ انہوں نے افسانے میں کہانی پن کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ عصری مسائل میں فساد بھی ایک اہم موضوع ہے۔ ہم پنچھی اک ڈال کے، محافظ، گناہ، لٹیرے، برادری اور 'گناہ کے بعد' ہندو مسلم فساد کے پس منظر میں لکھے گئے اچھے افسانے ہیں۔

دہشت گردی اور خونی منظر کی عکاسی کرتے ہوئے ان کے افسانے 'پس پردہ'، وہ منظر، بہترین پیرایے میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ جہیز کے موضوع پر لکھے ان کے افسانے دوسرا رخ، جہیز کی خاطر اور آگ اور پانی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

'کرب' ایک تمثیلی افسانہ ہے جو آج کے بگڑے ہوئے حالات کی غمازی کرتا ہے۔

فیروز جلالپوری کا یہ مجموعہ مختلف رنگ کے پھولوں سے سجا ہوا ایک گلدستہ ہے جو صوری اور معنوی اعتبار سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ امید ہے اردو سے محبت رکھنے والے افراد کو یہ تحفہ پسند آئے گا۔

شاعری

بنت فنون کا رشتہ مع تبصرہ و تجزیہ

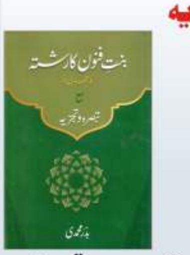

مصنف: بدر محمدی

صفحات: 276، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: اصغر شمیم، بہ معرفت: فیروز عابد

12/3/H/1، پٹوار بگان لین، کولکاتا- 700009

'بنت فنون کا رشتہ' بدر محمدی کا تازہ شعری مجموعہ ہے جسے انھوں نے مع تجزیہ وتبصرہ شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ مجموعہ کلام 2011 میں شائع ہو چکا ہے۔ گیارہ سال کے وقفے کے بعد اس مجموعے پر لکھے گئے مضامین کی روشنی میں اپنی غزلوں پر نظر ثانی کے بعد انہوں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ گیارہ سال کے وقفے میں میرے مجموعہ کلام پر دو درجن سے زیادہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی روشنی میں اپنی غزلوں پر نظر ثانی کی ہے۔ نتیجتاً 'بنت فنون کا رشتہ' کے بعض مصرعوں میں ترمیم کی گئی ہے اور بعض غزلوں کو خارجِ مجموعہ کر کے ان کی جگہ دوسری غزلیں زینتِ کتاب بنائی گئی ہیں۔ میں یہ گمان ہرگز نہیں کرتا کہ میرا یہ مجموعہ اب خامیوں سے پاک ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں بلکہ میں ایک بار پھر قارئین کو دعوتِ تنقید دیتا ہوں اس عزم کے ساتھ کہ ان کی تنقیدات کو قبول کروں گا۔

بہار سے تعلق رکھنے والے شعرا میں بدر محمدی کو ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے.. بدر محمدی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ حال ہی میں 'ہم عصر شعری جہات' کے نام سے تنقیدی مضامین کا اُن کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ بدر محمدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور شعر کہنے کے فن سے بخوبی واقف بھی ہیں۔ حرف اول میں وہ اپنی شاعری کے حوالے سے خود رقم طراز ہیں کہ:

''میری شاعری آج کی پر پیچ زندگی کی شاعری ہے مگر یہ شاعری ابہام کی شاعری نہیں اور نہ یہ سہل ممتنع کی شاعری ہے۔ کیونکہ سہل ممتنع کی شاعری میں بھی بڑی فنکاری درکار ہے۔ جبکہ میرے پاس فنکاری اور ہنرمندی کے بلند بانگ دعوے جیسا کچھ نہیں۔''

بدر محمدی کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہم عصر شعرا کی بھیڑ میں اپنی پہچان آسانی سے بنا لیتے ہیں۔ بدر محمدی ایک فطری شاعر ہیں اور ان کے سوچنے کا انداز بالکل مختلف ہے۔ اس کتاب میں 'بنت فنون کا رشتہ' اور ان کی شاعری کے حوالے سے 27 مضامین شامل ہیں جو ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ جن میں 'بنت فنون کا رشتہ سے میری نگاہ کا رشتہ' (سید شکیل دسنوی)، 'بدر محمدی کی شاعری: طواف زمین و زماں کا سماں' (ظفر عدیم)، 'بنت فنون کا رشتہ: سرسری مطالعہ' (وقار قادری)، 'بنت فنون کا رشتہ پر ایک اچٹتی نگاہ' (ڈاکٹر خالدہ خاتون)، 'بدر محمدی کی شعری کائنات' (سعید رحمانی)، 'بدر محمدی کی شاعری' (نذیر احمد یوسفی)، 'بدر محمدی کا رنگ تغزل' (ڈاکٹر معراج الحق برق)، 'حرف اعجاز' (منظر اعجاز)، 'بنت فنون کا رشتہ - میری نظر میں' (پروفیسر جاوید حیات)، 'بنت فنون کا رشتہ: اجمالی جائزہ' (پروفیسر ہمایوں اشرف)، 'بدر محمدی سے بنت فنون کا رشتہ' (زماں قاسمی)، 'بنت فنون کا رشتہ: مختصر تعارف' (اظہر نیر)، 'بنت فنون کا رشتہ: مطالعہ، تعارف و تاثر' (افتخار عظیم چاند)، 'بنت فنون کا رشتہ مجموعی جائزہ' (منیر سیفی)، 'بدر محمدی اور ان کی غزل گوئی' (انوار احسن وسطوی)، 'متنوع رنگ و آہنگ کا شاعر: بدر محمدی' (بے نام گیلانی)، 'بنت فنون کا رشتہ تجزیاتی مطالعہ' (ڈاکٹر معصوم رضا امرتھوی)، 'بنت فنون کا رشتہ: مختصر جائزہ' (ڈاکٹر بسمل عارفی)، 'بدر محمدی اور بنت فنون کا رشتہ' (عاقل زیاد)، 'بدر محمدی اور ان کی شاعری' (ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر)، 'بدر محمدی کی سلطنت شعر وسخن' (معراج احمد معراج)، 'بدر محمدی: فن اور شخصیت' (ڈاکٹر بختیار نواز)، 'شاعر جادو بیاں بدر محمدی' (ڈاکٹر صوفیہ پروین)، 'بنت فنون کا رشتہ اور بدر محمدی' (ڈاکٹر عبدالودود قاسمی)، 'بنت فنون کا رشتہ ایک تاثر' (ڈاکٹر منصور خوشتر)، 'بنت فنون کا رشتہ ایک جائزہ' (ڈاکٹر محمد ولی اللہ قادری) اور 'بدر محمدی ایک تازہ کار شاعر' (فوزیہ تبسّم) یہ وہ مضامین ہیں جو بدر محمدی کی شاعری کو ایک وسیع کینوس عطا کرتے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ اس مجموعے میں ظفر صدیقی، محمد منظر الحق منظر صدیقی، ڈاکٹر مظفر عالم ضیا عظیم آبادی، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق اور ندا عارفی کے منظوم تاثرات بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ایک سو گیارہ غزلیں ان کے احساسات و جذبات کو پیش کرنے میں پوری طرح سے کامیاب نظر آتی ہیں۔ اسلوب میں پختگی اور زبان صاف ستھری ہے۔ چھوٹی بحر میں ان کی غزل کے چند اشعار دیکھیں۔

اک نیا تبصرہ میں لکھتا ہوں — ہے پرانی کتاب زیست مگر
جانے کیسا یہ ساتھ ہے اس کا — ہونے دیتا نہیں اکیلا مجھے
اب تو دن میں چراغ جلتا ہے — شہر در شہر ہے وہ تاریکی
گھر مگر گھر کے پاس رہتا ہے — رہنے والوں کے بیچ ہے دوری
آپ سے ہے مقابلہ اپنا — ہار مشکل ہے جیت بھی مشکل
اپنی قسمت پہ رو رہا ہوں میں — لوگ ہنستے ہیں میری حالت پر

ان اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بدر محمدی نے اپنے اشعار کے ذریعے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بہت خوبصورت پیرایے میں پیش کیا ہے۔ بدر محمدی کا یہ مجموعہ لائق مطالعہ ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اردو کے سنجیدہ اور باذوق قارئین اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں گے۔

بساطِ ہوائے دل

شاعر/مصنف: دانش اثری
صفحات: 200، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2023
مبصر: فردوس انجم (بلڈانہ، مہاراشٹر)

'بساطِ ہوائے دل' دانش اثری صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔

معاصر ادبی منظر نامے پر دانش اثری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ بیک وقت شعر ونثر دونوں اصناف کے شہ سوار ہیں۔ اس کے علاوہ صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں 'عالمی ادبستان (کتابی سلسلہ)' آپ کے ذوق وشوق کی دلیل ہے۔

کتاب کا نام غالب کے مشہور زمانہ شعر سے اخذ کیا گیا ہے۔

اے تازہ واردانِ 'بساطِ ہوائے دل' — زنہار اگر تمھیں ہوسِ نا ونوش ہے

اس مجموعے میں دانش اثری صاحب کی اول وقت سے اب تک کی ان تمام غزلوں کو شامل کیا گیا ہے، جو دانش اثری کے خود سے طے کیے گئے معیار پر کھری اتری ہیں۔ مطلب یہ کہ دانش اثری نے اس مجموعے میں ان ہی غزلوں کو جگہ دی ہے، جن میں کلام کی پختگی ہے۔ 200 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو دانش اثری نے اس یقین کے نام انتساب کیا ہے جو وہم تھا، اس سپردگی کے نام کیا ہے، جو بے رخی کی نہیں، فریاد کی محتاج ہے اور اس دل بستگی کے نام کیا ہے، جو فرصت کے خزاں لمحوں میں ضرورت بن جاتی ہے۔

کتاب کا انتساب ہی قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہے، جس سے تجسس بڑھ جاتا ہے کہ ایسی کون سی سپردگی اور دل بستگی ہے کہ شاعر نے اس کے نام مجموعہ کر دیا ہے۔ فہرست مشمولات کے بعد 'گفتہ ناخواستہ' کے عنوان سے دانش اثری صاحب نے اپنی بات رکھی ہے۔ جس میں انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ شاعری ''سوچے ہوئے خیالات کو زبردستی عروضی سانچوں میں ڈھالنے کا نام نہیں۔ یہ تو اپنے آپ الہام کی طرح ذہن میں اترتی ہے۔''

اس کے بعد 'حمد باری تعالیٰ' اور نعت پاک ہے۔

مجموعے کی پہلی غزل ہی قوم کی بدحالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قوم کو اپنی حالت بدلنے کا درس دیتی ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

جمال صبح پیدا کر کہ ناظر خود بخود آئیں — اڑا لہجے سے وہ خوشبو لگے جو بوے بستانی
کہاں تیری حمیت اور غیرت ہے وہی جس سے — ڈرے تھے قیصر و کسریٰ، گرا تھا تاج خاقانی

'بساطِ ہوائے دل' دانش اثری صاحب کے ذہنی ارتقا کی دستاویز ہے۔ ان کی شاعری سے ان کی زندگی کے گوناگوں اوصاف بڑے سلیقے سے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غم جاناں، غم دوراں، زندگی سے بیزاری کے ساتھ ساتھ عشق، وفا، ہجر ووصال کا اظہار بھی ملتا ہے۔ وہیں تہذیبی قدر شناسی کا وصف بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ ان کی اپنی انفرادیت ہے جو انھیں ہم عصر شعرا سے الگ کرتی ہے۔

لوگ کہتے تھے بزرگوں کی دعا لی جائے — یہ نئی نسل ہے کہتی ہے کہ کیا لی جائے
نئی تہذیب کی عریانیت سے کانپتا ہے دل — مرے ابا کی مجھ کو راہ حق آثار کافی ہے
نیا نیا کا عہد ہے، نئی نئی روایتیں — کتاب میں وہ پنکھڑی کا سلسلہ چلا گیا

'بساطِ ہوائے دل' میں دانش اثری صاحب نے چھوٹی اور بڑی بحروں میں اشعار کہے ہیں۔ ان کا کلام ترنم سے پر ہے۔ تغزل اور تفکر نے غزلوں کو نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے۔ ان کی غزلیں اپنے مخصوص رنگ کی تابنا کی سے قاری اور سامع کے حواس کو منور کرتی ہیں۔ اس کے ذہن و دل میں اپنا رنگ بھرتی ہیں اور اختتام پر پہنچ کر قاری کو ایسا منظر دکھاتی ہیں کہ وہ جو دان رنگوں کے سحر میں جکڑ جاتا ہے۔

آج کے اس پرفتن دور میں جہاں قدم قدم پر ہزاروں مسائل سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ انسان سکون کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ سکون کے کچھ پل زندگی کو میسر آجائیں۔ آپ ان غزلوں میں اس بھٹکے ہوئے انسان کو بھی دیکھ سکتے ہیں، مایوسی میں گھرے ہوئے آدمی کو بھی، سچی محبت کی تلاش میں پھرتے ہوئے عاشق کو بھی، محبوب کی عنایت کو ترستے ہوئے کو بھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اپنی روایات سے انحراف نہیں ہے؛ مگر وہ اپنی بے بسی، اپنی بے چینی، اور اپنی خواہشات کا بھی اعتراف کرنے سے نہیں چوکتے ہیں۔ یہی انفرادیت اور جدت پسندی اس مجموعے کا خاصہ ہے۔

زبان ریشمی انداز سنگ دلانہ ہے — وہ ایک فرد نہیں یار وہ زمانہ ہے
حیات کیا ہے، فقط اک نفس کا قصہ ہے — کہ عشق وشق بھی پیش و پس کا قصہ ہے
درد کا کاروبار اور نہیں — یعنی اب پیار ویار اور نہیں
ارغوانی بھری ہو، کاس رہے — یعنی جینے کی کچھ تو آس رہے

سوز دل کے ساتھ ساتھ رومان کی ہلکی ہلکی آنچ بھی ان کی غزلوں میں سلگتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دل کی خواہش کبھی پوری نہیں ہونے والی — یہ جو بیماری ہے، اچھی نہیں ہونے والی
میں سوچتا ہوں تجھے پیکر صفات کروں — لگاؤں جست کوئی، تجھ میں ہی ثبات کروں
خیال آباد کی فردوس بے مثال ہے تو — لگے جو ہاتھ تو پھر تجھ کو شش جہات کروں

'بساطِ ہوائے دل' میں دانش اثری صاحب کی روحانی اور وجدانی کیفیت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دانش اثری صاحب کے متعلق 'ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم صاحب' کے ان جملوں سے اتفاق کرتی ہوں:

''غزل کی تخلیق سے قبل غزل کا رمز شناس ہونا ضروری ہے۔ دانش اثری کی غزلوں کو پڑھنے کے بعد میں اس کی سب سے بڑی خوبی یہی مانتا ہوں کہ وہ نہ صرف ان دونوں عناصر پر گرفت رکھتے ہیں؛ بلکہ روایت کو جدت اور رومان کی حقیقت سے انسلاک کا ہنر جانتے ہیں۔'' (فلیپ۔ بساطِ ہوائے دل)

غرض کہ 'بساطِ ہوائے دل' دانش اثری صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہونے کے باوجود غزل کی تمام نزاکتوں سے مزین ہے۔ یہ کتاب قاری کو خود ہی مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔ غزل کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ عام قاری کی استبصاری حسیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ دانش اثری صاحب دور کی کوڑی لانے میں ماہر ہیں۔ میں ان کی نثر بھی پڑھ چکی ہوں، وہ زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں۔ کتاب کا سرورق جاذب نظر اور ترتیب عمدہ ہے۔ فلیپ پر ڈاکٹر نفیس عبدالحکیم صاحب کے تاثرات 'دانش اثری صاحب' کی تمام خوبیوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اہل ذوق اس کتاب سے خوب محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دانش اثری صاحب کی غزل شناسی کے لیے ان ہی کا ایک شعر نقل کر رہی ہوں۔

دانش اثری کو عرفان سا ہوگیا — اس قلندر کو اک آگہی ہے غزل

رسائل و جرائد

کتابی سلسلہ آپ بیتی

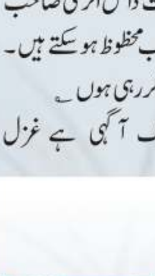

مدیر: شاہ عمران حسن، مدیر اعزازی: ڈاکٹر محمد سلیم
صفحات: 288، قیمت: 500 فی شمارہ، اشاعت: اکتوبر تا دسمبر 2023
ناشر: مکی مسجد کالونی، مدن پور کھادر پارٹ 3
گوشالہ روڈ، سریتا وہار، نئی دہلی۔ 67
مبصر: حقانی القاسمی، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادب کش دور میں علمی، ادبی، ثقافتی مجلّہ شائع کرنا جوئے شیر لانا ہے، لیکن جذبہ اور

جنون ہو تو راستے آسان ہو جاتے ہیں۔ شاہ عمران حسن کے اندر ایک طرح کا جنون ہے، اسی لیے انھوں نے 'آپ بیتی' جیسا ایک موضوعی مجلّہ نکالنے کی ٹھانی۔ مختصر عرصے میں ان کے صحافتی سفر کا یہ تیسرا اقدام ہے۔ یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ ادبی حلقوں میں 'آپ بیتی' کا خیر مقدم کیا گیا اور مجلّے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی کیونکہ یہ عمومی مجلّاتی مزاج و منہج سے الگ نوعیت کا رسالہ ہے۔ یہ بنیادی طور پر سوانحی ادب کا ترجمان ہے۔ اس کا سارا سلسلہ آپ بیتی اور اس کے متعلقات و تلازمات سے جڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے عہد میں اس طرح کے سلسلے مجلّات میں نظر نہیں آتے۔ اس لیے 'آپ بیتی' کو ایک منفرد نوعیت کا مجلّہ کہا جا سکتا ہے۔

'آپ بیتی 3' کئی ابواب پر محیط ہے جن میں پہلا حصہ خودنوشت کے حوالے سے ہے اور یہی اس کتابی سلسلے کا ایک امتیازی اور انفرادی پہلو ہے کہ اس کے ذریعے وہ ادب کے ماہتاب و آفتاب، نجوم و جواہر کے نجی احوال و کوائف اور تخلیقی آثار اور اعمال نامہ حیات سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'سلسلہ 3' میں خودنوشت کے ذیل میں مولانا محمد ولی رحمانی کی تحریر 'مرا شوقِ مطالعہ'، فراق گورکھپوری کی 'دھوپ چھاؤں'، اندر کمار گجرال کی 'میں اخبار کیوں پڑھتا ہوں'، سلمٰی صدیقی کی 'بیت گئی ہے جیسی بیتی'، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی 'موجوں کا اضطراب' نذیر فتح پوری کی 'بیتے پل کا ایک ایک پل'، معین الدین عثمانی کی 'گردش ایام' تحریریں شامل ہیں۔ ان تمام کا تعلق مشاہیر کی زندگی کے مختلف زاویوں سے ہے اور ان سے ان شخصیات کے ذہنی اور فکری تحرکات اور تموجات سے آگہی کی ایک صورت بھی نکلتی ہے۔

مولانا ولی رحمانی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ بنیادی طور پر ان کا میدان سیاست اور روحانیت ہے۔ مگر اردو زبان و ادب کے حوالے سے بھی ادبی منظرنامے پر ان کی شخصیت کا گہرا نقش ہے۔ ایک روحانی اور مذہبی پس منظر سے تعلق رکھنے والے مولانا ولی رحمانی کو داغ دہلوی، ریاض خیرآبادی، فانی بدایونی، بہادر شاہ ظفر، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی پسند ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ شعر و ادب کے باب میں ان کا ذہن نہایت کشادہ ہے اور اس راہ میں کسی طرح کا تحفظ اور تعصب حائل نہیں ہے۔ فراق گورکھپوری نے 'دھوپ چھاؤں' میں اپنی زندگی کے احوال سے واقف کرایا ہے۔ تعلیم، ازدواجی زندگی، تخلیقی سفر، زندگی کے نشیب و فراز وہ ساری کیفیات اور لمحات جو ایک زندگی سے جڑی ہوتی ہیں ان کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے کرب کو جس انداز سے رقم کیا ہے وہ یقیناً بہت ہی دلدوز ہے اور ان کی زندگی کے المناک سانحے کے کئی در کھولتا ہے:

"پورے ایک سال تک شادی کے بعد مجھے نیند نہیں آئی اور عمر بھر میں اس مصیبت کو بھول نہیں سکا، آج تک میں اس بات کے لیے ترس گیا کہ میں کسی کو اپنا سمجھوں اور کوئی مجھے اپنا سمجھے۔ بیوی میں تو اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ دو وقت کا کھانا یا دو وقت کا ناشتہ سلیقے سے مجھے دے سکے۔"

آج کے مشاہیر کی ازدواجی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو بہتوں کے ساتھ قرب کے بجائے کرب کا یہی سلسلہ جڑا ہوا ہے۔ بہت سے ادبا و شعرا Marital Distress/ anxiety/ Discord کے شکار ہیں۔

اندر کمار گجرال (سابق وزیر اعظم ہند) نے اپنی منصبی زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے پر روشنی ڈالی ہے اور اردو اخبارات کے تعلق سے اپنے جذبات بیان کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "اس منصبی دور کے دوران اور آج بھی ملک کے بیشتر اردو کے اخبارات کو حاصل کرتا ہوں اور پڑھتا ہوں، اس سے اردو پڑھنے اور بولنے والوں کے احساسات اور مشکلات کو سمجھنے میں کارآمد مدد ملتی ہے۔" اندر کمار گجرال کا یہ بیان ان اردو والوں کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے جو اردو اخبارات کی اشاعتی مشکلات کو جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی انھیں خرید کر نہیں پڑھتے، خاص طور پر اشرافیہ طبقے نے تو اردو سے ایک طرح کی دوری سی بنالی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی سلمٰی صدیقی نے اپنی آپ بیتی 'بیت گئی ہے جیسی بیتی' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ یہ بہت ہی دلچسپ آپ بیتی ہے۔ ان کی زندگی کے بیشتر احوال و کوائف اور مد و جزر اس مضمون کا حصہ ہیں۔ خاص طور پر مشہور فکشن نگار کرشن چندر سے ان کی شادی کا معاملہ تو بڑا ہی متنازعہ فیہ رہا ہے۔ انھوں نے اس شادی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ "ہماری شادی نینی تال میں ہوئی تھی۔ چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں، کیونکہ یہ عام شادی نہیں تھی اس لیے اس میں رکاوٹیں بھی قدم قدم پر درپیش تھیں۔ عزیز و اقارب کے علاوہ مذہب اور سماج بھی اپنا رول بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ ہندو مسلم فساد ہو جائے گا، کرشن جی کہتے یہ ہندو مسلم فساد ہماری شادی سے پہلے بھی ہوئے ہیں اور بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔ ہمیں فسادات کے محرک یا موجد کا منصب نصیب نہیں ہوگا۔ میں کہتی دیکھ لینا ہمارے تمہارے رشتے دار خودکشی کرلیں گے۔ کرشن جی جواب دیتے محبت کرنے والوں نے اکثر خودکشی ہی کی ہے لیکن نفرت کرنے والوں کو خودکشی کرتے میں نے کبھی نہیں دیکھا، وہ تو جیتے ہیں اور جی بھر کے نفرت کرتے ہیں۔ میں کہتی کہ یہ محبت کرنا کافی نہیں ہے کیا؟ آخر شادی ہی کیوں؟ کرشن جی کہتے صرف محبت کرنا کافی نہیں ہے۔ محبت میں سپردگی لازمی اور غیر مشروط ہونا چاہیے اور چونکہ یہ شادی کے بغیر ممکن نہیں اس لیے شادی بہت ضروری ہے۔"

شرف الدین ساحل کی قسط وار خودنوشت 'موجوں کا اضطراب' کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔ دوسری قسط میں انھوں نے اپنی تعلیمی اور تدریسی زندگی کے احوال سے روشناس کرایا ہے۔

نذیر فتح پوری نے اپنی مختصر سوانحی تحریر 'بیتے پل کا ایک ایک پل' میں اپنے ماضی کے کچھ لمحوں کو یاد کیا ہے۔ بچپن کی یادیں ان کے ذہن سے اس طرح چمٹی ہوئی ہیں کہ وہ ساتھ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ انھیں ماں کی آنکھوں سے بہتا ہوا آنسو یاد ہے، اور ان کی وہ اوڑھنی بھی جو ان کے اپنے آنسوؤں سے ڈھلتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کبیر کو ان کی ماں کا آنچل نہیں ملا، ماں بھری گود نہیں ملی، ماں کے دودھ سے کبیر محروم رہے، باپ کا نام نہیں ملا، خاندان کی شناخت نہیں ملی، حسب و نسب کا غرور نہیں ملا، جس نے ان کو جنم دیا ان کی دعاؤں سے محروم رہے۔ کیسے کیسے الم ناک حادثوں سے گزرا ہوگا ان کا بچپن، طرح طرح کی محرومیوں کے دلدل میں پھنسے ہوں گے کبیر، کس نے دیکھا کس نے محسوس کیا۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ میرے بچپن کے واقعات ایک کتاب کی مانند ہیں۔ یہ کتاب مجلد نہیں ہے، سارے ورق منتشر ہیں۔"

معین الدین عثمانی نے 'گردش ایام' کے عنوان سے اپنی آپ بیتی تحریر کی ہے اور زندگی سے جڑے واقعات کو بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ یہ سوانحی سلسلے اس اعتبار سے بہت قدر و قیمت کے حامل ہیں کہ مستقبل میں یہی اشارے محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔

آپ بیتی کا ایک حصہ 'شخصیات' کے عنوان سے ہے جس میں مولانا شبلی نعمانی اور علی گڑھ (مولانا وحید الدین خان)، پروفیسر لطف الرحمٰن (مشتاق احمد نوری)، شمئل احمد (ڈاکٹر شاہد جمیل)، رشید اندوری: ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں (ڈاکٹر عزیز عرفان)، پروفیسر اے عباسی (ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری)، سرسید احمد خان: ایک بے مثال

رہنمائے ملت (شاہ عمران حسن) جیسی تحریریں شامل ہیں۔ شخصیات پر مرکوز یہ تحریریں بھی بہت اہم ہیں کہ ان میں بہت سے قیمتی نکات و اشارات موجود ہیں جن سے ان شخصیات کی تفہیم میں مدد ملتی ہے اور ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور ان کے علمی، ادبی اور تخلیقی قد و قامت سے بھی آگہی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

مولانا وحیدالدین خان نے اپنے مضمون میں بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ ’’مولانا شبلی نعمانی نے علی گڑھ میں قیام کر کے ایک عظیم سبق دیا ہے۔ یہ سبق کہ عزت اور مقام حاصل کرنے کا راز صرف تنخواہ اور ڈگریاں نہیں ہیں، ایک خاص مولوی آدمی بھی ایک بالکل ماڈرن ماحول میں عزت اور مقام حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم اور قابلیت رکھتا ہو۔‘‘

پروفیسر لطف الرحمٰن سے جڑی ہوئی یادوں کو مشتاق احمد نوری نے بہت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ جس سے لطف الرحمٰن مرحوم کی تخلیقی اور سیاسی زندگی کے رموز و اسرار سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہ دوستانہ انداز میں بے تکلفی سے لکھی گئی ایک پراثر تحریر ہے۔

شموئل احمد کی شخصیت پر شاہد جمیل نے بہت اچھا مضمون تحریر کیا ہے جس میں ان کے شخصی اور فنی اور فکری زاویوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رشید اندوری کے بارے میں عزیز عرفان نے عمدہ تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اسی طرح اے اے عباسی پر وسیم افتخار کی تحریر پڑھنے کے قابل ہے۔ سرسید احمد خان کو شاہ عمران حسن نے بہترین علمی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

’انٹرویو‘ کے حصے میں شاہ عمران حسن نے مولانا محمد ولی رحمانی سے ایک تاریخی انٹرویو شامل کیا ہے۔ مولانا ولی رحمانی کی شناخت کے کئی حوالے ہیں، شاہ عمران نے ان کی زندگی سے جڑے ہوئے بیشتر امور و معاملات پر گفتگو کی ہے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے بھی ایک سوال پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ بڑے بڑے علما شاعر ہوئے ہیں، مجھ میں شاعری کی صلاحیت رہی ہے، میں نے نعت، نظم اور غزل کہی بھی ہے مگر بہت کم۔ چوتھائی صدی کے قریب گزر گئی، یہ سلسلہ بالکل بند ہے۔ شاہ عمران حسن نے ایک بہت ہی اہم سوال ’جدیدیت‘ اور ’مابعد جدیدیت‘ کے مباحث کے حوالے سے کیا تو مولانا نے دیکھیے کتنا عمدہ جواب دیا ہے کہ ’’یہ بحثیں اردو زبان کے دانشوروں کی ہیں، اردو کے عام قاری کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے، وہ بیچارہ نہ ’جدیدیت‘ کو جانتا ہے اور نہ ’مابعد‘ کو سمجھتا ہے۔ ویسے بہت سے دانشور بھی لفظ ’مابعد‘ کی حقیقت نہیں جانتے۔ ہاں ’مابعد جدیدیت‘ پر بحث ضرور کرتے ہیں۔‘‘

’اسفار‘ کے ذیل میں سعید اختر اعظمی کا سفرنامہ حج اور شاہ عمران حسن کا پٹنہ کا سفر شامل کیے گئے ہیں۔

’تبصرے‘ کے ضمن میں ادا جعفری کی خودنوشت ’جو رہی سو بے خبری رہی‘ پر حقانی القاسمی، مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت ’نقش حیات‘ پر ابرار احمد اجراوی، مولانا وحیدالدین خان پر مرتب کی گئی کتاب ’اوراقِ حیات‘ پر محمد عارف اقبال کے تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔ ان تبصروں میں کتابوں کے مشمولات کا عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ منظوم کلام اور قارئین کے تاثرات کے عنوان سے تحریریں شامل ہیں۔

’خطوط‘ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی کے پڑھنے والوں میں علم و ادب کا وہ معتبر حلقہ بھی شامل ہے جس کا اپنا ایک الگ زاویہ نگاہ اور اندازِ فکر ہوتا ہے۔ اسیم کاویانی نے رسالے کے مشمولات پر گفتگو کرتے ہوئے ایک اچھی بات یہ لکھی ہے کہ ’’بہتر ہوگا کہ اہل قلم حضرات شخصیت نگاری میں مبالغہ آمیز تعریف و توصیف سے گریز کریں، ابن کنول کی یاد میں یہ لکھنا کہ ’انھوں نے جس اصنافِ سخن پر (صنف سخن پر) خواہ تنقید، تحقیق یا فکشن پر قلم اٹھایا اسے لازوال بنا دیا۔ (ص 204) صحیح مذاق رکھنے والے ادب فہموں کو راس نہیں آ سکتا۔‘‘ ان کے علاوہ یعقوب یاور، ریاض توحیدی، شمس کمال انجم، پرتپال سنگھ بیتاب نے بھی اپنے تاثرات تحریر کیے ہیں جن سے کتابی سلسلہ ’آپ بیتی‘ کی اہمیت و معنویت اور اس کی رسائی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب واقعی قابل مبارکباد ہیں کہ ’آپ بیتی‘ جیسا مجلّہ شائع کر رہے ہیں۔ یقیناً ’آپ بیتی‘ کی اشاعتیں مستقبل میں ایک ادبی، ثقافتی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیں گی۔

■

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے ’اردو دنیا‘ میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجئے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

بچوں کی بہتر نفسیاتی و تصوراتی نشو و نما کے لیے مادری زبان میں تعلیم دینا ضروری: پروفیسر دھننجے سنگھ

نئی تعلیمی پالیسی کی تجاویز پر عمل کے ذریعے تمام مادری زبانوں کا تحفظ ہوسکتا ہے: پروفیسر علی رفاد فتیحی

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'بھارت کے کثیر لسانی موزیک میں مادری زبان کی اہمیت' کے عنوان سے خصوصی لیکچر

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام 'بھارت کے کثیر لسانی موزیک میں مادری زبان کی اہمیت' کے عنوان سے خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا، جس میں معروف ماہر لسانیات اور شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق

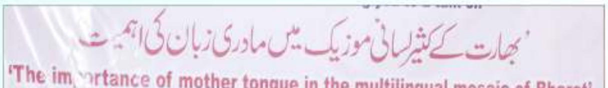

صدر پروفیسر علی رفاد فتیحی بہ طور مقرر مدعو تھے، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔ تعارفی کلمات کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ نے ادا کیے، انھوں نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان وہ ہوتی ہے جسے ہم اپنے خاندان اور اپنی ماں سے سیکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج عالمی سطح پر یہ بحث جاری ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم کس زبان میں دینی چاہیے اور اس سلسلے میں سب سے کارگر اور مشہور رائے یہی ہے کہ بچوں کو شروعاتی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے کیوں کہ اس مرحلے میں ان کی نفسیاتی و تصوراتی نشو و نما تیزی سے ہوتی ہے اور مادری زبان میں وہ مشکل چیزوں کو بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری نئی قومی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان میں تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ کم از کم آٹھویں کلاس تک بچوں کو ان کی مادری زبان میں پڑھایا جائے۔ پروفیسر سنگھ نے بحیثیت مادری زبان اردو زبان کے فروغ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کردار کا خصوصی حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کر رہی ہے، جس سے ہندوستان کی لسانی تکثیریت کے تحفظ کی راہیں ہموار ہورہی ہیں۔

مہمان مقرر پروفیسر علی رفاد فتیحی نے سب سے پہلے اس پروگرام کے انعقاد کے لیے قومی اردو کونسل اور ڈائرکٹر پروفیسر دھننجے سنگھ کا شکریہ ادا کیا اور اپنی تقریر میں بھارت کی لسانی تکثیریت کی وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا کہ گرچہ دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں بائیس زبانیں درج ہیں، مگر ہمارے یہاں ان کے علاوہ بھی سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اس لیے ہندوستان کو ایک کثیر اللسان ملک کے طور پر جانا جاتا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زبانوں کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جن زبانوں کو دستور نے تحفظ اور ترویج و اشاعت کی سہولیات مہیا کی ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی زبانیں ہیں، جو معرضِ خطر میں ہیں اور ان کی حفاظت کے لیے منظّم کوششوں کی ضرورت ہے۔ مادری زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ وہ زبان ہے جو ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر انداز ہوتی ہے اور فطری طور پر ہماری زبان سے وہی لفظ جاری ہوتا ہے جو کسی چیز کو دیکھ کر پہلے پہل ہمارے پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے۔ پروفیسر فتیحی نے کہا کہ ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں ہندوستان کی لسانی تکثیریت اور مادری زبانوں کے تحفظ پر خاص توجہ دی گئی ہے، مگر اس حوالے سے جو تجاویز اس پالیسی میں درج ہیں انھیں روبہ عمل لاکر ہی ہم حقیقی معنوں میں اپنے ہدف کو پاسکتے ہیں۔

کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی کے اظہارِ تشکر کے ساتھ یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام اسٹاف موجود رہا، جبکہ فیس بک لائیو کے ذریعے سیکڑوں لوگ اس پروگرام سے مستفید ہوئے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 دسمبر 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

ہندوستانی روایات کا علمبردار نظیر اکبرآبادی

لکھنؤ: اکبرآباد (آگرہ) تاج محل کے لیے مشہور ہے لیکن اسی سرزمین پر ایک شاہکار اور عظیم شاعر نظیر اکبرآبادی بھی پیدا ہوئے، جن کی

شخصیت ادبی تاج محل کی مانند ہے جنھوں نے درباری شاعری کے مقابلے عوامی شاعری کو ترجیح دی۔ یہ باتیں کارگزار وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر اروند اوستھی کی ہیں۔ وہ شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور ہندوستانی اکیڈمی پریاگ راج کے باہمی اشتراک سے 'ہندوستانی روایات کا علمبردار نظیر اکبرآبادی' شخصیت اور شاعری کے حوالے سے دو روزہ قومی سمینار سے خطاب کررہے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے اے پی سین ہال میں منعقد سمینار میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کلیدی خطبے میں کہا کہ نظیر کی عصری معنویت ان کی لاجواب اور لازوال شاعری کی وجہ سے ہے۔ وہ ہندوستانیت کے عظیم علمبردار تھے۔ افتتاحی تقریب کے بعد پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پرفیسر صغیر افراہم اور نظامت پروفیسر محمد کاظم نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر خان فاروق، پروفیسر ہما خواجہ، پروفیسر شفیق اشرفی اور پروفیسر صالحہ رشید نے مقالات پڑھے۔ پروفیسر سنگیتا ساہو اور چیف پراکٹر پروفیسر راکیش دویدی نے بھی خطاب کیا۔ شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے کوآرڈینیٹر و پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد کاظم نے اور نظامت کے فرائض پروفیسر عباس رضا نیر نے انجام دیے۔ سنسکرت کے ڈاکٹر ستیہ کیتو نے خطاب کیا۔ پروفیسر شبنم رضوی، ڈاکٹر جاں نثار عالم اور ڈاکٹر شبیب علوی، پروفیسر عمر کمال الدین نے نظیر کی نئی جہات تلاش کیں۔ صدارتی کلمات پروفیسر کاظم نے ادا کیے۔ اختتامی اجلاس دویانند تر پاٹھی کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر قمر اقبال، ڈاکٹر برجیس کمار، ڈاکٹر شیا ملیش تیواری، ڈاکٹر گورو سنگھ، ڈاکٹر او پی شکلا و دیگر محققین نے مقالے پڑھے۔ صدر نے اختتام پر مقالہ نگار و ریسرچ اسکالروں کو اسناد تقسیم کیں۔ اس موقعے پر دین رئیس حسین، قمرالدین، رومی نواب، ڈاکٹر روشن تقی، ڈاکٹر وضاحت حسین، فکشن نگار امیر مہدی، ڈاکٹر وسیع احمد، ڈاکٹر ثروت تقی، ڈاکٹر منتظر قائمی، ڈاکٹر صفیہ فاطمہ ادیب حسین مہدی، ڈاکٹر شفیق حسین شفق، آصف رضوی، کیف رضوی کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 نومبر 2023

دھلی

منشی نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ہر زبان کی طرح اردو کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسری زبان کے لفظ، املا، قواعد، معنی اور اشتقاق کو

اپنے مزاج کے مطابق ڈھالے، لیکن اس عمل میں مشکل امر یہ ہے کہ لسانی تاریخ سے ناواقفیت کی بنیاد پر کسی لفظ کی عربی الاصل صورت تک رسائی حاصل کیے بغیر یہ دعویٰ کردیا جاتا ہے کہ یہ شکل صرف اردو یا فارسی میں ہی رائج ہے، عربی میں اس کا وجود نہیں ہے۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام بارہویں منشی نول کشور یادگاری خطبے میں عربی کے ممتاز محقق، اسکالر اور ماہر لسانیات ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے شعبہ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس امر کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ لفظوں کی تحقیق میں سب سے بڑا وسیلہ لغت کا ہوتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ لفظوں کی اصل تک رسائی میں اردو کا ایک بھی لغت پوری طرح کامیاب نہیں۔ لفظوں کی تحقیق میں ایک نکتہ اور پیش نظر رہنا چاہیے کہ کسی لفظ کی اصل تک پہنچنے کے لیے صرف لغت کافی نہیں بلکہ اس کی حقیقت بسا اوقات علم صرف اور علم قرأت سے واضح ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے بڑے بڑے ماہرین لغات، ماہرین لسانیات اور علما بشمول غالب، نظم طباطبائی، شبلی نعمانی، حالی، عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ سے عربی الاصل الفاظ کی تحقیق میں سہو ہوا ہے۔ بہت سے الفاظ بنیادی طور پر عربی الاصل ہیں لیکن ہمارے بڑے بڑے ماہرین نے انھیں اردو اور فارسی کی اختراع سمجھ لیا ہے۔ جلسے کے صدر پروفیسر محمد اسحٰق (ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز) نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے شعبہ اردو کو مبارکباد دی اور کہا کہ اس قسم کے خطبوں کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس قسم کے خطبے سیریز کی شکل میں منعقد ہونے چاہئیں تاکہ ہمارے طلبہ وطالبات ان سے مستفیض ہوسکیں۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی عربی زبان وادب کے ساتھ فارسی اور اردو ادبیات کے علاوہ لغت نویسی پر بھی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ فی زمانہ اردو، عربی اور فارسی لسانی مسائل میں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ خطبے کے کنوینر پروفیسر ندیم احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مہمان مقرر کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی عالم عرب کی قدیم اور موقر اکادمی مجمع اللغۃ العربیہ، دمشق کے واحد ہندوستانی رکن ہیں جو اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، ساتھ ہی نول کشور یادگاری خطبے کی غرض وغایت کے علاوہ نول کشور کے حوالے سے تعارفی کلمات بھی پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 نومبر 2023

ذوق کی سادہ بیانی

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (دہلی) شاخ، بہ اشتراک غالب اکیڈمی دہلی، یوم ذوق کے موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پروقار تقریب کا انعقاد مرکز ادب غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین اولیا نئی دہلی میں کیا گیا۔ استقبالیہ کلمات اقبال مسعود فاروقی، اظہار تشکر ڈاکٹر ادریس احمد نے کیا۔ یوم ذوق کے موقعے پر منعقد تقریب کے پہلے حصے میں صدارتی تقریر ی مہمان خصوصی ڈاکٹر خالد علوی نے کی اور کلیدی خطبہ غالب اکیڈمی کے

سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے پیش کیا۔ دو مرحلوں پر محیط تقریب میں ایک حصہ نثر کا اور دوسرا حصہ شاعری پر مبنی تھا۔ کلام پیش کرنے والوں نے بہترین غزلوں سے شرکا کو محظوظ کیا اور ذوق کے بیانیہ کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اپنے کلام میں برت کر یوم ذوق کے موقعے پر ایک سے بڑھ کر ایک غزل پیش کی۔ مشاعرہ کی باقاعدہ صدارت معروف بزرگ شاعر متین امروہوی نے کی اور نظامت نوجوان ناظم خواجہ طارق عثمانی نے کی۔ وقار مانوی، ظفر مراد آبادی، سید راشد حامدی، احمد علوی، اقبال فردوسی، جمیل مانوی، اسد رضا، حبیب سیفی، عفت زریں، صہیب فاروقی، آشکارا خانم کشف اور چشمہ فاروقی نے اپنے طرحی کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے اس موقعے پر کہا کہ ذوق ہماری کلاسیکی شاعری کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی تفہیم کے بغیر ہم اپنی ادبی روایت کو نہیں سمجھ سکتے۔ انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے صدر اقبال مسعود فاروقی نے بتایا کہ ایک طویل عرصے سے یوم ذوق کا انعقاد یہ تنظیم کر رہی ہے۔ یہ اردو کے عظیم شاعر کی خدمت میں خراج عقیدت ہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے سکریٹری خورشید عالم نے کہا کہ غالب و اقبال کو شہرت تو بے حد ملی، لیکن افسوس ذوق کو نظر انداز بھی کیا گیا۔ ان پر گفتگو کم ہوتی ہے، لہٰذا ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم ذوق کو بھی وہی اہمیت دیں جو دیگر کو دی جاتی ہے، کیونکہ ذوق اس کے مستحق بھی ہیں، ذوق کی سادہ بیانی لائق تقلید ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 نومبر 2023

ف۔عبدالرحیم بطور محقق و ماہر لسانیات

نئی دھلی: 19 اکتوبر کو عربی زبان وادب کی دنیا کے مشہور عالم و محقق ف عبدالرحیم صاحب کا سانحہ ارتحال

پیش آیا تھا، اسی مناسبت سے ان کی حیات و خدمات پر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے زیر اہتمام شعبے کی ڈاکٹر عبدالحلیم لائبریری میں ایک توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ شعبہ عربی کے صدر پروفیسر نسیم اختر ندوی کی صدارت میں منعقد اس لیکچر میں شعبے کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ یہ محاضرہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی نے پیش کیا جن کی مرحوم کے ساتھ نہ صرف مدینہ یونیورسٹی میں 12 سال رفاقت رہی بلکہ انھوں نے ف عبدالرحیم کے بعض علمی منصوبوں میں معاونت بھی کی۔ پروگرام کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ہیفا شاکری نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے اس توسیعی خطبے کے مقرر ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کا مختصر تعارف کرایا، اس کے بعد انھیں خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ اپنے پرمغز لیکچر میں ڈاکٹر محمد اجمل ایوب نے ف عبدالرحیم کی زندگی پر انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی اور ان کی خدمات کے اہم میدان: غیر عربی دانوں کی عربی تعلیم و تدریس اور تقابلی لسانیات کے حوالے سے بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ ف عبدالرحیم کی زندگی کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ''ف عبدالرحیم کی پیدائش 1933 میں تمل ناڈو کے مشہور مقام وانمباڑی میں ہوئی، ابتداً عصری تعلیم حاصل کی پھر عربی زبان سیکھنے کا شوق اور داعیہ پیدا ہوا تو ذاتی شوق و رغبت سے اتنی لیاقت و اہلیت بہم پہنچالی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں داخلے سے لے کر مدراس یونیورسٹی میں عربی کے لیکچرر کی حیثیت سے تقرری تک کا سفر طے کرلیا۔ انھوں نے مزید تعلیم کے حصول کے لیے 1964 میں جامعہ ازہر میں داخلہ لیا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تین سال عمان یونیورسٹی میں کام کیا، یہاں سے مدینہ یونیورسٹی منتقل ہوگئے اور سنہ 1969 سے 1995 تک 'شعبۂ تعلیم عربی برائے غیر عربی داں' سے وابستہ رہ کر غیر عربی داں طبقے کی تعلیم عربی کے حوالے سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کے بعد مجمع الملک فہد سے منسلک ہوئے اور شعبہ تراجم قرآن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تادم واپسیں قرآن اور عربی زبان و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دیتے رہے۔ ف عبدالرحیم صاحب 14,15 زبانوں کے ماہر تھے جن میں عبرانی، لاطینی، سریانی اور جرمن جیسی زبانیں شامل ہیں۔ عربی زبان کی فنی اور لسانی نزاکتوں کے حوالے سے وہ بڑے حساس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں کبھی غیر فصیح تعبیرات استعمال نہیں کیں۔ اگرچہ جنوبی ہند سے ان کا وطنی تعلق تھا تاہم وہ اردو بھی پیدائشی اردو بولنے والوں کی طرح بہت شستہ لکھتے تھے۔ پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی نے ڈاکٹر محمد اجمل ایوب کا ایک قیمتی خطبہ پیش کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ موصوف نے اپنے خطبے میں ف عبدالرحیم کے بارے میں ہمیں بہت سی ایسی باتوں کے بارے میں بتایا جن سے ہم ناواقف تھے۔ ف عبدالرحیم ایک اچھے لغوی بھی تھے، ان کا اس میدان میں اہم کام ہے۔ ڈاکٹر ہیفا شاکری کے شکریے پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 نومبر 2023

شاہ ولی اللہ دہلوی اور فارسی ادب

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں دوسرے توسیعی خطبے کا انعقاد عمل میں آیا جس کا موضوع 'امام شاہ ولی اللہ دہلوی اور فارسی ادب' تھا۔ مقرر خاص کی حیثیت سے مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی (چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ) نے شرکت کی اور جلسہ کی صدارت کے فرائض پروفیسر سید کلیم اصغر صدر شعبہ فارسی نے انجام دیے۔ پروگرام کے آغاز میں مولانا قاسمی نے خانوادۂ ولی اللہی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ اس ملک میں ان

جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'ہمعصر اردو صحافت: ایک لسانی جائزہ' کے موضوع پر توسیعی خطبے کا اہتمام

کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان میانہ روی کی راہ اختیار کرنے پر زور دیا۔ قرآن کریم کا سہل فارسی زبان میں ترجمہ کیا تاکہ غیر عربی داں حضرات کلام پاک کے معنی و مفہوم سے بخوبی واقفیت حاصل کرسکیں۔ الطاف القدس، انفاس العارفین (مجموعہ رسائل)، فیوض الحرمین، فتح الرحمٰن، حجۃ اللہ البالغہ، مکتوبات مدنی وغیرہ کتب کے حوالے بھی پیش کیے۔ شاہ صاحب عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی جید عالم تھے۔ انھوں نے اپنی بیشتر کتابیں فارسی میں لکھیں، آپ فارسی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ شعبۂ فارسی کے سینئر پروفیسر ڈاکٹر عبدالحلیم نے کہا کہ شاہ صاحب نے ابن تیمیہ اور امام غزالی کی فکر کو تکمیل تک پہنچایا اور جو کام یوروپ کے سیکڑوں مصنفین انجام نہیں دے سکے شاہ صاحب نے تنہا وہ کام کیا۔ خطبے کے اختتام پر پروفیسر سید کلیم اصغر نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار و نظریات پر اپنا مختصراً جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے آثار و باقیات کا ذکر کیا اور کہا کہ اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک ہم شاہ ولی اللہ کی علمی و ادبی خدمات کا مطالعہ نہ کریں۔ آج ان کے افکار و خیالات اور علمی خدمات کے اعتراف میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر زہرہ خاتون نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مفتی عطاء الرحمٰن اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کا مختصراً تعارف بھی کرایا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، یکم دسمبر 2023

ہم عصر اردو صحافت: ایک لسانی جائزہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ہر سال کی طرح امسال بھی توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع 'ہم عصر اردو صحافت: ایک لسانی جائزہ' تھا۔ مہمان مقرر معروف صحافی سہیل انجم نے اردو صحافت کی مجموعی تاریخ اور موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات پر سوشل میڈیا کی زبان کا غلبہ ہے جس میں انگریزی الفاظ کی کثرت ہے۔ حالانکہ اردو اخبارات میں انگریزی الفاظ کی جگہ بہتر اردو متبادل کے استعمال پر زور دینا چاہیے۔ انھوں نے زبان کی مسخ شدہ صورت، انگریزی الفاظ کے مضحکہ خیز استعمال کی مثال میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اردو اخبارات کے اقتباسات پیش کیے، جس کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگریزی الفاظ کے بہت سے اردو متبادل موجود ہیں جنھیں ہم بآسانی استعمال کرسکتے ہیں۔ اس لیے قبول عام کے نام پر اردو زبان کو مسخ کرنے کی کوشش قابل قبول نہیں۔ صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر احمد محفوظ نے اپنی صدارتی تقریر میں مہمان مقرر کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی صحافتی خدمات کا اعتراف کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اپنی زبان میں دوسری زبانوں کے لفظوں کا غیر ضروری استعمال اپنے آپ میں غلط ہے اور غیر ضروری استعمال کی تردید کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اردو داں طبقے کی یہ ذمے داری ہے کہ اردو کے متبادل الفاظ کے استعمال کو رواج دے۔ نظامت کے فرائض خطبے کے کنوینر ڈاکٹر مشیر احمد نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 نومبر 2023

اردو میں ادبی رسائل کی تاریخ

نئی دھلی: شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام خصوصی خطبے کا انعقاد کیا گیا، اس خصوصی خطبے کی صدارت

معروف شاعر و عروض داں پروفیسر سید سراج اجملی نے کی اور خصوصی خطبہ معروف افسانہ نگار اور رسالہ آجکل کے سابق مدیر خورشید اکرم نے پیش کیا۔ اس موقع پر شعبہ اردو کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے طلبا و طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ گزشتہ دو برس سے ہم نے خصوصی خطبات شروع کیے ہیں، ان خطبات کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے طلبا بیدار ہوں، ہمارے سماج اور دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ہمارے طلبہ کو مختلف علوم سے واقف ہونا ناگزیر ہے، کسی بھی شعبے کے طلبا و طالبات کا ہمارے پروگراموں میں استقبال ہے، آج کا موضوع ہمارے طلبا و طالبات کے لیے بہت اہم ہے، رسائل پر بات کرتے ہوئے، طلبا چند ہی رسائل کا ذکر کرتے ہیں، جب کہ طلبا و طالبات کا قدیم وجدید ادبی رسائل سے واقف ہونا ناگزیر ہے، قدیم رسائل سے شناسائی کا فائدہ آپ کو ریسرچ ورک میں بھی ہوگا۔ آج کے خطبے کا موضوع طلبا و طالبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے منتخب کیا گیا ہے۔

پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ ہندوستان کے تمام شعبہ ہائے اردو اگر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کی طرح طلبا و طالبات پر رسائل خریدنا لازم کردیں تو بہت سے رسائل کی زندگی طویل ہوجائے گی۔

اردو میں ادبی رسائل تاریخ پر خصوصی خطاب کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار اور آجکل کے سابق مدیر خورشید اکرم نے کہا کہ رسائل پر بات کرتے ہوئے لوگ اس کی تاریخی ترتیب بتاتے ہیں، لیکن میں نظریاتی سطح پر رسائل کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا۔ رسالے معاصر ادبی صورت حال، رویے اور رجحانات سے واقفیت کا ذریعہ ہیں اور رسائل بنیادی طور پر ادب کے پہیے ہیں، رسائل وجرائد ادبا، رجحانات اور نظریات کو متعارف کراتے ہیں، قاری اور کتاب کے درمیان رابطہ قائم نہیں ہو پاتا، لیکن رسائل قاری اور مصنف کے درمیان رابطے کا ذریعہ بھی ہیں۔ رسائل کی وجہ سے ہی نئے لکھنے والے ادب کی طرف راغب ہوئے، مخزن نے اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کو متعارف کرایا۔ رسائل نے ہی نثر اور نثری اصناف کو فروغ دیا، نیرنگ خیال، دلگداز اور مخزن اردو کے ادبی

رسائل کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔کسی رسالے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں شائع شدہ مواد کسی مدیر کے ذریعے قاری تک پہنچتا ہے، جب کہ سوشل میڈیا پر یہ ممکن نہیں ہے.اس کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادبی رسائل کا ماضی شاندار ہے مگر مستقبل خطرے میں ہے۔ پروفیسر سید سراج اجملی نے کہا کہ خصوصی خطیب کے مقالے کا ایک حصہ عملی تجربے پر مبنی تھا، جو عمدہ تھا، پچھلی صدی تخلیقی ادب کے فروغ کا زمانہ تھا۔بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں کچھ ایسے رسائل وجرائد تھے،جنھوں نے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ پروگرام میں شعبے کے اساتذہ، طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2023

غیرعربوں کو عربی زبان کی تعلیم: آفاق، نظریات وخواہشات

نئی دهلی: 25-26 نومبر 2023 کو مجلس ابنائے مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات، جے این یو کی طرف سے

'غیروں کو عربی زبان کی تعلیم: آفاق، نظریات، خواہشات، حقیقت اور امید کے بیچ' کے موضوع پر ڈاکٹر محمد اجمل، اسسٹنٹ پروفیسر مرکز برائے مطالعات زبان وادب عربی وافریقی کی کنوینرشپ میں دوروزہ عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت سفارت خانہ سعودیہ عربیہ، نئی دہلی، کے ثقافتی اتاشی ڈاکٹر خالد بن یوسف برقاوی نے کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر محمد قطب الدین نے انجام دیے۔

کانفرنس کے ڈائرکٹر اور مرکز کے استاد ڈاکٹر محمد اجمل نے کہا کہ یہ پروگرام ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مختلف عہدوں پر فائز جے این یو عربی سینٹر کے فارغین کا ایک اہم پلیٹ فارم ہے، اور امید ہے کہ یہ پلیٹ فارم آئندہ بھی عربی زبان کے فروغ کے لیے کوشاں رہے گا،اور پوری دنیا میں پھیلے ڈپارٹمنٹ کے ان تمام فارغین کو جوڑنے کی کوشش کرے گا جو اپنے اپنے میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔مہمان اعزازی کے طور پر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی شریک ہوئے اور انہوں نے کہا کہ غیر مادری زبان کو پڑھانے کے مختلف طریقے ہیں، جو زمان، مکان اور طلبہ کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، لیکن ان سب میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ پڑھانے والا لسانی صلاحیت کا مالک ہو۔

مہمان خصوصی اور افتتاحی پروگرام کے صدر ڈاکٹر خالد یوسف برقاوی نے اس کانفرنس کے لیے جے این یو کو مبارکباد پیش کی، اور کہا کہ مملکت سعودیہ عربیہ دنیا بھر میں غیر عربوں کے بیچ عربی زبان کو پھیلا رہا ہے، اور عربی زبان کے فروغ واشاعت میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہے۔کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے شام کے ماہر نفسیات اور میڈیا کنسلٹنٹ ڈاکٹر ساری حمود نے کہا کہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی مدد سے ہم آسانی سے عربی زبان سیکھ سکتے ہیں، انھوں نے مزید کہا کہ آپسی گفتگو زبان سیکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر حبیب اللہ خان ندوی نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم جہاں یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے، وہیں ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس اسلامیہ میں بھی ہوتی ہے، اور آن لائن تعلیم بھی آسانی سے ہورہی ہے، ہمیں اس پر مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ نئی دہلی میں واقع عراقی اسکول کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ظاہر الذھب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس موقعے پر مرکز کے فارغین کی کئی کتابوں کا اجرا عمل میں آیا، جن میں قابل ذکر بچوں کے لیے لکھی گئی ڈاکٹر جمیل جالبی کی اردو کہانیوں کا عربی ترجمہ ہے جسے مرکز کے استاد ڈاکٹر محمد اجمل نے کیا ہے۔ پروگرام کے اخیر میں مرکز کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر رضوان الرحمٰن نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد چھ اکیڈمک سیشن ہوئے جن میں 30 تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔

اس دوروزہ کانفرنس میں جے این یو کے علاوہ دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، ذاکر حسین دہلی کالج، بنارس ہندو یونیورسٹی اور کیرلہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد اجمل، اسسٹنٹ پروفیسر، سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، 30 نومبر 2023

ترجمہ ورکشاپ برائے ادب اطفال

نئی دهلی: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا میں دیگر زبانوں کے اردو میں بچوں کی کتابوں کے اردو ترجمے کے لیے سہ روزہ 'ترجمہ ورکشاپ' شروع ہوا۔اس موقعے پر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے چیئرمین ملند سدھا کر مراٹھے نے کہا کہ ترجمہ کرتے وقت ایک زبان سے دوسری زبان کے الفاظ کی منتقلی سے زیادہ لسانی تہذیب کی منتقلی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ترجمے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ دنیا بھر میں زبانوں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ایک زبان کی جو خاص تخلیق ہوتی ہے، وہ ترجمے کے ذریعے غیر زبانوں تک پہنچتی ہے۔ملند سدھا کر مراٹھے نے مزید کہا کہ آج بھارت میں ہی نہیں، دنیا بھر میں پڑھنے کے لیے بچے موبائل کا استعمال زیادہ کرنے لگے ہیں، لیکن انھیں الیکٹرانک ریڈنگ کے بجائے چھپی ہوئی کتابوں کو پڑھنے کی عادت ہونی چاہیے۔این بی ٹی، انڈیا کے چیئرمین ملند سدھا کر مراٹھے کے مطابق دنیا بھر میں کتابوں کی فروخت سے جو پیسہ آتا ہے، اس میں 50 سے 60 فیصد رقم بچوں کی کتابوں کی فروخت سے آتی ہے۔ترجمہ ورکشاپ برائے ادب اطفال کے مہمان خصوصی اور مشہور فکشن نگار غضنفر علی نے ترجمے کی اہمیت، ترجمہ نگاری کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ترجمہ کرتے وقت الفاظ کے ترجمے سے زیادہ اس بات پر توجہ دی جائے کہ رائٹر کہنا کیا چاہتا ہے۔اسی لیے ترجمہ کرتے وقت کئی بار موضوع و محل کے اعتبار سے اپنی طرف سے بھی اصطلاحات بنانی پڑتی ہیں۔ 12 ناولوں اور 25 سے زیادہ کتابوں کے مصنف غضنفر علی نے این بی ٹی، انڈیا کے اردو ایڈیٹر شمس اقبال کی اس بات کے لیے تعریف کی کہ انھوں نے اردو کے مختلف شعبۂ جات کے ماہرین اور ترجمہ نگاروں کو یکجا کر کے اس ترجمہ ورکشاپ کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ اس موقعے پر ناول نگار، ڈرامہ نگار، اسکرین رائٹر، بچوں کی مصنفہ اور فرانسیسی وانگریزی کی مشہور قلم کار مریم کریم اہلاوت نے کہا کہ بچوں کی کہانی محبت سے لکھی جاتی ہے، بچوں کی کہانی ان کی مادری زبان میں لکھنا ضروری ہے، کیونکہ یہ اس زبان کے ادب کی بنیاد ہوتی ہے۔بچوں کی کہانیوں میں ایک تہذیبی پیغام ہوتا ہے جو

براہ راست بھی ہوتا ہے اور بالواسطہ بھی لیکن بچوں کی کہانیوں میں لفظوں کی مٹھاس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سخت الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے۔ مسٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہ اردو کے لیے اعزاز کی بات ہے کہ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نے جو اردو کتابیں شائع کی ہیں ان کے ترجمے دیگر زبانوں میں بھی ہورہے ہیں۔ اس ادارے نے اردو میں ان موضوعات پر کئی کتابیں شائع کی ہیں جن کی اردو قارئین کو سخت ضرورت ہے۔ اس موقعے پر اردو کی دو کتابوں، ذکیہ مشہدی کی 'گڑیوں کی نانی' اور مریم کریم اہلاوت کی کتاب 'نئی ماں' کے اردو اور ہندی ترجمے کا اجرا ہوا۔ ورکشاپ میں خورشید اکرم، محمد علیم، پرویز شہریار، رخشندہ روحی، زین شمسی، نہاں رباب، نثار احمد، شہناز رحمٰن، احسن ایوبی، توصیف بریلوی، جاوید عالم، نوشاد عالم، خان محمد رضوان، عشرت ظہیر، نوشاد منظر، سعدیہ رحمٰن، خاور حسن، شاہ عالم، عذرا انجم، افضل حسین نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 نومبر 2023

ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دهلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے زیر اہتمام پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں 51 ویں ان ہاؤس سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ شعبۂ عربی کی ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی لائبریری میں منعقد اس سمینار میں شعبے کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالر فورم کی ایڈوائزر ڈاکٹر ہیفا شاکری نے تمام شرکا کا استقبال کیا۔ ریسرچ اسکالر ساجد ایم نے 'متحدہ عرب امارات میں بچوں کا : ڈاکٹر نسیبہ عزیبی کی کتابوں کے حوالہ سے' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ نگار نے سب سے پہلے امارات میں فن قصہ اور خاص کر بچوں کے ادب پر روشنی ڈالی، اس کے بعد ڈاکٹر نسیبہ عزیبی کی ادب اطفال میں خدمات پر گفتگو کی اور ان کی مذکورہ موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا نیز ان کی خصوصیات پر بھی گفتگو کی۔ مقالے کے بعد اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے مقالے سے متعلق سوالات بھی کیے جن کے مقالہ نگار نے خوش اسلوبی سے جواب دیے۔ سمینار میں شریک اساتذہ نے مقالے کو سراہا اور اسے مفید و معلومات افزا قرار دیا۔ سمینار کے صدر پروفیسر نسیم اختر ندوی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ قصے کا فن ایسا فن ہے جس کے بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بچوں کی تربیت اور تعلیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، قصے کے ذریعے زبان کی اصلاح ہوتی ہے نیز آپ نے عربی ادب میں فن قصہ کی ابتدا پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ قصے کا فن زمانہ قدیم میں بھی موجود تھا لیکن آج یہ فن جس شکل میں ہے نہیں تھا، پروفیسر نسیم اختر ندوی نے ریسرچ اسکالرز کو اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ مقالہ نگار نے پروگرام کے آخر میں تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 دسمبر 2023

اترپردیش

مخطوطات کی اہمیت اور تحفظ پر ورکشاپ

رامپور: رامپور رضا لائبریری اور میوزیم میں قومی مخطوطہ مشن کے زیر اہتمام رنگ محل میں مخطوطات کی اہمیت اور تحفظ کے موضوع پر ورکشاپ اور بیداری مہم کا انعقاد کیا گیا۔ ورکشاپ میں بہار، مہاراشٹر، اترپردیش، کرناٹک، کیرلہ کے علاوہ تھائی لینڈ، افغانستان اور نیپال سے 30 شرکا نے حصہ لیا اور سبھی شرکا کو سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ ارون کمار سکسینہ سینئر ٹیکنیکل ریسٹورر، انچارج کنزرویشن لیبارٹری رامپور رضا لائبریری نے کہا کہ زمانہ قدیم سے ہی انسانوں کے ذریعے نشان بنانے، لکھنے، ڈرائنگ، پینٹنگ وغیرہ کے لیے کاغذ کا ستعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دنیا کے تمام خطوں اور ہر دور میں بڑی تعداد میں دستاویزات، مخطوطات اور کتابیں تیار ہوئی ہیں۔ آج یہ تمام مواد انسانوں کی تاریخ اور ترقی کو سمجھنے کے لیے ہر دور اور خطے میں انسانوں کے انمول تحریری ورثے کی صورت میں موجود ہیں۔ ہمیں اس ورثے کے تحفظ نیز جہاں تک ممکن ہو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ مقصد ماضی میں مسخ شدہ انمول دستاویزات کو مناسب علاج فراہم کرکے اور ان کی دیکھ بھال کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر ہمانشو سنگھ پروجیکٹ کوآرڈی نیٹر مخطوطہ تحفظ مرکز قومی مخطوطہ مشن نے کہا کہ ہندوستان کو وراثت میں ملی ثقافتی اور مذہبی دولت بہت زیادہ اور قیمتی ہے۔ اس میں کتابوں اور صحیفوں کی اپنی اہمیت ہے۔ ایک سروے سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ملک میں کاغذ پر لکھی تحریریں نہ صرف عجائب گھروں میں ہیں بلکہ ہزاروں مندروں، مدرسوں، لائبریریوں اور یہاں تک کہ نجی گھروں میں بھی موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ صحیفے اور مذہبی کتابیں مناسب دیکھ بھال نہ ہونے اور لاپروائی کی وجہ سے تباہ ہورہی ہیں اور ان اہم متون کو بچانے کے لیے حکومت کی طرف سے قومی مخطوطہ مشن پروجیکٹ چلایا جارہا ہے۔ اس منصوبے کے تحت ملک کے مختلف اداروں اور کتب خانوں میں مخطوطات کے تحفظ کے مراکز قائم ہیں جو متن کے تحفظ پر کام کررہے ہیں۔ پروگرام میں موجود تمام اداروں کے شرکا سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ مخطوطات کے تحفظ کے لیے مخطوطات کے تحفظ کے مرکز رامپور رضا لائبریری سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ علوم الحدیث کے پروفیسر ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی نے کہا کہ رامپور رضا لائبریری کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے تھے کہ رامپور رضا لائبریری اردو، عربی، فارسی کی دنیا کی مشہور لائبریری ہے لیکن آج یہاں آنے کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوا کہ زبان کے ماہرین کے ساتھ ساتھ مخطوطات کے تحفظ کے سائنسداں بھی اس لائبریری میں کام کررہے ہیں۔ شبانہ افسر نے کہا کہ کاغذ سے بنی ہر شے مثلاً مخطوطات، دستاویزات، کتابیں اور تصویروں وغیرہ کی حالت وقت کے ساتھ ساتھ بگڑ جاتی ہے۔ شروع میں کاغذ مضبوط اور سفید ہوتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طبعی، کیمیائی اور حیاتیاتی وجوہ کی بنا پر اس کی خصوصیات بدل جاتی ہیں اور اس کی حالت بگڑ جاتی ہے اور یہ خراب ہوجاتا ہے۔ ٹیکنیکل ریسٹورر ندا فرحین نے کہا کہ جہاں مخطوطات اور کتابیں رکھی جاتی ہیں وہاں کی آب و ہوا اور حالات ان پر بہت زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ وہ نمی اور درجہ حرارت اور ان کی تبدیلیوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ مرطوب ماحول میں کاغذ اپنا کرکرا پن کھو دیتا ہے اور لچک دار ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ، زیادہ نمی میں فنگس اور کیڑوں جیسے مائکرو جنزموں کی تیزی سے نشو ونما ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم صابر نے ایک پریزنٹیشن کے ذریعے لائبریری میں جمع کیے گئے نادر مخطوطات اور نوادرات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ پونم سینی کنزرویٹر، مینواسکرپٹ کنزرویشن سنٹر رضا لائبریری نے کہا کہ دھول نہ صرف نسخوں کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اس میں نمی اور مٹی کے ذرات کی موجودگی کی وجہ سے فنگس کو بھی جنم دیتی ہے۔ اس لیے دھول سے تحفظ بہت ضروری ہے۔ میوزیولوجسٹ صنوبر شاہ خان نے کہا کہ حفاظت کے ساتھ ساتھ مخطوطے کی مناسب دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2023

سعادت حسن منٹو ایک مطالعہ

میرٹھ: بچپن سے اب تک اگر ہم کسی ادیب کا نام سنتے آئے ہیں تو وہ سعادت حسن منٹو ہے، وہ اپنے وقت سے آگے سوچتے تھے۔ انھوں نے اپنے معاشرے اور سماج کی حقیقتوں کو کھول کر ہمارے سامنے پیش کیا، ان کے انشائیے، ڈرامے، خاکے اور مضامین میں حقیقت کا ثبوت ملتا ہے۔

ان خیالات کا اظہار عارف نقوی نے کیا۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ استقبالیہ کلمات ریسرچ اسکالر شہناز پروین، نظامت علمہ نصیب اور شکریے کی رسم عظمیٰ سحر نے انجام دی۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ منٹو کے افسانوں میں بدنام طبقات کی زندگی کو دکھا کر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اس سماج میں بہت سے لوگ مجبور ہوکر غلط کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ طوائفوں کی زندگی کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں جیسے انہی طوائفوں میں آپ کی زندگی بسر ہوئی ہو۔ جنسی کیفیات اور نفسیاتی خواہشات کے مظاہر کو اس طور پیش کرتے ہیں کہ سفید پوشی کے پیچھے گھناؤنا پن ظاہر ہونے لگتا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ منشی پریم چند کے بعد بڑے افسانہ نگار کو تلاش کریں تو منٹو کا نام پہلے آتا ہے۔ منٹو کے افسانوں پر بہت سے ڈرامے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ اگر کوئی کام کرتا ہے تو اس پر اعتراضات کی بوچھار ہونا طے ہے۔ منٹو نے جو کچھ زندگی میں دیکھا ان سے نڈر ہوکر پردہ اٹھایا، واقعی یہ بڑی بات ہے۔ اس موقعے پر پڑھے گئے مقالوں کا لب لباب یہی تھا کہ سعادت حسن منٹو کی تخلیقی فنکاری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فنکار قاری کو مرکزی کردار کے تجربوں میں شامل کر دیتا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں کمال کی حقیقت نگاری پیش کی ہے جب کہ اس دور کے بہت سے فکشن نگار ایسی حقیقت نگاری پیش کرنے سے قاصر رہے۔ پروگرام سے ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، محمد شمشاد، سیدہ مریم الٰہی، فیضان ظفر، نزہت اختر، فرحت اختر، ماہ عالم اور دیگر طلبہ وطالبات جڑے رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2023

پوسٹ ٹروتھ: عصری ادب اور سنیما میں نمائندگی

علی گڑھ: ہم جس زمانے میں رہتے ہیں اس میں جھوٹ سے سچ کو الگ کرنے کے طریقوں پر غور وخوض کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی نے 'پوسٹ ٹروتھ (مابعد سچائی): عصری ادب اور سنیما میں نمائندگی' موضوع پر دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا آغاز کیا۔ اے ایم یو وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے اپنے صدارتی کلمات میں ہندوستان میں حال میں منعقد ہونے والے جی 20 سربراہی اجلاس کی کامیاب تکمیل اور ہندوستان کی آزادی کے 75 سالہ جشن کے تحت آزادی کے امرت مہوتسو کا ذکر کیا۔ ان واقعات نے موجودہ کانفرنس کے لیے پس منظر کا کام کیا جس میں عصری ادب اور سنیما میں سچائی اور نمائندگی پر بحث کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ پروفیسر گلریز نے کہا کہ پوسٹ ٹروتھ وہ حقیقت ہے جسے ہم سمجھتے اور فرض کرتے ہیں، جو کہ حقیقت سے کافی بعید ہوسکتی ہے۔ اپنے خیر مقدمی کلمات میں شعبہ انگریزی کے سربراہ پروفیسر محمد عاصم صدیقی نے اتھروپوسین اور پوسٹ ٹروتھ جیسے متنوع موضوعات پر کانفرنسوں کے انعقاد کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ انگریزی کی جڑوں میں یہ بات ہے کہ ان موضوعات پر تبادلۂ خیال ہو۔ شعبے کے اولین سربراہ سر والٹر رالے، جنگ کے پس منظر میں پمفلٹ لکھتے رہے جسے پوسٹ ٹروتھ کی ایک اہم مثال کہا جاسکتا ہے۔ پوسٹ ماڈرن تحریروں میں سچائی پر گفتگو کے حوالے سے پروفیسر عاصم صدیقی نے اقتدار کے مراکز سے جاری ہونے والے سرکاری بیانات میں پوسٹ ٹروتھ کے رجحان کی جڑوں اور سرکاری بیانیے پر عدم اعتبار کے رجحان پر تبصرہ کیا۔ تقریب کی مہمان خصوصی ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اردو ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پوسٹ ٹروتھ کوئی نیا مہر نہیں ہے، اور یہ وقت کے کسی خاص لمحے تک محدود نہیں ہے۔ لفظ پوسٹ کا استعمال زمانی معنی میں نہیں بلکہ سچائی کے تناظر میں ہوتا ہے جس پر پروپیگنڈے کے باعث گہن لگ جاتا ہے۔ انھوں نے نازی ازم سے لے کر بلقان کی جنگوں تک اور مغل سلطنت کے خاتمے سے لے کر ہندوستان میں موجودہ حکومت تک کے دور میں پوسٹ ٹروتھ کی ابھار کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب اور تاریخ کے ایک دوسرے سے ملن سے پوسٹ ٹروتھ کے مثالیں جنم لیتی ہیں جس کا مشاہدہ ہر عہد میں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کے اردو شعرا کا حوالہ دیا جنھوں نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی تغیرات پر دکھ کے اظہار کے لیے شاعری کا استعمال کیا۔ دی ہندو اخبار کے ڈپٹی ایڈیٹر مس رانوج کمار نے پلینری سیشن سے ہندی سنیما میں (غیر) سچائی پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ کس طرح سنیما پوسٹ ٹروتھ کے مطالبات کو پورا کر رہا ہے، نہ صرف موجودہ عہد میں بلکہ تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے لیے ماضی کی بھی نمائندگی کر رہا ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ فن میں منشا اور ارادے کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ پروفیسر نثار احمد خان، شعبہ اقتصادیات، اے ایم یو نے مہمان اعزازی کے طور پر گفتگو کرتے ہوئے معاشی دنیا میں پوسٹ ٹروتھ کی نمائندگی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 نومبر 2023

عربی وفارسی زبان وادب ماضی وحال

پریاگ راج: الٰہ آباد سنٹرل یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی میں 'عربی وفارسی زبان وادب ماضی وحال' کے عنوان سے منعقد سمینار میں ریسرچ اسکالروں نے مقالات پیش کیے۔ یونیورسٹی کے رفیق ہال میں منعقدہ سمینار کے آخری سیشن میں قدیم اور جدید دور میں عربی و فارسی ادب کے موضوع پر ریسرچ اسکالروں نے اپنے وقیع اور علمی وتحقیقی مقالات سے دونوں زبانوں کی قدیم وجدید دور کے تناظر میں ادبی خصوصیات وامتیازات کو پیش کیا۔ شعبے کے صدر پروفیسر نجے سکینہ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ عربی و فارسی دونوں قدیم زبانیں ہیں جو قدیم تہذیبوں کی حامل بھی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ ان دونوں زبانوں میں ادبی شہ پاروں کا شاندار ورثہ ہے جو علمی اور تحقیقاتی دنیا کے لیے قابل استفادہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس طرح کے سمینار کے انعقاد سے ریسرچ اسکالرس کو نئی جہات سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے اور مختلف زاویوں سے مقالہ نویسی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور مقالات کو معنویت سے مزین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پروفیسر سکینہ نے مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں کی کاوشوں کی خوب پذیرائی بھی کی۔ دریں اثنا دوسرے سیشن میں 9 مقالات پیش کیے گئے۔ اسی طرح تیسرے اور آخری آن لائن سیشن میں 10 مقالے پیش کیے گئے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالروں کے ذریعے پیش کیے گئے مقالات میں سید انور صفی، مرزا محمد حیدر،

مامون رشید (لکھنؤ یونیورسٹی)، غزالہ شیریں، رانی حفیظ، زبیر حسن، زینب شمس، اخلاص عابدی، صبا نعیم، محمد عابد، عمران احمد، حیدری بانو، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، محمد عسکری، محمد امجد، شکیل، شبینہ بیگم (الہ آباد یونیورسٹی)، محمد شاہد منیر الزماں (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، احتشام حسین، سعید، ناظم حیات (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)، محمد ثناء اللہ (گور بنگا یونیورسٹی)، حفظ الرحمٰن، محمد عادل (ممبئی یونیورسٹی)، محمد زید خان (جے این یو)، زرفشاں خان، خوشنما بانو (مانو، حیدرآباد)، محمد طارق رسول، مشاہدہ، محمد انیس (دہلی یونیورسٹی) کے نام شامل ہیں۔ دوسرے سیشن کی صدارت سابق صدر شعبہ عربی و فارسی ڈاکٹر صالحہ رشید اور نظامت زینب شمس نے کی جب کہ اختتامی جلسے کی صدارت پروفیسر سنجے سکسینہ اور نظامت ڈاکٹر محمود مرزا نے انجام دی۔ اختتامی اجلاس کے مہمان اعزازی ڈاکٹر احمد مکین نے یونیورسٹی سے اپنے رشتے کو قدیم بتایا اور کہا کہ ریسرچ اسکالر اپنی محنتوں اور اہم تحقیقات سے یونیورسٹی اور اپنے اکابر کا نام روشن کریں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر حبیب اللہ خان اور الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کے صدر پروفیسر سنجے سکسینہ کے ہاتھوں سمینار میں حصہ لینے والے ریسرچ اسکالروں کو توصیفی اسناد اور بیگ عطا کیے گئے۔ آخر میں ڈاکٹر نیلوفر حفیظ نے سمینار کی مفصل رپورٹ پیش کی اور ریسرچ اسکالر غزالہ شیریں نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2023

اردو کتابوں کی نمائش

مرادآباد: 23 نومبر "اچھی کتابوں کا مطالعہ انسان کو مہذب بناتا ہے اور شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ ہر

چند کہ آج مطالعے کی ٹکنالوجی بدل گئی ہے اور لوگ سوشل میڈیا کے اسیر ہو گئے ہیں، لیکن دنیا میں کتابوں کا کوئی بدل نہیں۔" ان خیالات کا اظہار آج یہاں سینئر صحافی و ادیب معصوم مرادآبادی نے اردو کتابوں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ "اگر دو دن کتاب کا مطالعہ نہ کیا جائے تو تیسرے دن گفتگو میں شیرینی باقی نہیں رہتی، یعنی انداز تکلم بدل جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج ہزاروں قیمتی لائبریریاں کتابوں کے شائقین کے انتظار میں ہیں، لیکن لوگ سوشل میڈیا میں غرق ہیں، جو ہمیں ناقص معلومات فراہم کرتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنے ذہنوں کو روشن کرنے کے لیے مطالعے کی طرف رجوع ہوں۔ کتاب انسان کی سب سے بڑی رفیق اور دمساز ہے۔"

مرادآباد کے جنت نشاں گرلز انٹر کالج میں نیشنل سوشل آرگنائزیشن کے زیر اہتمام اردو کتابوں کی نمائش کی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں تقریباً ساڑھے تین سو اردو کتابیں شائقین کو بذریعہ قرعہ اندازی تقسیم کی گئیں۔ پروگرام کی صدارت جنت نشاں تعلیمی مشن کے ڈائریکٹر محمد عتیق نے کی اور مشہور صحافی و ادیب معصوم مرادآبادی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ دیگر مہمانوں میں ڈاکٹر محمد آصف حسین، ڈاکٹر محمد الیاس، اسد مولائی اور تحسین مرادآبادی شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض این ایس او کے صدر مرزا ارشد بیگ نے کی۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے اردو کے مستقبل کو روشن بتاتے ہوئے کہا کہ ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں۔ اردو کا شوق و ذوق ہی ہمیں اردو کے مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اردو زبان کی شیرینی اور لطافت ہر طبقے کے باذوق سامعین اور قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ دنیا میں ایسے کئی ممالک ہیں جہاں رابطے کی زبان اردو ہے۔

پریس ریلیز: معصوم مرادآبادی، 23 نومبر 2023

امرتا کا خواب: ساحر

لکھنؤ: سنت گاڈ کے آڈیٹوریم، سنگیت ناٹک اکادمی گومتی نگر میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش حکومت اور انسٹی ٹیوٹ آف ہیومن ریسورسز، ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ سوسائٹی (آئی ایچ آر آر ڈی) کے اہتمام سے ڈرامہ 'امرتا کا خواب: ساحر' کو اسٹیج پر پیش کیا گیا جس کے مصنف قلمکار، ڈرامہ نگار ایس این لعل تھے۔ ہدایت کاری نواب مسعود عبداللہ و ایس این لعل نے مشترکہ طور پر کی۔ یہ ڈرامہ موقر استاد ادیب مرحوم شارب ردولوی کے نام تھا۔ اس موقعے پر شارب ردولوی کو 2 منٹ خاموشی اختیار کر کے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے کے درمیان ساحر کے فلمی نغمے بھی گائے گئے۔ ڈرامے میں ساحر-امرتا کی جہاں پہلی ملاقات ہوئی اس مشاعرے کو بھی پیش کیا گیا جو کہ پریت نگر میں 1944 میں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں جاں نثار اختر، مجاز لکھنوی، جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، علی سردار جعفری، امرتا پریتم و ساحر کو مشاعرہ پڑھتے ہوئے دکھایا گیا۔

ڈرامے میں امرتا و ساحر کی محبت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جو کہ سماج کو ایک پیغام دیتے ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کی ملاقات یعنی 1944 سے شروع ہو کر ساحر کے انتقال یعنی 1980 پر ختم ہو جاتی ہے۔ ڈرامے میں جہاں ایک طرف ساحر امرتا کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے وہیں ساحر اپنی ماں سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اپنی ماں اور اپنے درمیان کسی تیسرے کو لانے کی ہمت نہیں کر سکے۔ ادھر امرتا نے ساحر کی وجہ سے اپنے شوہر پریتم سنگھ کو چھوڑ دیا لیکن ساحر کا ساتھ نہ ملنے کی وجہ سے ساحر کے انتظار میں ہی اپنے دوست امروز کے ساتھ رہنے لگی۔ ساحر امرتا کا خواب تھا جو کہ ساحر کے انتقال کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ پھر امرتا نے باقی زندگی اپنے دوست امروز کے ساتھ ہی گزاری۔ ڈرامے کے تخیلات اطہر نبی کے تھے۔ ساحر و امرتا کے کردار کو ادا کرنے کے لیے دلی سے آئے اداکاروں راجیو شرما اور چندرانی مکھرجی کو ڈرامے میں شامل کیا گیا۔ ساحر کا کردار راجیو شرما، امرتا کا کردار چندرانی مکھرجی، سوتر دھار کا کردار نواب مسعود عبداللہ نے ادا کیے، امروز کا کردار آدتیہ وہری، شار کا کردار فرید خان، وجے دیو کا کردار آتش اعظمی نے، جوش ملیح آبادی کا کردار راہل مصرا، جاں نثار کا کردار شاہ رخ علی، سردار جعفری کا کردار شہباز، عرش ملسیانی کا کردار ثاقب حسن، مجاز لکھنوی کا کردار آتش اعظمی، و نوکر کا کردار شاہد نے ادا کیے۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر ساحر کے نغموں کو آواز دینے والے گلوکاروں میں جاوید غوری، کمارکیش اور کرتی موجود تھے۔ ڈرامے کے معاون ہدایت کار محمد رضوان تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 نومبر 2023

اودھی زبان میں ابتدائی جدید صوفی کہانیاں

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شعبہ تاریخ نے 'اودھی میں ابتدائی جدید صوفی کہانیاں: ہندوستان کی کثیر ثقافتی تاریخ کی تشکیل نو کے ادبی وسائل' موضوع پر سنٹر کی وزٹنگ فیلو ڈاکٹر انالیزا بوکیٹی، شعبہ السنہ و ثقافت، جینٹ یونیورسٹی، بلجیم کے علمی خطبے کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر بوکیٹی نے قرون وسطی کے چشتی صوفی عثمان کی معروف شعری تخلیق چتراولی پر اپنی تحقیق کے حوالے سے گفتگو کی۔ عثمان، مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر (1605-27) کے عہد کا مشہور صوفی شیخ تھا۔ ڈاکٹر

بوکیٹی نے اودھ کی ادبی ثقافت، صوفی عشقیہ کہانیوں، ان کی ابتدا، مقبولیت اور متنوع سامعین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ صوفی شیوخ نے اپنے عالمگیر بھائی چارے، مساوات، رواداری اور اختلافات کے احترام کے پیغام کے ساتھ معاشرے کی تشکیل اور تبدیلی میں اہم سماجی و ثقافتی کردار ادا کیا۔ خاص طور پر اودھ کا تاریخی خطہ قرون وسطیٰ اور ابتدائی جدید دور میں بنیادی طور پر چشتی روایت کے صوفیا کی نمایاں موجودگی کے لیے معروف تھا۔ صوفی جہاں بھی گئے وہ مقامی رسوم و رواج میں شامل ہوگئے اور ہندو مسلمان دونوں سے انھیں احترام و عزت ملی۔ انھوں نے مزید کہا کہ چتراولی، پریماکھیان کی صنف سے تعلق رکھتی ہے جو کہ فارسی مثنوی یا طویل داستانی نظموں کی طرح ایک شعری مجموعہ ہے، جسے بنیادی طور پر اودھ خطے کے چشتی صوفیا نے مقامی اودھی بولی میں تیار کیا اور اسے رواج ملا۔ انھوں نے کہا 'چتراولی سوانح عمری اور سفرنامے کا مرکب ہے، جس میں مصنف عثمان نے آگرہ، دہلی، کابل اور احمد آباد جیسے ہندوستان کے بڑے شہروں اور قصبات کی متحرک فکری، ثقافتی، مذہبی اور تجارتی زندگی کے دلچسپ چشم دید واقعات پیش کیے ہیں۔'' صدر شعبہ پروفیسر گلفشاں خان نے اپنے اختتامی کلمات میں ملک محمد جائسی کی پدماوت سمیت دیگر ادبی شاہکار مجموعوں کے ساتھ اس تصنیف کے متنی اور تقابلی تجزیے اور اس دور کی تاریخی کتب کے ساتھ تقابل پر زور دیا۔ انھوں نے ہندوستان کے ماضی کے ایک اہم لیکن کم دریافت شدہ ادبی خزانے کے بارے میں تحقیق کو سامنے لانے کے لیے مہمان مقرر کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 نومبر 2023

قیصر الجعفری کی حیات و خدمات

الہ آباد: سہ ماہی رسالے ادب سلسلہ کے زیر اہتمام قیصر الجعفری کی شاعری اور ان کی حیات و خدمات پر الہ

آباد کے نواب گارڈن میں ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کی مختلف ریاستوں سے آنے والے ادیبوں شاعروں اور صحافیوں نے قیصر الجعفری کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ قیصر الجعفری ترقی پسند نہیں تھے لیکن وہ ترقی پسندی سے متاثر ضرور تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں 'ہوا' کو جس طرح مختلف مواقع پر استعارے کی شکل میں باندھا ہے اس سے ان کے ادبی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ سہیل انجم نے کہا کہ قیصر الجعفری کی غزلوں کو اپنی آواز دے کر متعدد گلوکاروں نے اپنی شہرت میں اضافہ کیا۔ ان کے بقول فلمی نغمے لکھنے کے باوجود قیصر الجعفری کا ادبی قد کم نہیں ہوا۔ ان کی شاعری بڑی شاعری تھی۔ پروفیسر صالحہ رشید نے قیصر الجعفری کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے الہ آباد سے ان کے وطنی تعلق کے حوالے سے اس تجویز کی تائید کی کہ قیصر الجعفری کے نام کے ساتھ الہ آبادی لکھا جائے۔ پرویز شہریار نے قیصر الجعفری کی شاعری کے حوالے سے کہا کہ ان کی شاعری میں فکر کی مختلف لہریں موجود ہیں جن کا مشاہدہ کلیات قیصر کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے۔ اس موقع پر سلیم انصاری جبلپور، ایم نصر اللہ نصر کلکتہ، قاسم انصاری بنارس، ریحان اختر قاسمی علی گڑھ، مظہر عالم مظاہری جالندھر، خورشید حیات نوئڈا، کے پی شمس الدین کیرالہ وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ اس موقع پر کلیات قیصر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ قیصر الجعفری کے فرزند اور معروف شاعر عرفان جعفری نے سمینار کے انعقاد پر ادب سلسلہ کی ٹیم اور بالخصوص سلیم انصاری کا شکریہ ادا کیا اور اس موقع کو اپنے لیے ایک جذباتی لمحہ قرار دیا۔ اس نشست کی نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں استاد ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔ جبکہ سمینار کے کنوینر اور ادب سلسلہ کے مدیر سلیم انصاری علیگ نے سمینار کی غرض و غایت اور ادب سلسلہ کی اشاعت اور معاونین کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر سال 2022-2023 کا 'مشرف عالم ذوقی قومی ایوارڈ برائے' اردو تنقید پروفیسر آفتاب احمد آفاقی صاحب کو، پروفیسر صالحہ رشید صاحبہ کو خواتین زمرہ میں ادبی خدمات، پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کو لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ، سہیل انجم صاحب کو صحافت، ڈاکٹر پرویز شہریار صاحب کو افسانہ نگاری، مشتاق احمد نوری صاحب کو لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ، ڈاکٹر سید احمد قادری صاحب کو مجموعی ادبی خدمات، زبیر الحسن غافل صاحب کو شاعری، مظہر عالم مظاہری صاحب کو پنجاب میں صحافت، ایم نصر اللہ نصر کو مغربی بنگال میں ادبی خدمات، ڈاکٹر جاوید حسن صاحب کو اردو ڈرامہ، کے پی شمس الدین صاحب کو کیرالہ میں اردو ادبی خدمات، غلام نبی کمار کو جموں و کشمیر میں اردو ادبی خدمات پر ایوارڈ، ادب سلسلہ کے مدیر محمد سلیم علیگ اور مدیر اعلیٰ ڈاکٹر تنویر فریدی علیگ نے پیش کیا۔ سمینار کے بعد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت خان رضوان خان نے کی۔ ادب سلسلہ کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر تنویر فریدی نے مقالہ نگاروں اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے شرکا میں فاضل انصاری ممبئی، مشتاق احمد نوری، عرفان جونپوری، پروفیسر علی احمد فاطمی وغیرہ قابل ذکر شخصیات بھی موجود تھیں۔

پریس ریلیز: محمد سلیم علیگ، 1 دسمبر 2023

سنسکرت متون کا فارسی ترجمہ

علی گڑھ: مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'سنسکرت متون کا فارسی ترجمہ اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر اس کے اثرات' کا افتتاحی اجلاس سرسید اکیڈمی میں منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کی۔ پروفیسر محمد عثمان غنی نے سمینار کے موضوع کو متعارف کراتے ہوئے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ اسی دوران ایران اور ہندوستان کے قدیم روابط اور ترجمہ نگاری کی تاریخ بیان کی۔ اس ضمن میں متعدد سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم کا ذکر کیا جن میں کلیلہ و دمنہ، طوطی نامہ، مہابھارت، رامائن اور کئی دیگر کتابوں کے حوالے دیے۔ انھوں نے ہندوستان میں ترجمہ نگاری کے سلسلے میں عہد اکبری کا عہد زریں کہہ کر یاد کیا۔ ایران کلچرل کاؤنسلر فریدالدین فرید عصر نے اپنے خطاب میں فن ترجمہ اور خصوصاً سنسکرت متون کے فارسی ترجمے کے سلسلے میں کہا کہ ہندوستان کے علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی اثاثے کو دنیا بھر میں متعارف کرانے میں ایران کو فخر حاصل ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کلیلہ و دمنہ کی علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ یہ کتاب آج دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہے لیکن سب سے پہلے ایرانیوں نے ہی اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کی ہمہ جہت خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگرچہ ان کتابوں میں جانوروں کے ذریعے علمی گفتگو ہوئی ہے لیکن یہ واحد کتاب ہے جس کا مطالعہ علوم سیاسی و اخلاقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ پروفیسر سراج الاسلام نے اپنے کلیدی خطبے میں مختلف مذاہب کی تاریخ، ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، ہندوستان اور ایران کے روابط اور

فارسی ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فارسی ادب کو دنیا کا ثروت مند ادب قرار دیا۔ مرکز تحقیقات فارسی دہلی کے ڈائرکٹر قہرمان سلیمانی نے اپنے خطاب میں کلیلہ ودمنہ کے متعدد تراجم کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ علمی سرمائے کو دنیا میں متعارف کرانے میں سب سے پہلے ایرانیوں نے حصہ لیا۔ اسی دوران انھوں نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ترجمہ نگاری کے لیے یہ کتاب ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے پر بھی ایران کے فارسی طلبا، اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں جبکہ ہندوستانی اس قیمتی اثاثے کو فراموش کر بیٹھے ہیں یہ کتاب کئی موضوعات کا مجموعہ ہے۔ اس عطیہ کے لیے ایران ہمیشہ ہندوستان کا ممنون ومشکور رہے گا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 نومبر 2023

تلنگانہ

مخطوطہ شناسی پر ورکشاپ

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ فارسی و مطالعاتِ وسط ایشیا کے زیراہتمام نور انٹرنیشنل میکروفلم سنٹر اور اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،

حکومت تلنگانہ کے اشتراک سے 'مخطوطہ شناسی شرقیہ' کے زیرعنوان ایک سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کا افتتاحی اجلاس 15 نومبر کو کانفرنس ہال، اسکول آف لینگویجز میں منعقد ہوا۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ شہر حیدرآباد مخطوطات کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ مخطوطات ہماری علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی میراث ہیں۔ ان کا تحفظ ہمارا علمی فریضہ ہے۔ یہ ورکشاپ اسی کی ایک کڑی ہے۔ ایرانی فنون لطیفہ کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان میں سے ایک خطاطی وخوشنویسی ہے جس میں اہل ایران نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ سیدہ عصمت جہاں صدر شعبہ فارسی و کنوینر ورکشاپ نے خیر مقدمی کلمات کہے۔ پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول آف لینگویجز نے ورکشاپ کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ آقائی علی اکبر نیرومند، ریجنل ڈائرکٹر، نور انٹرنیشنل مائکروفلم ومہمان اعزازی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نور انٹرنیشنل فلم سنٹر نے اب تک پندرہ لاکھ مخطوطات کو ڈیجیٹلائز کرتے ہوئے انھیں نئی زندگی دی ہے اور انھیں آنے والے تقریباً 200 برسوں تک کے لیے قابل استفادہ بنایا ہے اور یہ کام بڑی تیزی سے جاری ہے۔ ایران سے تشریف لائے استاد معروف مخطوطہ شناس، ماہر خط شکستہ وخط سیاق آقائی دکتر اسداللہ عبدلی آشتیانی، پروفیسر نسیم الدین فریس، ماہر دکنیات و سابق، ڈین اسکول آف لینگویجز، ڈاکٹر عبدالغنی اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ فارسی و مطالعات وسط ایشیا نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ ڈاکٹر قیصر احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ 16 نومبر کو مخطوطہ کے مختلف اقسام، خطوط کی شناخت کی مشق کرائی گئی۔ اُس دن تین مخطوطے Decippher کیے گئے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار نے کی۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر سباراؤ، ڈائرکٹر اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حکومت تلنگانہ نے اپنے خطاب میں طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے یہاں جو کچھ سیکھا ہے وہ آپ کے سفر کا آغاز ہے اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری میں سیکڑوں فارسی، عربی اور اردو کے مخطوطے آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔ پروفیسر عزیز بانو، ڈائرکٹر، ورکشاپ نے رپورٹ پیش کی۔ طلبہ نے ورکشاپ سے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے۔ ورکشاپ کے تمام اساتذہ نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر ایم ڈی رضوان، اسسٹنٹ پروفیسر نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور ہدیہ تشکر پیش کیا۔ ورکشاپ کے لیے 150 طلبہ نے درخواستیں دی تھیں جن میں سے 53 منتخب کیے گئے۔ طلبہ کو سرٹیفکیٹ بھی دیے گئے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 نومبر 2023

دکن میں قوالی کی روایت

حیدرآباد: صوفیائے کرام کے نزدیک سماع کی محفل میں شرکت کے لیے طلب، عشق، معرفت، فنا، توحید، حیرت اور فکر وفنا جیسی خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ اگر یہ صفات وخصوصیات کسی شخص کے اندر ہوں گی تب ہی وہ محفل سماع میں شریک ہوسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عزیز الدین حسین، سابق ڈائرکٹر رضا لائبریری رامپور نے مرکز مطالعات اردو ثقافت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقدہ ایک روزہ سمپوزیم بعنوان 'دکن میں قوالی کی روایت اور معنویت' میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ میں برسوں سے یہ روایت رہی کہ سماع کی محفل میں جو شخص جس جگہ بیٹھ جائے سماع کے آخر تک نہ اٹھے اور نہ ہی وہ اپنی نشست کا طریقہ بدلے۔ انھوں نے شیخ سعدی، مولانا روم اور خسرو کے اقوال بھی پیش کیے جن میں قوالی کی معنویت کا ذکر موجود ہے۔ مہمان مقرر پروفیسر نسیم الدین فریس، سابق ڈین اسکول آف لینگویجز مانو نے اس موقعے پر ہندوستان میں قوالی کی روایت پر مفصل روشنی ڈالی اور کہا کہ قوالی سے قبل صوفیا کے یہاں سماع کی روایت تھی۔ قوالی ہندوستان کی ایجاد ہے اور امیر خسرو کو اس کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ سلسلۂ قادریہ، شطاریہ اور خصوصاً چشتیہ سلسلے میں قوالی کو جائز قرار دیا گیا۔ دکن میں صوفی برہان الدین سماع کے بہت شوقین تھے، سماع سنتے ہی وہ وجد میں آجاتے تھے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی قوالی سنا کرتے تھے اور آپ سماع میں عود جلایا کرتے تھے۔ بندہ نواز کا دکن میں سماع کو فروغ دینے میں اہم رول رہا ہے۔ مہمان خصوصی ویونیسکو کے سابق ڈائرکٹر، اصغر حسین نے اپنے خیالات کا ظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے پنڈت روی شنکر سے امریکہ میں ملاقات کی تھی، ان سے گفتگو کے دوران قوالی کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے سہ تار لکھی اور ہم نے ستار بنا لیے۔ اس موقعے پر سمپوزیم کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شگفتہ شاہین، اوایس ڈی 1 نے کہا کہ جب مہمان مقررین مخاطب تھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ سامعین پر روحانی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ اسے میں سمپوزیم کی کامیابی کی علامت تصور کرتی ہوں۔ پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، ڈائرکٹر مرکز مطالعات ثقافت مانو نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور پروگرام کی نظامت کا فریضہ انجام دیا۔ ڈاکٹر احمد خان، ایسوسی ایٹ پروفیسر سی یو سی ایس مانو نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 نومبر 2023

مولانا آزاد یادگاری خطبہ

حیدر آباد: طلبہ برادری اور محققین کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ملک کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے کام کریں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سبھاش سرکار مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم نے کیا۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں یوم آزاد تقاریب کے مرکزی پروگرام میں بحیثیت مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ اس پروگرام کی پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ ڈاکٹر سبھاش سرکار نے مولانا آزاد کا تاریخی قول دہرایا کہ ''اگر تم صرف اپنے لیے زندہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی قوم کے لیے زندہ لاش ہو۔'' انھوں نے طلبہ برادری پر زور دیا کہ وہ اس بات کا عہد کریں کہ ہم زندہ لاش بن کر نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے انسان ہونے کا ثبوت پیش کریں گے۔ مولانا آزاد کو ہندوستان کی مثالی شخصیت قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر سبھاش سرکار نے کہا کہ آزاد ہندوستان کا مضبوط تعلیمی ڈھانچہ استوار کرنے میں مولانا کی خدمت کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے مطابق ہندوستان میں آئی آئی ٹی جیسے اداروں سے لے کر یو جی سی، اے آئی سی ٹی ای کی تشکیل و آغاز مولانا کی ہی مرہون منت ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کا شمار ایسے مفکروں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے تعلیم کو عام کرتے ہوئے سماج میں سبھی کے لیے مساویانہ ترقی کو یقینی بننے کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ڈاکٹر سبھاش سرکار نے مزید کہا کہ ملک وقوم کی تعلیمی ترقی کے لیے مولانا آزاد کا جو نظریہ تھا آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ان کے خوابوں کی عملی تفسیر بن چکی ہے۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اردو یونیورسٹی اردو زبان میں ہزاروں طلبہ کی علمی پیاس کو بجھانے کے لیے ملک کے طول وعرض میں روایاتی اور فاصلاتی ہر دو طرح کے ذرائع کو بروئے کار لارہی ہے۔ یہ یونیورسٹی مولانا آزاد کے افکار ونظریات کی مشعل بردار ہے۔

مرکزی وزیر نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ یہ وزیر اعظم مودی کی نئی تعلیمی پالیسی کا مقصد بھی توانائی سے بھرپور نوجوان نسل کی تربیت مقصود ہے۔ ساتھ ہی ہندوستانی زبانوں کا فروغ بھی حکومت کی ترجیح ہے اور نئی قومی تعلیمی پالیسی، مادری زبان میں تعلیم کی وکالت کرتی ہے۔ قبل ازیں

یوم آزاد تقاریب کے مرکزی پروگرام کا آغاز وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن کی خیر مقدمی تقریر سے ہوا۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 نومبر 2023

جموں و کشمیر

یوم آزاد تقریبات

سری نگر: آرٹس اینڈ سائنس کالج (مانو) سرینگر کے زیراہتمام پانچ روزہ یوم آزاد تقریبات اختتام پذیر ہوگئیں۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر غضنفر علی خاں کی رہنمائی میں یوم آزاد تقریبات کے تحت منعقد اس پروگرام میں کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ملک کی آزادی کے لیے کی گئی کوششوں اور اس راہ کی دشواریوں وصعوبتوں کو یاد کیا۔ یوم آزاد تقریبات کے تحت تحریری، تقریری، کوئز، نعت خوانی، قرأت اور کھیل کود مقابلے منعقد کیے گئے جس میں طلبہ و طالبات نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مقابلوں میں حصہ لینے والے طلبہ وطالبات میں اول، دوم، اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والوں کو انعامات واسناد سے نوازا گیا۔ جشن آزاد کا اختتام پروفیسر غضنفر علی خاں کے صدارتی پیغام اور ثقافتی پروگرام سے ہوا جس میں مانو ترانہ، راشٹر یہ گان، غزل، کشمیری لوک گیت، قوالی، نغمے اور طلبہ و طالبات نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر نسیم اختر کے یوم آزاد تقریبات کے تحت منعقد اس مقابلے میں جن طلبہ وطالبات نے حصہ لیا اور اول، دوم، سوم انعامات حاصل کیے، ان کی صلاحیتوں کو سراہا اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پروفیسر غضنفر علی خاں نے اپنے صدارتی پیغام میں کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد تاریخ ہند کی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے قید و بند اور دار ورسن کی آزمائشوں وصعوبتوں میں زندگی گزارتے ہوئے اپنی قوم کی فکری قیادت کی ہے۔ سرسید نے مسلم طبقے کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور مذہب کا رشتہ عصری زندگی سے استوار کرنے پر زور دیا، تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے اس مشن کو فروغ دیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں اس خاص دن کے لیے آپ تمام طلبہ وطالبات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس پروگرام کے آرگنائزر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے خاتمے کا اعلان کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2023

مہاراشٹر

ابوالکلام آزاد کی تعلیمی خدمات

شولاپور: پنیہ شلوک اہلیہ دیوی ہولکر سولاپور یونیورسٹی شعبہ اردو کے زیراہتمام 11 نومبر 2023 کو قومی یوم تعلیم کے موقعے پر نیشنل ویبینار بہ عنوان مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیمی خدمات کا انعقاد کیا گیا۔ یہ ویبینار بھاشہ سنکل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کیدارناتھ کانونے کی صدارت میں عمل میں آیا۔ شعبہ اردو کی پروفیسر ڈاکٹر عائشہ پٹھان نے مہمان خصوصی ڈاکٹر عائشہ رنگریز اور تمام شرکا کا استقبال کیا۔ پروگرام کی مقرر خاص ڈاکٹر عائشہ رنگریز نے اپنی تقریر میں مولانا ابوالکلام آزا دکی تعلیمی خدمات اور ان کی شخصیت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم ہیں اور تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ 11 نومبر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت کے موقعے پر ہندوستان میں قومی یوم تعلیم منایا جاتا ہے۔ اس پروگرام میں شعبہ اردو کے طلبا و طالبات، ریسرچ اسکالرس اسکول آف لینگویجز اینڈ لٹریچر کے اساتذہ ڈاکٹر ودیا، ڈاکٹر تڈول، پروفیسر ودیا کاڑے اور شولاپور کے سماجی اداروں کی دیگر اہم شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ڈاکٹر عائشہ پٹھان نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شعبہ اردو کی پروفیسر ڈاکٹر سمیہ باغبان نے رسم شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'تاثیر' دہلی، 24 نومبر 2023

مصنف سے ملیے

اورنگ آباد: زبان کا زوال یہ زبان کا زوال نہیں، بلکہ اس زبان کے بولنے والوں کا زوال ہے۔ زبان ایک خیال اور بے جان چیز ہے، یہ اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب اس میں انسانوں کی ضروریات پوری کرنے کی

طاقت ہو۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر عابد معز نے کیا۔ ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کے مقبول پروگرام 'مصنف سے ملیے' میں بات کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اردو کی کتابیں چھپتی ہیں اور پھر چھپ جاتی ہیں، لیکن اورنگ آباد شہر اردو زبان کا گہوارہ ہے۔ یہاں اردو کے بہت سے اسکول ہیں، یہاں کتابوں اور اردو رسالوں کی اچھی مانگ ہے، یہاں بہت سے بڑے شاعر گزرے ہیں اور آج بھی یہاں اچھے شاعر موجود ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے حیدرآباد کے سینئر اردو ادبا کا خیرمقدم کرتے ہوئے اوران کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عابد معز ایک معروف ادیب اور ڈاکٹر ہیں جنھوں نے 36 سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ دوسرے مہمان محمود شاہد اردو کے ماہنامہ 'افسانہ نما' کے مدیر اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ آرکیٹیکٹ محمد عبدالرحمٰن سلیم جو کہ امریکہ میں رہتے ہیں اور حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں، اردو کے شاعر اور ادیب ہیں وہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ بزم میزان ادب کے صدر ڈاکٹر اشفاق احمد نے گلدستہ دے کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروگرام کی صدارت اردو کے سینئر استاد احمد اقبال نے فرمائی، انھوں نے اپنے خطاب میں ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے معاشرے اور طلبا میں زبانوں سے دلچسپی پیدا کرنے کے کاموں کا ذکر کیا اور کہا کہ حیدرآباد میں بھی ایسی کوششیں ہونی چاہئیں۔ مذاکرے میں آرکیٹیکٹ سلطان وسیم خان، امان اللہ موتی والا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خان جمیل احمد معز ہاشمی نے بھی شرکت کی۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز، ممبئی کے طالب علم مرزا ابوالحسن علی نے نوجوانوں کی ذہنی حالت اور مسائل پر تفصیلی گفتگو کی اور پروگرام کی نظامت بھی کی۔ پروگرام کے بعد تمام مہمانوں نے مریم مرزا کی باغیچی پورہ میں قائم ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام محلّہ لائبریری کا دورہ کیا جہاں مریم مرزا نے تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہا مہمانوں نے مریم مرزا کی محلّہ لائبریری تحریک کو خوب سراہتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے علاقے میں اس طرح کی تحریک شروع کریں گے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 20 نومبر 2023

اعزاز و اکرام

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اردو کے ممتاز ادیب و نقاد اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت سابق نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری نے کی۔ انھوں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ پروفیسر قدوائی کا خاندانی پس منظر بہت اعلیٰ ہے۔ ان کے خانوادے نے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ ان کے خانوادے میں دانشوری کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ پروفیسر قدوائی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا اور ان کے شایان شان کتاب شائع کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے بطور مہمان خصوصی کہا کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ادب کو دیکھنے کا جو زاویہ اختیار کیا اس کی کاپی نہیں کی جاسکتی، ان کا اسلوب نہایت منفرد و شفاف ہے۔ انھوں نے ہر زاویے اور نظریے کو اپنی شرطوں پر دیکھا اور قبول یا رد کیا ہے۔ پروفیسر ہربنس مکھیا نے کہا کہ پروفیسر قدوائی سے میرا پرانا تعلق ہے اور وہ ان لوگوں میں بالکل نہیں ہیں جو مصلحت کے حساب سے اپنے نظریات روز تبدیل کرتے ہیں۔ ان کی تنقید سماج اور انسانی تعلق کو واضح کرتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ پروفیسر قدوائی کی شخصیت ایسی ہے جسے علم نے حلم کی توفیق عطا کی ہے۔ انھوں نے علم کو اسلحہ بنایا، نہ اس کی تشہیر کی، نہ تحسین و توصیف کی کسی سے امید رکھی اور نہ انعام واکرام کے لیے کوشش کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر احمد محفوظ اور پروفیسر سرور الہدیٰ نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر سابق نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں کتاب 'پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ادیب و دانشور' کی رسم رونمائی عمل میں آئی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پروفیسر قدوائی کی خدمت میں سپاس نامہ، شال، مومنٹو اور پچاس ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 6 نومبر 2023

تقسیم 'ایوارڈ برائے ادب اطفال'

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے تقسیم 'ایوارڈ برائے ادب اطفال' کی تقریب ترویني آڈیٹوریم، تانسین مارگ میں منعقد ہوئی جس میں 23 ہندوستانی زبانوں کے بچوں کے ادبا کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر مادھو کوشک نے سبھی انعام یافتگان کو ایوارڈ پیش کیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر نامور انگریزی ادیب اور اسکالر ہریش ترویدی نے شرکت کی، ساہتیہ اکادمی کی نائب صدر کمود شرما نے اختتامی خطاب

کیا۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سرینواس راؤ نے مہمانان کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کا ادب ہماری تہذیب کی بنیاد رہا ہے اور ہر معاشرے کو اس کی ضرورت ہے۔ بچوں کی کتابیں بچوں کو مستقبل کا باشعور شہری بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ہمیں اسے سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ مہمان خصوصی ہریش ترویدی نے کہا کہ قدیم زمانے میں دادا دادی کہانیاں سناتے تھے، جواب علیحدہ خاندان کی وجہ سے ختم ہوگئی ہیں۔ اس لیے اب بچوں کی کتابوں کا کردار زیادہ اہم ہے۔ ہندوستانی کہانی سنانے کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس میں پڑھنے اور سننے والے کے درمیان ایک مکالمہ قائم ہوتا ہے جس میں بچوں کے مطابق بہت سی تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ یہ علم سکھانے کی بہت اچھی روایت تھی۔ انھوں نے بچوں کی تین خصوصیات معصومیت، تجسس اور تخیل کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں ان خصوصیات کو زیادہ سے زیادہ برقرار رکھنا چاہیے۔ ساہتیہ اکادمی کی نائب صدر کمود شرما نے اختتامی بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے لسانی تنوع نے متنوع رنگوں اور تخلیقی صلاحیتوں کے ادب کو منفرد انداز میں ممکن بنایا ہے۔ بچوں کے تمام مصنفین اس اہم ذمے داری کے لیے تعریف کے مستحق ہیں جو انھوں نے بچوں کی معصومیت کے تحفظ کے لیے اٹھائی ہے۔ جن ادبا کو ایوارڈ برائے ادب و اطفال 2023 پیش کیا گیا ان میں رتیندر ناتھ گوسوامی (آسامی)، شیاملکانتی داش (بنگالی)، پرتیما نندی نارجاری (بوڈو)، بلوان سنگھ جموڑیا (ڈوگری)، سودھا مورتی (انگریزی)، رکشا بھین (گجراتی)، سوریہ ناتھ سنگھ (ہندی)، وجے شری ہلاڈی (کنڑ)، تو کارام راما شیٹ (کونکنی)، اکشے آنندسنی (میتھلی)، پریا اے ایس

(ملیالم)، دلیپ نانماتھم (منی پوری)، ایکناتھ اوہاد (مراٹھی)، مدھوسودن بشت (نیپالی)، جگل کشور شادنگی (اوڈیا)، گرمیتکڑ یالوی (پنجابی)، کرن بادل (راجستھانی)، رادھاولبھ ترپاٹھی (سنسکرت)، مان سنگھ ماجھی (سنتالی)، ڈھولن راہی (سندھی) کے ادے شنکر (تمل)، ڈی کے چدوول بابو (تیلگو) اور مرحوم متین اچل پوری (اردو) کے نام قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ'انقلاب' دہلی، 11 نومبر 2023

اجرا

ابر نو بہار

حیدرآباد: شاعری کا راست تعلق انسانی جذبات سے ہے، ایک حساس شاعر کبھی بھی اپنے ماحول اور اپنے سماج سے نظریں نہیں چرا سکتا، خاص طور سے اگر وہ شاعر ایک قانون داں بھی ہو اور منصفی کے منصب کی اہمیت کو سمجھتا ہو۔ ایک ایسے ہی صاحب نظر شاعر حسان عمر احسن قادری ہیں جن کی غزلوں اور نظموں کے جمالیاتی کینوس پر عصری منظر ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، ان خیالات کا اظہار ممتاز کہنہ مشق شاعر و ادیب ڈاکٹر محسن جلگانوی نے اردو مسکن خلوت حیدرآباد میں منعقدہ ممتاز سینئر شاعر ایڈوکیٹ حسان عمر قادری احسن کے چوتھے مجموعہ کلام 'ابر نو بہار' کی رسم اجرا تقریب میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا، نامور شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی جناب سردار سلیم نے کتاب کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کہا کہ شاعری ہمیشہ تغیر پسندی کے سہارے ترقی کرتی ہے کیونکہ تغیر ہی زندہ رہتا ہے، غم جاناں اور غم دوراں کی ہم آہنگی سے حسان عمر احسن نے رومانی اور انقلابی اسلوب کو یکجا کر کے شاعری کے حسن کو نکھارا ہے، مخدوم ایوارڈ یافتہ ممتاز شاعر ڈاکٹر فاروق شکیل نے جامع مضمون پیش کرتے ہوئے کہا کہ مشق و مزاولت کے دشوار گزار راستوں پر تخلیقی سفر کرنا سب کے بس کی بات نہیں، حسان عمر احسن اپنے وجدان کے ذریعے اس مشکل راستے پر آسانی سے چلے اور ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنے لیے جگہ بنائی، ڈاکٹر جاوید کمال نے شگفتہ اسلوب میں مضمون سنایا اور صاحب کتاب کے منتخب اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فن پارے دل پر اثر کرتے ہیں، انھوں نے اقبال اور دیگر متقدمین کے اشعار اور نظموں کا حوالہ بھی دیا جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ شاعر و صحافی محبوب خان اصغر نے اپنے مضمون میں یہ اظہار کیا کہ حسان عمر احسن جدت پسند شاعر ہونے کے باوجود روایات کی جڑوں سے جڑے ہوئے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کو بڑی خوبصوتی اور سچائی کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں، جناب افضل عارفی نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے حسان عمر احسن کے شخصی محاسن پر روشنی ڈالی، نور الدین امیر نے منظوم تہنیت پیش کی جسے بہت پسند کیا گیا، ممتاز مزاحیہ شاعر لطیف الدین لطیف نے موثر انداز میں خوش اسلوبی کے ساتھ نظامت کے فرائض انجام دیے، انجمن فیضان اردو کی جانب سے تمام مہمانوں کی گلپوشی و شال پوشی کی گئی، حسان عمر احسن نے سلجھے ہوئے سنجیدہ انداز میں اپنے تخلیقی سفر کی روداد بیان کی اور دانشوران ادب کو خراج پیش کیا، آخر میں سردار سلیم کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا، شکیل حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 نومبر 2023

ذکر رضوان اللہ

نئی دھلی: اوکھلا پریس کلب کے زیر اہتمام تسمیہ آڈیٹوریم اوکھلا میں منعقدہ تقریب رونمائی میں بزرگ صحافی رضوان اللہ کی صحافتی و ادبی خدمات پر مبنی کتاب 'ذکر رضوان اللہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب ان کی دختر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں استاد ڈاکٹر زہرہ خاتون اور معروف صحافی سہیل انجم نے مشترکہ طور پر ترتیب دی ہے۔ ڈاکٹر سید فاروق کے زیر صدارت منعقدہ تقریب کے مہمان خصوصی ہفت روزہ 'ملی گزٹ' کے ایڈیٹر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے رضوان اللہ سے اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ مراسم کو یاد کرتے ہوئے انھیں ایک جرأت مند صحافی قرار دیا۔ ناسازی طبع کی وجہ سے وہ تقریب میں شریک نہیں ہو سکے تاہم انھوں نے ہسپتال سے اپنے پیغام میں کہا کہ رضوان اللہ بیباک صحافی اور کھرے انسان تھے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے ڈاکٹر زہرہ خاتون کو کتاب کی ترتیب پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اولاد کو اپنے والدین کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ان کے حق میں دعائیں کرتے رہنا چاہیے۔ مہمان اعزازی پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے رضوان اللہ کی یاد میں کتاب خوانی کی تحریک شروع کرنے پر زور دیا اور اوکھلا پریس کلب سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں پہل کرے۔ ڈاکٹر زہرہ خاتون نے اپنے والد کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ پرفیسر محسن عثمانی کی توجہ دہانی پر مرحوم کا فارسی کلام کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے کتاب کی تیاری میں معاونین کا شکریہ ادا کیا۔ معروف ادیب و نقاد حقانی القاسمی نے رضوان اللہ کی ادبی وصحافتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے خاص طور پر ان کی فارسی شاعری کا ذکر کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ان کی حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جانے چاہئیں۔ پروفیسر کلیم اصغر، صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اعلان کیا کہ وہ رضوان اللہ کی فارسی شاعری پر فارسی میں مضمون لکھ کر کسی معیاری رسالے میں شائع کروائیں گے۔ پروفیسر سلیم قدوائی نے رضوان اللہ سے اپنے ذاتی مراسم کو یاد کرتے ہوئے ان کی صحافتی و ادبی خدمات کو اجاگر کرنے پر زور دیا۔ معروف داستان گو محمود فاروقی نے جو کہ رشتے میں رضوان اللہ کے پوتے ہوتے ہیں، کہا کہ رضوان دادا ان لوگوں کے بزرگ دوست تھے۔ ان کی خودنوشت 'اوراق ہستی' پر شمس الرحمٰن فاروقی پیش لفظ لکھنا چاہتے تھے لیکن اسی دوران وہ کورونا سے متاثر ہوئے اور پھر جاں بر نہ ہو سکے۔ یو این آئی اردو کے سابق ایڈیٹر عبدالسلام عاصم نے کلکتہ کی صحافت کے حوالے سے رضوان اللہ سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے شخصی اوصاف بیان کیے۔ پروگرام کے کنویز اور اوکھلا پریس کلب کے نائب صدر سہیل انجم نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اس میں دو قسم کے مضامین ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دوسروں نے ان کی صحافت، شاعری اور فن پر لکھے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو ان کے اعزا و اقربا نے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر تحریر کیے ہیں۔ کتاب کا یہ دوسرا حصہ حاصل کتاب ہے۔ انھوں نے مرحوم کی صحافتی و ادبی حیثیت پر بھی گفتگو کی۔ اوکھلا پریس کلب کے صدر ایم اطہر الدین منے بھارتی دفتری مصروفیت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اوکھلا پریس کلب کے سینئر جنرل سکریٹری ڈاکٹر مظفر حسین غزالی نے پروگرام کا تعارف پیش کیا اور اوکھلا پریس کلب کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں رضوان اللہ کے اعزا و اقربا کے علاوہ بڑی تعداد میں صحافیوں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ روزنامہ'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2023

جنتیں مشتاق ہیں

لکھنؤ: آج ادارہ علم و ادب کے صدر ڈاکٹر شیدا اعظمی کے مجموعۂ سلام جنتیں مشتاق ہیں کا اجرا بدست تورج زیدی، چیئرمین فخرالدین علی احمد کمیٹی اور مہمان خصوصی

ڈاکٹر وجاہت حسین رضوی سابق ایڈیٹر نیا دور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت انا اعظمی، مہمانوں کا استقبال ڈاکٹر ثروت تقی جوائنٹ سکریٹری ادارہ ہذا اور اظہار تشکر ڈاکٹر شیدا اعظمی کے ذریعے ہوا۔ مذکورہ پروگرام علی رضا باقر کے مکان احاطہ مرزا علی خاں میں منعقد ہوا۔ خطبہ صدارت تورج زیدی نے دیا۔ ان کے علاوہ مولانا حیدر عباس، ڈاکٹر وجاہت حسین رضوی اور قمر احسن صاحب نے تقریر کی۔ جرار اکبرآبادی اور ڈاکٹر محمود محمد آبادی نے سلام پڑھا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 28 نومبر 2023

آرزوئے نجات

امروهه: اظہر عنایتی رامپوری کی شاعری میں عجیب قسم کا تقدس اور طہارت ہے جس کو بار بار پڑھنے سے ذہنی ادبی اور مذہبی سکون ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ گزشتہ پچاس برس سے ان کی ادبی فکر میں پرواز اور تقدس کا اضافہ ہوتا جارہا ہے، انھوں نے ہمیشہ اپنے کلام میں وضع داری اور اخلاص کو اول مقام عطا کیا ہے۔ ان کی فنی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے مزید کہا جاسکتا ہے کہ ادب عالیہ کی تخلیق اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کے پس پشت مذہبی اقدار نہ ہوں۔ ان خیالات کا اظہار ادبی تنظیم 'کاروان خلوص' کے زیراہتمام اظہر عنایتی رامپوری کی پانچویں تصنیف آرزوئے نجات کی رسم اجرا کے موقعے پر بولتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر رضا عباس نیر نے کیا۔ اس تقریب رسم اجرا میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کی کہکشاں اپنے جلوے بکھیر رہی تھی۔ جسٹس تنویر وصفی کی صدارت میں منعقدہ اس تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر نیر نے مزید کہا کہ اظہر عنایتی جیسے لوگ کئی نسلوں کی آبیاری کرتے ہیں اور صدیوں تک یاد رکھے جاتے ہیں۔ اسلامی مفکر اور مبلغ سید عبداللہ طارق، معروف شاعر اور ناظم مشاعرہ منصور عثمانی، صاحب طرز شاعر عقیل نعمانی اور افسر سنبھلی اور شکیل غوث بھی موجود تھے۔ نظامت معروف شاعر پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ افسر سنبھلی نے اظہر عنایتی کی شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہوئے توصیفی کلام پیش کیا۔ عقیل نعمانی نے اپنے مخصوص انداز میں غزل پیش کی جب کہ منصور عثمانی نے اظہر عنایتی سے اپنے والد کے دیرینہ رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شعری خدمات پر روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ تنویر وصی نے بھی اظہر عنایتی سے اپنے تعلق بیان کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اترپردیش اردو ادب سوسائٹی کے صدر کوثر علی عباسی و جملہ اراکین نے اظہر عنایتی کو ردائے ادب پیش کیا۔ استقبالیہ کلمات ماہر قانون اسلام عالمی نے پیش کیے جب کہ صدر کاروان خلوص سید محبوب حسین زیدی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 نومبر 2023

ذکر تیرا بعد تیرے

نئی دهلی: وژڈم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور قندیل کے زیراہتمام محمد خورشید اکرم سوز اور نزہت جہاں قیصر کا

ان کے فرزند محمد شکیب اکرم کی وفات پر لکھی گئی تعزیتی تحریروں کا مجموعہ 'ذکر تیرا بعد تیرے' کی تقریب اجرا کا انعقاد افضل حسین آڈیٹوریم ابوالفضل انکلیوئی دہلی میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر تمام مقررین نے کتاب کے مشمولات کے حوالے سے پرمغز گفتگو کی اور شکیب اکرم کی یادوں کو تازہ کیا اور ان کے والدین کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔

عشرت ظہیر نے اس کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ 'ذکر تیرا بعد تیرے' دراصل محبت اور موت کی تفسیر، تعبیر اور تقدیر ہے۔ جناب عظیم اختر نے خورشید اکرم سوز کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے کہا کہ شکیب اکرم جیسے نوجوان کی موت پر سب سے بہترین خراج محبت یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی یاد میں غریب مستحق طالب علموں کو وظائف دیے جائیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ خورشید اکرم سوز نے کرناٹک سے اس سلسلے کا آغاز کر دیا ہے۔ مجلس صدارت کے اراکین میں جناب سلیم شیرازی اور ڈاکٹر فریاد آذر نے اظہار خیال کرتے ہوئے خورشید اکرم سوز کی یادوں کے کرب کو شیئر کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ حزن و غم کا یہ سلسلہ ہر انسانی وجود سے جڑا ہوا ہے، مگر ذاتی غم صرف اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب انسان خود اس کرب سے گزرتا ہے۔ خورشید حیات نے فلسفہ موت اور تصور الم پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کرب کو ایک اجتماعی المیہ سے تعبیر کیا۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور ڈاکٹر رخشندہ روحی نے کہا کہ یہ صرف ایک فرد کا درد نہیں، بلکہ ایک مشترکہ درد ہے جسے ہم سب اپنے سینے میں محسوس کرتے ہیں اور اس جیسی کیفیتوں سے اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ حقانی القاسمی نے کتاب کے حوالے سے کہا کہ یہ آنسوؤں کا اوڈی تاژ اور درد کا کولاژ ہے، شکیب اکرم کی موت صرف ایک بیٹے کی موت نہیں بلکہ ایک خواب، ایک آرزو اور ایک روشن مستقبل کی موت ہے۔ شاہد انور نے تعزیتی کلمات پیش کرتے ہوئے اپنی پرسوز تعزیتی نظم پیش کی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر احمد علی جوہر، ڈاکٹر سعود عالم، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر منظر امام، ڈاکٹر امیر حمزہ، ڈاکٹر جاوید عالم، ڈاکٹر شاداب شمیم، عبدالباری قاسمی، خوشبو پروین اور سعدیہ پروین نے اس کتاب کے تعلق سے بیش قیمت خیالات کا اظہار کیا اور شکیب اکرم کی زندگی پر اختصار سے روشنی ڈالی۔ تقریب اجرا کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید حسن نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ محترم فیروز ہاشمی اور تقریب کے کنوینر ڈاکٹر خان رضوان کے کلمات تشکر پر پروگرام کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، ڈاکٹر عبدالواحد، ابواللیث قاسمی، شاہ رخ خان عبیر، محمد زید خان، ساجد ندوی، نشاط حسن، محمد رضی، نوشاد عالم ندوی اور سلام الدین خان وغیرہ بطور خاص موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2023

گزرتے ہوئے

نئی دهلی: ڈاکٹر ارمیلا چاکورکر کی نئی مراٹھی کتاب پر ایک آن لائن مذاکرے کا انعقاد ہوا جس میں مراٹھی زبان کی کئی مشہور و معروف شخصیات نے اظہارِ خیال کیا۔

کتاب کا نام 'گزرتے ہوئے' ہے جو دراصل اردو ہندی کے منفرد شاعر و ادیب پروفیسر صادق کا مونوگراف یا زندگی نامہ ہے۔ ارملا چاکورکر میڈیکل پریکٹشنر ہیں اور مراٹھی میں کویتاؤں کے علاوہ سوانحی کتابیں لکھتی ہیں۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر پرمیلا ملکھیڈ کرنے کہا کہ صادق غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ایک منفرد فنکار ہیں جو ہندی اور اردو کے ساتھ ساتھ مراٹھی میں بھی اپنی ادبی شناخت رکھتے ہیں۔ مراٹھی کے کئی اہم شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم رہے ہیں۔ مراٹھواڑہ میں اپنے قیام کے دوران وہ نارائن سروے، نرہر کرندکر، چندرکانت پاٹل اور دتا بھگت وغیرہ کے قریبی دوستوں میں رہے ہیں۔ ڈاکٹر وندنا کلکرنی نے بتایا کہ صادق نے پاٹل جی کے ساتھ مل کر مراٹھی کے سرکردہ شاعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا اور 'نئی مراٹھی شاعری' نام سے ایک کتاب لکھی جو اردو حلقوں میں بے حد پسند کی گئی۔ راجندر بھوسلے نے فن ڈرامہ سے صادق کی خصوصی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے وجے تندولکر کے مشہور ناٹک 'کنیا دان' کے اردو ترجمے کا حوالہ دیا جو صادق نے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور جسے کے کے برلا فاؤنڈیشن نے شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر شروتی نے صدارتی خطبے میں صادق کی خداداد صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے مصوری اور فلم سازی سے متعلق ان کے کاموں کا ذکر کیا اور کہا کہ اردو شاعروں پر امیر خسرو سے لے کر اسرارالحق مجاز تک پر بنائی ہوئی ان کی ڈاکیومینٹری فلمیں آج بھی دلچسپی سے دیکھی جاتی ہیں اور یو ٹیوب پر موجود ہیں۔ نریندر کاٹیکر نے صادق کی مختلف سرگرمیوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے سفر زندگی کا مختصر جائزہ لیا جو اجین سے بمبئی، اورنگ آباد، ناندیڑ اور دہلی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس آن لائن مذاکرے کو دو ہزار سے زیادہ ادب دوستوں نے دیکھا اور پسند کیا۔ آخر میں صادق نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2023

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی حیات و خدمات پر مبنی کتابوں اور رسالوں کا اجرا

نئی دھلی: ہندوستانی زبانوں کے مرکز جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے زیر اہتمام اور ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے اشتراک سے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے ماریہ اسلم کی کتاب 'خواجہ محمد اکرام الدین: شخصیت اور ادبی خدمات' اور فریحہ انور کی کتاب 'خواجہ محمد اکرام الدین بحیثیت سفرنامہ نگار' کا اجرا عمل میں آیا اور ساتھ ہی ماہنامہ سبق اردو اور دبستان اردو فرینکفرٹ کے خصوصی شماروں کی رونمائی ہوئی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر پرویز اعظمی کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کنیڈا سے اپنا ویڈیو پیغام بھیج کر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی خدمات کے حوالے سے اعترافی کلمات پیش کیے اور ان کی قومی اور بین الاقوامی خدمات کو سراہا۔ پروفیسر الفت محبّ نے ازبیکستان میں اردو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کا نام ازبیکستان میں بہت احترام سے لیا جاتا ہے اور انھوں نے اردو تدریس کے حوالے سے وہاں بہت اہم کام کیا ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد (ایم ایل اے، بہار اسمبلی) نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ اکرام کے ساتھ چالیس سال پرانے رشتوں کو یاد کیا۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر خواجہ اکرام کی علمی وادبی خدمات کو سراہا۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے اپنی نظامت کے دوران پروفیسر خواجہ اکرام کے حوالے سے بہت سی یادوں کا ذکر کیا اور اپنے قلمی چہرے سے چند اقتباسات بھی پیش کیے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر نصیب علی اور ڈاکٹر رکن الدین نے انتظامی امور کو بحسن و خوبی انجام دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2023

جان شوریدہ

نئی دھلی: خوشبو پروین کی شاعری میں نسائیت کی بھینی بھینی خوشبو ہے اور ان کا شعری مجموعہ 'جان شوریدہ' نسائی

جذبات اور احساسات کا خوبصورت نگارخانہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار 'جان شوریدہ' کی تقریب اجرا میں مقررین نے کیا۔ تقریب کا اہتمام عبارت پبلی کیشنز کے سربراہ سلام الدین خان نے تسمیہ آڈیٹوریم اوکھلا میں کیا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا مہمانِ خصوصی تھیں، جب کہ مہمانان ذی وقار اور اعزازی کے طور پر جناب اعجاز انصاری، جناب حقانی القاسمی، جناب عشرت ظہیر، ڈاکٹر رخشندہ روحی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی مختصر مگر جامع گفتگو میں خوشبو پروین کو خوبصورت شاعری کے لیے مبارکباد پیش کی اور ان کی تخلیقی رعنائیوں کی ستائش کی۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے خوشبو کی شاعری کو متنوع رنگوں سے مملو قرار دیا۔ جناب اعجاز انصاری نے کہا کہ نسائی جذبات واحساسات کی کارفرمائیاں جن شاعرات کے یہاں ملتی ہیں اسی زنجیر کی ایک کڑی خوشبو پروین بھی ہیں۔ عشرت ظہیر نے جان شوریدہ کی غزلوں کو لطیف اور نازک احساس کا آئینہ قرار دیا۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی نے خوشبو پروین کو اپنی شاعری میں ہندی الفاظ کے برمحل استعمال کرنے پر داد و تحسین سے نوازا۔ شمع افروز زیدی نے 'جان شوریدہ' کو تازہ کار شاعرہ کی خوبصورت کاوش کہا۔ حقانی القاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خوشبو کی شاعری میں لبرل فیمنزم نہیں ہے، بلکہ 'جان شوریدہ' نسائیت کے جوہر سے مملو ہے۔ ان کی شاعری صارفیت، بازاریت اور Dependency syndrome کے خلاف ایک احتجاج بھی ہے۔ خورشید حیات نے کہا کہ خوشبو کے یہاں رومانی لہجے کے ساتھ ساتھ روحانی لہجہ بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر احمد علی جوہر نے خوشبو کی شاعری میں اس عہد کا کرب، تنہائی، بے خودی کو تلاش کیا۔ ڈاکٹر امیر حمزہ نے کہا کہ خوشبو نے اپنے تخلص کا استعمال بحسن و خوبی کیا ہے۔ معین شاداب نے خوشبو کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ خوشبو نے نسائی لہجے کو تلوار نہیں کیا ہے بلکہ نرم و نازک لہجہ اختیار کیا ہے۔ عبدالباری قاسمی نے کہا کہ خوشبو کے لہجے میں کچھ حد تک دلکنیت بھی ہے اور ان کی شاعری آج کی تازہ کار نسل سے تعلق رکھنے والی شاعرات میں ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ سعدیہ پروین نے خوشبو کی شاعری کو نسائی شاعری کی بہترین مثال قرار دیا اور فرقان عالم نے کہا کہ خوشبو نے شاعری کے ذریعے کینوس پر مختلف رنگ بکھیر دیے ہیں۔ ان کی شاعری میں کئی جہات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زیبا خان نے خوشبو پروین کی شاعری کو منفرد اور تخلیقی رنگ کا حامل قرار دیا۔ تقریب اجرا کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خان محمد رضوان نے ادا کیے اور ضیاء المصطفیٰ نے تمام

مہمانان اور حاضرین محفل کا شکریہ ادا کیا۔ مشہور آرتھوپیڈکس پروفیسر ایم فاروق اور پروفیسر افروز الحق کی موجودگی نے اس تقریب میں چار چاند لگا دیے۔

پریس ریلیز: خوشبو پروین، نئی دہلی، 5 دسمبر 2023

کلیاتِ ساغر

لکھنؤ: صوفی، بزرگ حضرت ساغر میاں کے شعری مجموعہ 'کلیاتِ ساغر' کی تقریب رونمائی شہر کے محلہ اشراف ٹولہ واقع ساغر میاں کی درگاہ پر ہوئی۔ منعقدہ تقریب میں اردو ادبا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شعری مجموعے کی رسم اجرا تقریب کی صدارت پروفیسر منظور احمد آئی پی ایس نے کی اور مہمان خصوصی محکمہ اطلاعات نشریات کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر حامد علی خاں اتر پردیش اردو اکیڈمی کے ڈاکٹر سعید احمد، نگر پالیکا چیئرمین محمد رئیس انصاری، سینئر ادیب ڈاکٹر محمد حنیف، اتر پردیش حج سیوا کمیٹی کے رکن عبدالخالق صدیقی، شہر قاضی سید محمد عارف عبداللہ، مشہور شاعر ساحل فیض آبادی، ہائی کورٹ کے وکیل ابھیشیک دکشت، مصنف/ پبلشر معز ساغری کے ذریعے کیا گیا۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی جانب سے حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہونے والے شعری مجموعے 'کلیات ساغر' کی رسم اجرا کی تقریب کے موقعے پر مصنف معز ساغری نے شعری مجموعے کی غزل ساغر تجھے ایک گوشۂ ویراں میں ملے گا، اے پوچھنے والے وہ بیاباں میں ملے گا۔ پڑھی اور کتاب میں شائع ہونے والے مضمون کی نعت غزل پر روشنی ڈالی۔ سابق ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل پولیس پروفیسر منظور احمد نے صدارتی خطاب کیا۔ پروگرام میں شعری مجموعے کے چند اشعار پڑھتے ہوئے اس کی اہمیت پر گفتگو کی اور اردو ادب اور شاعروں کو راستہ دکھانے والی مثال بتایا اور کہا کہ صوفیا کا پیغام ہمیشہ انسانیت سے محبت کا رہا ہے، یہی پیغام اس کتاب کے ذریعے بھی دیا گیا ہے۔ مہمان خصوصی سابق ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن حامد علی خان نے کہا کہ حضرت ساغر میاں کی غزلیں جہاں انسانی فکروں کا جال بنتی ہیں وہیں ان کی منقبت اور غزلیں محبت کا احساس دلاتی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 5 دسمبر 2023

وفیات

انور معظم

حیدرآباد: معروف شاعر، ادیب اور استاد پروفیسر انور معظم 25 نومبر حیدرآباد میں انتقال کرگئے۔ ان کی عمر 49 سال تھی۔ ان کا اصل نام انور علی خاں تھا اور وہ 1929 میں

مہاراشٹر کے اورنگ آباد ضلع میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اردو کی ممتاز افسانہ نگار پدم شری جیلانی بانو کے شوہر تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ان کا طالب علم اور استاد دونوں کا رشتہ تھا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ مطالعات اسلامی کے سابق سربراہ تھے۔ ان کی اولین کتاب 'آثار جمال الدین افغانی' 1956 میں علی گڑھ سے اس وقت شائع ہوئی تھی، جب وہ وہاں پی ایچ ڈی کے طالب علم تھے۔ بعد کو یہ کتاب انگریزی میں بھی شائع ہوئی۔ 2019 میں 'غالب کی فکری وابستگیاں' کے عنوان سے اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والی ان کی کتاب کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اردو ادب، اسلامیات اور مسلم معاشرے پر ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ شعر و شاعری کے میدان میں بھی وہ خاص شناخت رکھتے تھے۔ سبکدوشی کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی گزاری اور خود کو علمی و ادبی امور تک محدود رکھا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 26 نومبر 2023

شوکت علی خاں

ٹونک: عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک کے بانی ڈائریکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں طویل علالت

کے بعد 10 دسمبر جے پور کے ایک اسپتال میں انتقال کرگئے۔ ان کی عمر 85 برس تھی۔ وہ عربی فارسی اور اردو زبان کے جید عالم تھے۔ انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ٹونک کے عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ کو بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس ادارے کا آغاز انھوں نے ٹونک کی سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری کے زینے کے نیچے ایک چھوٹی سی جگہ پر ادارہ علوم شرقیہ کے نام سے کیا تھا جو ان کی بے پایاں کوششوں کے نتیجے میں آج بین الاقوامی سطح کا انسٹی ٹیوٹ ہے۔ انھوں نے متعدد عربی اور فارسی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ ایک علم دوست اور ادب نواز شخصیت تھے۔ انھیں فن خطاطی سے خاص شغف تھا۔ صاحبزادہ شوکت علی خاں کی اہم تصانیف میں 'اسلامی ہند میں فن خطاطی: امتیازات و خصوصیات' اور 'قصر علم ٹونک کے کتب خانے اور ان کے نوادر'، 'حضرت امیر خسرو اور ٹونک' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادارت میں مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، راجستھان کا ایک جرنل بھی شائع ہوتا تھا جس کے کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے جن میں صولت نمبر، پروفیسر محمود شیرانی، قابل ذکر ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 11 دسمبر 2023

اوم پرکاش سونی

نئی دہلی: بزرگ اردو صحافی اوم پرکاش سونی کا 22 نومبر 2023 کو 94 سال کی عمر میں امرتسر میں انتقال گیا۔ وہ اردو صحافت کا ایک معتبر نام ہیں جن کی اردو صحافت

سے طویل وابستگی رہی ہے۔ وہ 6 دسمبر 1929 کو گجرات، پاکستان میں پیدا ہوئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مضراب اور سوتنتر نام سے اخبارات جاری کیے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ ہندوستان آگئے اور امرتسر میں اقامت اختیار کی۔ یہیں سے انھوں نے پندرہ روزہ اخبار 'نئی لہر' کے نام سے اشاعت کا آغاز کیا۔ ماہنامہ 'پگڈنڈی'، ماہنامہ 'قانون'، 'ماہنامہ 'آیوروید سماچار' جیسے رسائل سے بھی وہ وابستہ رہے اور پھر روزنامہ 'ہند سماچار' کے شعبہ ادارت کا حصہ بن گئے۔ انھوں نے اردو صحافیوں پر مضامین تحریر کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور یہ دونوں کالم بہت مقبول تھے۔ انھوں نے رام سرن اثر کے ساتھ 'پنجاب میں اردو صحافت' کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی تھی۔ وہ نہایت متحرک اور فعال صحافی تھے۔ عمر کے آخری حصے تک قلم سے ان کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اوم پرکاش سونی نے پنجاب میں اردو صحافت کو زندہ رکھنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فیس بک اور سہیل انجم کے مضمون سے ماخوذ

بدنام نظر

نئی دھلی: 12 دسمبر 2023 کو رات تقریباً 3 بجے ممتاز و معروف بزرگ شاعر بدنام نظر اس جہان فانی سے رخصت

ہوگئے۔ ان کی عمر تقریباً 87 برس تھی۔ پسماندگان میں بیٹا ء النظر اور بیٹی روفی ہیں۔ ان کی تجہیز و تکفین ان کے آبائی گاؤں کنڈا ضلع ،شیخ پورہ، بہار میں عمل میں آئی۔

بدنام نظر مرحوم کے تین شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں جن میں تہی دست (نظموں کا مجموعہ، 1980)، نزول (غزلوں کا مجموعہ 2015) اور بارگراں (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ، 2017) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ وکیل اختر کی حیات وشاعری سے متعلق ان کی مرتب کردہ کتاب مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کولکاتا سے زیر طبع ہے۔ بدنام نظر اپنے تنقیدی مضامین پر مشتمل ایک کتاب بھی مرتب کر رہے تھے۔ ضلع گیا کے ایم ایل اے جے کمار پالت نے 1980 کے دہے میں اردو روزنامہ 'بہار ریویؤ' کی اشاعت بدنام نظر کی ادارت میں شروع کی تھی۔ یہ اخبار کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ بدنام نظر عہد شباب میں ادبی حلقوں میں بے حد متحرک اور فعال تھے۔ خوب لکھتے پڑھتے اور محفلوں کی جان بنے رہتے بالخصوص تحریری اور تقریری مباحثوں میں خوب دلچسپی لیتے۔ ان کے انتقال پر ادبا اور شعرا نے اپنے گہرے رنج والم کا اظہار کیا ہے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 12 دسمبر 2023

پروفیسر اصغر راز فاطمی

پورنیه: محقق، شاعر، افسانہ نگار، ویمنس کالج پورنیہ کے سابق صدر شعبۂ اردو اور

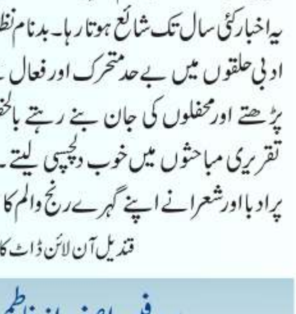

پورنیہ اردو سوسائٹی کے صدر پروفیسر اصغر راز فاطمی کا 14 دسمبر کی شب ساڑھے دس بجے انتقال ہوگیا۔ وہ کافی عرصے سے علیل تھے۔

پروفیسر اصغر راز فاطمی کی جائے پیدائش صاحب گنج، مظفر پور رہے۔ ان کے والد مولوی محمد عباس تھے اور والدہ کا نام سلمٰی خاتون ہے۔ پروفیسر اصغر راز فاطمی 9 فروری 1951 کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے پورنیہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پورنیہ کالج پورنیہ سے بی اے کیا۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم اے کرنے کے بعد دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر عتیق اللہ کی نگرانی میں ایم فل کا مقالہ لکھا۔ اس کے بعد وہ پورنیہ مہیلا کالج کے شعبۂ اردو سے 1976 سے فروری 2016 تک وابستہ رہے۔ پسماندگان میں شریک حیات بشریٰ سلطانہ کے علاوہ دو بیٹے امیر خسرو، امیر خوبرو اور ایک بیٹی امیر خوشبو ہے۔

اصغر راز فاطمی علمی اور ادبی طور پر بہت متحرک اور فعال تھے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ان کا شعری مجموعہ 'وانہیں ہے کوئی در'، 'غیاث احمد گدی: تخلیقی سیاق وسباق' قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر ایک تحقیقی تنقیدی کتاب ہے جس کے بارے میں ناقدین کا یہ خیال ہے کہ گدی شناسی کے باب میں ایک حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے کہ انھوں نے حاشیائی برادری کے ایک اہم فکشن نگار کو اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا اور نئی جہتوں کی جستجو کی۔ اس کتاب کا اجرا دہلی میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر کوثر مظہری، حقانی القاسمی اور دیگر قلمکاروں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اصغر راز فاطمی ہندی حلقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ دیوناگری رسم الخط میں بھی ان کا ایک مجموعہ 'چپ رہنا کیا جرم نہیں ہے' شائع ہوا تھا۔ ان کی غزلیں، افسانے اور نظمیں مختلف اخبارات و رسالے میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ شاعر (ممبئی)، فنکار (حیدرآباد)، مریخ (پٹنہ) صبح نو (پٹنہ)، روبی (نئی دہلی) میں ان کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ ہندی پتریکاؤں میں بھی ان کی نظموں اور غزلوں کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ پورنیہ کی پرتی نیدھی کویتائیں حصہ اول دوم میں بھی ان کا منتخب کلام شامل ہے۔ ان کی تدفین بعد نماز جمعہ پورنیہ کے مولوی باڑی قبرستان میں عمل میں آئی۔

احسان قاسمی، فیس بک اور دیگر ذرائع

ڈاکٹر امام اعظم

نئی دھلی: شاعر، ادیب، صحافی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائریکٹر (کولکاتا) ڈاکٹر امام اعظم کی حرکت قلب بند ہونے کے سبب رحلت فرما گئے۔ ان کا اصل نام سید اعجاز حسین تھا مگر ادبی وصحافتی حلقوں میں انھیں ڈاکٹر امام اعظم کے طور پر شناخت ملی، جو ان کا قلمی نام تھا۔

ڈاکٹر امام اعظم 20 جولائی 1960 کو محلّہ گنگوارہ دربھنگہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد ظفر المنان ظفر فاروقی ہے۔

انھوں نے پی ایچ ڈی کے علاوہ ڈی لٹ کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ وہ علمی اور ادبی سطح پر بہت ہی فعال اور متحرک تھے۔ ادبی تقریبات اور سمینار وغیرہ میں تسلسل کے ساتھ شرکت ہوا کرتی تھی۔ ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں دو شعری مجموعے: قربتوں کی دھوپ، نیلم کی آواز کے علاوہ مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ، عہد اسلامیہ میں دربھنگہ، مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری ژون، جیتھی آئی ہے، گیسوئے تحریر، ہندوستانی فلمیں اور اردو، عبدالغفور شہباز، مظہر امام، انساب وامصار (شمالی بہار کے گیارہ خانوادوں کی تفصیلات اور مختلف علاقوں پر مضامین)، یہی کولکاتا ہے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر کئی کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن میں ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی 'ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ'، ڈاکٹر سرور کریم کی 'امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات'، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی 'ڈاکٹر امام اعظم کی باز آفرینی'، ڈاکٹر خالد حسین خان کی 'جہان ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم' قابل ذکر ہیں۔ وہ ایک معتبر ادبی مجلّہ 'تمثیل نو' کے مدیر بھی تھے۔ یہ رسالہ ادبی اور علمی حلقوں میں بہت مقبول تھا۔ ڈاکٹر ابرار اجراوی نے 'تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش' کے عنوان سے 480 صفحات پر محیط ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں انھوں نے تمثیل نو کے امتیازات کو واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم 4 جولائی 2005، تا 15 مارچ 2012 مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ریجنل سینٹر دربھنگہ کے بانی ریجنل ڈائریکٹر رہے۔ بعد ازاں 26 مارچ تا 2 اپریل 2012 امام اعظم پٹنہ کے ریجنل ڈائریکٹر رہے اور پھر 4 اپریل 2012 کو انھیں کولکاتا کا ریجنل ڈائریکٹر بنایا گیا، جہاں تا دم مرگ وہ اپنی ذمے داری نبھاتے رہے۔ پسماندگان میں اہلیہ ڈاکٹر زہرہ شائل، ایڈیٹر تمثیل نو کے علاوہ دو فرزندان اور ایک دختر شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 24 نومبر 2023 اور دیگر ذرائع سے

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

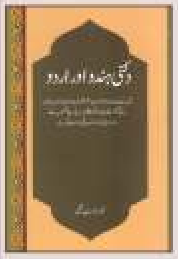

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

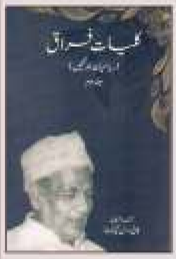

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

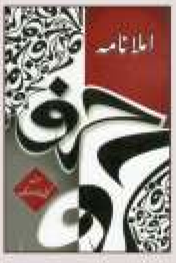

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

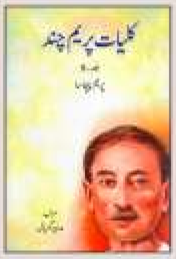

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

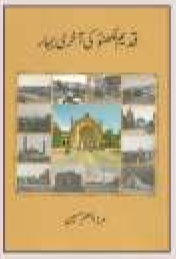

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

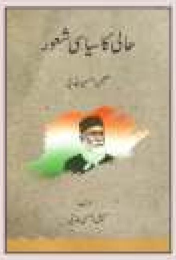

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

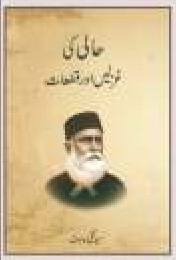

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

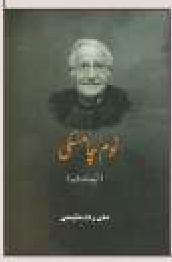

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जनवरी-२०२४,वर्ष:२६, अंक:१
URDU DUNIYA Monthly, January-2024, Vol.26, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6